اکتوبر 2026 قیمت 25₹

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

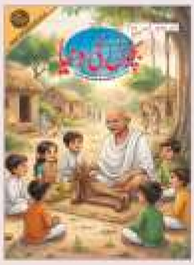

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ زبان شناسی
میرا بچپن ♦ بچوں کے بڑے ادیب
بچوں کی پینٹنگ ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

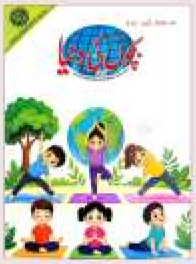

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 15 روپے   سالانہ: 145 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اُردو دُنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:28، شمارہ10، اکتوبر2026

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال
مدیر منتظم: ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی
نائب مدیر : نہاں
معاون مدیر : ڈاکٹر فیضان الحق
معاونین : ڈاکٹر وسیم اقبال، محمد اکرام، محمد فرقان عالم

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع : سالاسار امیجنگ سسٹمس
B-19، سیکٹر 88، نوئیڈا۔ 201305 (یوپی)

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: اختر حسین
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/25 روپے، سالانہ -/240 روپے
صفحات: 100 Total Pages: 100

• قلمکاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
• ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی -110025
فون: 011-35151992 | شعبۂ ادارت: 011-35152009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

ای۔میل
editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746،
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد -500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
• ہماری بات — مدیر — 4

خطوط
• آپ کی بات — قارئین — 5

زبان و تعلیم
• تعلیم و تدریس میں مخفی عناصر کی اہمیت و افادیت — شہاب اللہ خان — 7
• خصوصی بچوں کے مسائل اور شمولیاتی تعلیم — احتشام تمیز — 10

گوشۂ راہی معصوم رضا
• مظفر علی سے خصوصی مکالمہ — نہاں — 14
• نوآبادیاتی مزاحمت کا شعری استعارہ: راہی کا رزمیہ 1857 — شافع قدوائی — 19
• ڈاکٹر راہی معصوم رضا کی شخصیت اور ان کا فن — انیس امروہوی — 23
• راہی معصوم رضا: ایک وسیع الذہن تخلیق کار — معصوم مرادآبادی — 26
• راہی معصوم رضا اور یاس یگانہ شناسی — نسیم احمد نسیم — 29
• راہی معصوم رضا: ادب سے پردۂ سیمیں تک — صدر عالم گوہر — 32
• راہی معصوم رضا کا جہانِ شعر — مظفر حسین غزالی — 35

• راہی معصوم رضا: 'طلسم ہوش ربا' سے 'مہابھارت' تک — منتظر قائمی — 38

• راہی معصوم رضا کے ناولوں کا اجمالی جائزہ — ابوہریرہ — 42

ادب: زاویے اور جہات
• یگانہ بحوالہ نیر مسعود — معید الرحمٰن — 47
• مکتوبِ غالب میں شعرا کے کلام کی تصحیح — محمد شارب — 51

• فضا ابن فیضی کی رباعی نگاری — امتیاز ندیم — 54

• مرزا جعفر اوج کی مرثیہ نگاری — محمد طارق — 58

خراجِ عقیدت
• بانو سرتاج: قومی یکجہتی کی علمبردار مصنفہ — قیام نیر — 60

کتابوں کی دنیا
• تبصرہ و تعارف — ادارہ — 63

جہانِ آگہی
• خبرنامہ — ادارہ — 70

ہماری بات

زبان و ادب کسی بھی معاشرے کی فکری اور تہذیبی زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں۔ زبان محض اظہارِ خیال کا وسیلہ نہیں بلکہ انسانی تجربے، اجتماعی حافظے اور تہذیبی شعور کی امین بھی ہے۔ کسی قوم کی تاریخ، اس کے رسم و رواج، احساسات، تصورات اور اجتماعی زندگی کے نشیب و فراز زبان ہی کے ذریعے ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتے ہیں۔ ادب اس زبان کو تخلیقی اظہار عطا کرتا ہے اور انسانی تجربے کو ایسی معنویت بخشتا ہے جو وقت گزرنے کے باوجود اپنی کشش برقرار رکھتی ہے۔ ادب میں تخلیق، تنقید اور تحقیق ایک دوسرے سے الگ نہیں بلکہ ادبی زندگی کے باہم مربوط پہلو ہیں۔ ایک صحت مند ادبی روایت انھی تینوں کے مسلسل تعامل سے آگے بڑھتی ہے۔

ادبی اظہار کی مختلف صورتیں ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ شاعری، افسانہ، ناول اور ڈراما جہاں زندگی کے تجربات کو لفظوں میں ڈھالتے ہیں، وہیں موسیقی، مصوری، تھیٹر، فلم اور ٹیلی ویژن جیسے فنونِ لطیفہ انھی تجربات کو آواز، رنگ، حرکت، منظر اور اداکاری کے ذریعے ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ ہر فن کا اپنا اسلوب اور اپنی جمالیاتی زبان ہوتی ہے، لیکن ان سب کا مرکز انسان اور اس کی زندگی ہے۔ اسی لیے جب کوئی ادیب ایک سے زیادہ فنون میں اظہار کرتا ہے تو اس کی تخلیقی شخصیت کے کئی نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ ادب اور دوسرے فنون کے درمیان یہ رشتہ ہماری تہذیبی زندگی کو زیادہ وسیع اور بامعنی بناتا ہے۔ بیسویں صدی کی اردو ادبی روایت میں راہی معصوم رضا ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت کے طور پر سامنے آتے ہیں جنھوں نے اپنے تخلیقی سفر میں شاعری، فکشن، مکالمہ نگاری اور اسکرپٹ رائٹنگ کے مختلف امکانات کو برتا۔ 1927 میں پیدا ہونے والے راہی نے اپنے عہد کی زندگی کو قریب سے دیکھا اور اس کے انسانی اور معاشرتی تجربات کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا۔ ان کے یہاں زندگی اپنے تمام تضادات، احساسات، مسائل اور رشتوں کے ساتھ موجود ہے۔ ان کی زبان میں روزمرہ زندگی کی روانی، گفتگو کی فطری کیفیت اور عام انسان کے احساس سے قربت نمایاں ہے۔ یہی خصوصیت ان کے ادبی اظہار کو کتاب کے صفحات سے آگے لے جاتی ہے اور فلم و ٹیلی ویژن کے وسیع دائرے میں بھی اسے مؤثر بناتی ہے۔

کسی بڑے تخلیق کار کی پیدائش کے سو برس مکمل ہونا محض کیلنڈر کی ایک تاریخ کا گزر جانا نہیں ہوتا۔ صد سالہ موقع دراصل کسی شخصیت اور اس کے عہد کو دوبارہ دیکھنے، اس کے کام کو نئے سوالات کے ساتھ پڑھنے اور یہ جاننے کا موقع فراہم کرتا ہے کہ وقت گزرنے کے بعد اس کے تخلیقی سرمایے کی معنویت کس طرح باقی رہتی ہے۔ راہی معصوم رضا کی صد سالہ یاد بھی اسی اعتبار سے اہم ہے۔ ان کی زندگی اور تخلیقی سفر کو موجودہ تناظر میں دیکھنے سے نہ صرف ان کے ادبی مقام کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ اس عہد کی سماجی اور تہذیبی فضا کو بھی نئے سرے سے محسوس کیا جاسکتا ہے جس میں ان کی شخصیت پروان چڑھی۔ صد سالہ تقریبات اور خصوصی اشاعتیں اسی لیے اہم ہوتی ہیں کہ وہ کسی ادیب کو محض یاد کرنے تک محدود نہیں رہتیں بلکہ اس کے فن پر جاری گفتگو کو آگے بڑھانے کا ذریعہ بنتی ہیں۔

اسی احساس کے تحت راہی معصوم رضا کی پیدائش کے سو برس مکمل ہونے پر ماہنامہ 'اردو دنیا' میں خصوصی گوشہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ راہی کی شخصیت اور تخلیقی سفر کے مختلف پہلوؤں کو ایک وسیع تناظر میں قارئین کے سامنے لایا جائے اور ان کے بارے میں ہونے والی گفتگو کو چند معروف حوالوں تک محدود رکھنے کے بجائے مختلف زاویۂ نظر کے لیے جگہ فراہم کی جائے۔ اس گوشے میں ان کی ادبی شخصیت، شاعری، فکشن، مکالمہ نگاری اور فلم و ٹیلی ویژن سے وابستگی کے ساتھ ان کی زندگی کے بعض پہلوؤں کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ راہی کی زندگی اور شخصیت کو قریب سے جاننے والے جناب مظفر علی صاحب سے خصوصی گفتگو اس گوشے کا ایک اہم حصہ ہے، جو ان کی نجی اور انسانی شخصیت کے بعض ایسے پہلوؤں سے آشنا کرتی ہے جو محض کتابی مطالعے سے سامنے نہیں آتے۔ اس کے ساتھ اہلِ علم و ادب کی تحریروں کے ذریعے ان کے فن، فکر اور تخلیقی رویوں پر مختلف خیالات کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یقیناً کسی بڑے فن کار کی پوری شخصیت اور طویل تخلیقی سفر کو چند صفحات میں سمیٹنا ممکن نہیں، تاہم یہ گوشہ راہی معصوم رضا کو ایک زندہ ادبی حوالے کے طور پر دوبارہ پڑھنے کی ایک کوشش ہے۔ امید ہے کہ یہ خصوصی گوشہ ماضی کی ایک اہم ادبی شخصیت کی یاد کو تازہ کرنے کے ساتھ ساتھ نئی نسل کے قارئین اور محققین کو بھی راہی کے تخلیقی جہان کی طرف متوجہ کرے گا اور ان کے فن پر مزید سنجیدہ مطالعے اور گفتگو کے لیے نئے امکانات پیدا کرے گا۔

آپ کی بات

ماہنامہ'اردو دنیا' میں 'آپ کی بات' کے تحت قارئین کے تاثرات شائع کرنے کا مقصد رسالے کے مشمولات کے تئیں قارئین کی آرا سے واقفیت حاصل کرنا ہے۔ رسالے کے قلمکاروں اور قارئین سے گذارش ہے کہ مشمولات کے حوالے سے اپنے تاثرات ارسال کرنے کی زحمت کریں اور نئے موضوعات، مسائل، علاقوں اور ادبی و علمی شخصیات سے بھی مطلع فرمائیں۔ خطوط کی شکل میں موصول ہونے والے آپ کے یہ تاثرات ہمارے لیے بے حد اہم ہیں کیوں کہ ہمیں ان سے رسالے کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

ماہنامہ'اردو دنیا' ستمبر 2026 کا شمارہ جب میرے ہاتھوں میں آیا تو دل بے حد مسرور ہوا۔ خوبصورت سرورق، چنار بک فیسٹیول کی یادیں، کشمیر کی ادبی فضا اور مشاعرے کی حسین تصویروں نے ایک بار پھر ان شاندار دنوں کی یاد تازہ کر دی۔

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ محض ایک منتظم نہیں بلکہ ادب، کتاب اور ادبی تہذیب سے گہری محبت رکھنے والے صاحبِ ذوق انسان بھی ہیں۔ ان کی قیادت میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ملک کے مختلف حصوں میں اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے جو سرگرمیاں انجام دی ہیں، وہ قابلِ تحسین ہیں۔

حال ہی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور نیشنل بک ٹرسٹ (NBT) کے اشتراک سے منعقد ہونے والا یہ فیسٹیول بھی ڈاکٹر شمس اقبال کی ذہانت اور اردو دوستی کا ثبوت ہے۔ یہ بک فیئر کتابوں کی خرید و فروخت اور اہل کشمیر کی کتاب دوستی کے لیے یاد رکھا جائے گا۔ 20 جولائی کو منعقد ہونے والا مشاعرہ بھی ایک کامیاب ایونٹ کے طور پر جانا جائے گا۔ مشاعرے میں شعرا کو سننے کے لیے اہل کشمیر کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ آج بھی شاعری لوگوں کے دلوں کو جوڑنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ مجھے ذاتی طور پر خوشی ہے کہ اس خوب صورت ادبی سفر کا ایک حصہ بننے کا موقع مجھے بھی ملا۔

ماہنامہ'اردو دنیا' کے ستمبر کے شمارے میں چنار بک فیسٹیول اور اس سے وابستہ ادبی سرگرمیوں کی تصویری جھلکیاں دیکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے وہ تمام خوبصورت لمحات دوبارہ آنکھوں کے سامنے آ گئے ہوں۔

میں آپ کو اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تمام رفقا کو اس شاندار کامیابی پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ اردو زبان، کتاب اور ادب کے فروغ کے لیے آپ کی یہ کاوشیں مزید وسعت اختیار کریں اور ملک کے ہر خطے میں اردو کتاب کی روشنی پہنچے۔

ماہنامہ'اردو دنیا' کا یہ ستمبر شمارہ یقیناً ایک خوبصورت ادبی یادگار ہے۔

ڈاکٹر اعجاز پاپولر میرٹھی: میرٹھ، اتر پردیش

قومی اردو کونسل اردو زبان کے فروغ میں ہمیشہ سے نت نئی کوششیں کرتا رہا ہے۔ کتابوں کی اشاعت سے لے کر سمینارز، ورکشاپس، بک فیئرز کے ساتھ دیگر سرگرمیاں اس زبان کے فروغ میں کلیدی کردار ادا کر رہی ہیں۔ حالیہ دنوں میں قومی اردو کونسل کے ذریعے منعقد کرائے جانے والے بک فیئرز کامیابی کی نئی اونچائیاں طے کر چکے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں منعقدہ نومبر 2025 بک فیئر کی یادیں ابھی تک لوگوں کے ذہن میں تازہ ہیں۔

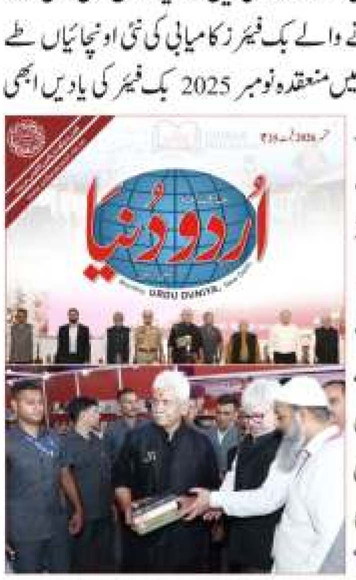

اسی درمیان چنار بک فیسٹول کے تیسرے ایڈیشن کی کتابوں کی ریکارڈ خریداری کی وجہ سے لوگ اس کے قصیدے پڑھنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ چنار بک فیسٹول کے تیسرے ایڈیشن میں لوگوں کے جوش اور جنون کو دیکھ کر بلاشبہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ آج بھی کتابوں سے عوام کی دلچسپی برقرار ہے۔ ماہنامہ'اردو دنیا' ستمبر کے کور پیج پر گورنر صاحب کے ہاتھ میں کتابیں دیکھ کر دلی خوشی ہوئی کیونکہ کتابیں انسان کو عقل و شعور کے ساتھ زندگی جینے کا سلیقہ بھی سکھاتی ہیں۔ اس ماہ کے ایڈیٹوریل میں اس تعلق سے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے بہت اچھی باتیں لکھی ہیں۔ ان کے نزدیک ''کتاب کسی بھی مہذب معاشرے کی فکری بنیاد اور تہذیبی شناخت کا اہم وسیلہ ہوتی ہے۔ یہ انسان کو صرف معلومات فراہم نہیں کرتی بلکہ سوچنے، سمجھنے اور زندگی کو وسیع تناظر میں دیکھنے کی صلاحیت بھی عطا کرتی ہے۔''

اس شمارے کا خاص کالم 'چنار بک فیسٹیول 2026' کی رپورٹ ہے جسے کور اسٹوری کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ رپورٹ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ اہل کشمیر اپنی مادری زبان کے ساتھ اردو سے کس حد تک محبت کرتے ہیں۔ کتابوں کی خریداری کے علاوہ دیگر ادبی، ثقافتی اور تہذیبی پروگرامز بھی چنار بک فیسٹیول کی کامیابی کے لیے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

رپورٹ کے بعد قومی یوم اساتذہ کی مناسبت سے سلمان عبدالصمد کا مضمون 'ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن: ایک استاد اور معمارِ ادارتی ٹیم کی مثبت سوچ کو بیان کرتا ہے۔ واقعی سروپلی رادھا کرشنن نے ایک استاد اور ایک سیاست داں کی حیثیت سے سماج پر گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔

'ادب: زاویے اور جہات' کے تحت کل 7 مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین میں اساس ثلاثہ: فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج اور علی گڑھ (ابوبکر عباد)، علامہ جمیل مظہری کی فکری جہات (خان محمد رضوان)، وارث علوی اور افسانہ کی تنقید (تنویر احمد)، غالب: حیات نو کا استعارہ (ریاض احمد)، وریندر پٹواری کے افسانوں میں کشمیر (مہر النساء)، اردو میں نسوانی شاعری کی روایت (وجے کمار)، مرزا محمد رفیع سودا کا قصیدہ 'تضحیک روزگار: ایک مطالعہ (صدام حسین) قابل ذکر ہیں۔ یہ سارے مضامین اپنی نوعیت کے لحاظ سے عمدہ اور معلوماتی مضامین کہے جاسکتے ہیں۔ بالخصوص 'وریندر پٹواری کے افسانوں میں کشمیر' اس لحاظ سے اہم ہے کہ اتنے بڑے فکشن نگار کو ان کی زندگی میں بہت کم یاد کیا گیا، اچھی بات ہے کہ انتقال کے بعد تو انھیں یاد کیا گیا۔

'جہانِ ترجمہ' میں 3 مضامین: تمل ناڈو کا باکمال شاعر: گنڈ وعبدالقادر شاکر (سید سجاد حسین)، اردو ادب میں ولیم محمد بشیر: تراجم کا ایک جائزہ (عارف این)، منور لکھنوی: بحیثیت سنسکرت-اردو مترجم (محمد اسجد) شامل ہیں۔ ان مضامین کی شمولیت سے یہ کالم بھی خاص ہو گیا ہے۔ ان کے علاوہ 'فلم و تھیٹر کا رنگ منچ' کالم بھی ہمیں پڑھنے پر مجبور کرتا ہے، اس میں ہندوستان میں فلم کا آغاز اور اس کی ترقی کے مراحل (مجید بیدار)، لوک داستانیں اور ہندی سنیما (احمد خان)، فینٹسی فلموں میں داستانوی عناصر (محمد فیضان)، ہندستانی رنگ منچ کے ارتقا میں یورپین ڈرامے کا کردار (شارق محمد عزیز) جیسے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ مضامین کے علاوہ 'کتابوں کی دنیا' بھی ہمیشہ سے پسندیدہ کالم رہا ہے۔ اس میں مختلف اصناف سے متعلق کتابوں پر تبصرے شامل ہوتے ہیں۔ ان کتابوں پر مبصرین اپنی رائے کا کھل کر اظہار کرتے ہیں۔ اس رسالے کا آخری کالم 'خبرنامہ' ہوتا ہے، جس میں قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں کے ساتھ دیگر ادبی اور علمی سرگرمیوں سے عوام و خواص کو واقف کرایا جاتا ہے۔ ادارے کی ہمیشہ سے کوشش رہی ہے کہ ہر شمارے میں کچھ ایسی نئی چیزیں پیش کی جائیں جس سے عوام کی دلچسپی برقرار رہے۔ یہ شمارہ بھی کچھ کالمز کی وجہ سے خاص بن گیا ہے۔

محمد حمدان، نئی دہلی

ماہنامہ 'اردو دنیا' اگست 2026 کا شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ سرورق پر جشن یوم آزادی کے تعلق سے لال قلعہ کی عمارت اور قومی جھنڈے کی تصویر سے کور پیج مزید خوبصورت ہو گیا ہے۔ ہر بار کی طرح اس بار کا بھی اداریہ وقیع اور جاذب نظر ہے۔ 'اداریے' میں مدیر ڈاکٹر شمس اقبال لکھتے ہیں کہ ہندوستان کی آزادی کے 79 سال مکمل ہو رہے ہیں، آزادی کا یہ سفر مسلسل جدوجہد، ترقی اور تمام تر شعبوں میں ارتقا کی لازوال کہانی پیش کرتا ہے، تحریک آزادی کے علمبرداروں نے اپنی جان و مال کی پروا کیے بغیر ملک کو آزادی دلائی۔ ہند کو آزاد و خودمختار ملک بنایا، مدیر نے 'اردو صحافت و صحافیوں اور اخبارات کے رول کو بھی اجاگر کیا۔ 'آپ کی بات' کالم میں شمارے کے مشمولات پر آرا، تبصرہ اور تجزیے کی شمولیت سے اس کالم کی افادیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ اس

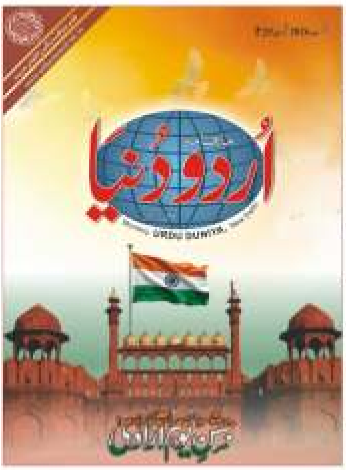

شمارے کا پہلا مضمون 'اردو زبان اور شاعر کے تہذیبی روابط' جسے معاذ احمد نے تحریر کیا ہے، ایک عمدہ مضمون ہے۔ اس مضمون میں زبان کے کردار اور ارتقائی تہذیب پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی اردو شاعری نے انسانی اقدار اور انسان کو انسان بنانے میں کیا کردار ادا کیا ہے اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ امتیاز احمد نے اپنے مضمون 'قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور زبان کی تعلیم' میں علاقائی اور مادری زبانوں کی اہمیت پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ پروانہ برہان پوری نے 'اردو زبان: ماضی، حال اور مستقبل' میں اردو کے تعلق سے فکر انگیز باتیں کی ہیں نیز انھوں نے اس مضمون میں اردو شعرا اور نثر نگاروں کی تخلیقات کی خصوصیات بھی اجاگر کی ہیں۔ عبدالعزیز عرفان نے 'اردو صحافت کا معمار اول: مولوی محمد باقر دہلوی' میں اردو کے پہلے شہید صحافی اور ان کی صحافت نگاری پر تفصیلی مقالہ تحریر کیا ہے۔ ویسے اردو صحافت قوم و ملک کی تعمیر و تشکیل و ترقی میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ معصوم مرادآبادی نے 'عظیم مجاہد آزادی: مولانا حسرت موہانی' کی سیاسی، قومی، انقلابی، علمی، ادبی اور شعری زندگی کو مثالوں سے ثابت کیا ہے۔ محمد شاہد خاں نے اپنے مضمون 'تحریک آزادی کا ایک علمی ادبی اور صحافتی مرکز' میں الہ آباد کی علمی، ادبی، قومی، صحافتی تحریک اور قومی لیڈران کا بھرپور تعارف پیش کیا ہے، نیز وہاں کے قومی رہنماؤں نے آزادی کے لیے جو جان توڑ محنت کی ہے اس کا بھی بہت سلیقے سے ذکر کیا ہے۔ طوبیٰ ادریس نے 'تحریک آزادی میں مسلم خواتین کی فکری تشکیل اور مہاتما گاندھی' میں آمنہ قریشی، بی بی امت السلام، امینہ طیب، بیگم سکینہ طیب کی کاوشوں اور کوششوں کو طشت از بام کیا ہے۔ ان شخصیات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح گاندھیائی فکر نے ان کے اندر خدمت، قربانی، صبر اور قومی یکجہتی جیسے اوصاف کو مستحکم کیا اور انھیں ایک منظم جدوجہد کا حصہ بنایا۔ 'پنڈت دینا ناتھ مدن معجز دہلوی کی ادبی خدمات' (محمد سلیم پلسار کٹ)، 'ادھو مہاجن بسمل کا شاعرانہ اختصاص (شیخ عمران) ان مضامین کو نئی دریافت کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ محمد ناصر حسین نے 'کلیم عاجز کی غزل گوئی روایت اور اسلوب' میں کلیم عاجز کی غزلیہ شاعری اور ان کے فکر و فن کا اچھا تجزیہ پیش کیا ہے۔ ان کے علاوہ 'ڈاکٹر موہن سنگھ اوبرائے دیوانہ کی شعری کائنات' (خلیق الرحمٰن اعوان)، 'قطب اللہ ندوی کی افسانہ نگاری' (ایس ایم حسینی)، 'اردو ناول تنقید کے ابتدائی نقوش' (اعجاز حسین شاہ)، 'امیر خسرو: قوالی اور قومی یکجہتی کے علمبردار' (آمینہ بیگم)، 'کلام غالب میں لفظ 'ناخن' کی انفرادیت' (غزالہ فاطمہ)، 'ادب میں سائنسی تصورات کی پیش کش' (سیدہ نازیہ فاطمہ)، 'مثنویاتِ شوق کی تحقیق و تدوین اور رشید حسن خاں' (فرحین شکیل) عمدہ اور لائق مطالعہ ہیں۔ بقیہ مضامین بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ و اکیڈمک سینٹ ممبر، تلنگانہ یونیورسٹی، حیدرآباد، تلنگانہ، موبائل: 9603018825

تعلیم و تدریس میں مخفی عناصر کی اہمیت وافادیت

شہاب اللہ خان

تمہید

تعلیم ایک منظم، با مقصد اور شعوری عمل ہے جس کے ذریعہ فرد کی ذہنی، اخلاقی، سماجی اور عملی صلاحیتوں کی نشوونما کی جاتی ہے جب کہ اکتساب اس مسلسل عمل کا نام ہے جس کے ذریعہ انسان علم، مہارت، اقدار اور تجربات حاصل کر کے اپنے افکار و کردار میں مثبت تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ تعلیم اور اکتساب باہم لازم وملزوم ہیں اور ایک مہذب، باشعور اور متوازن شخصیت کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔

تعلیم و تدریس کو صرف ایک عمل یا فعل کہنا اس کے حق کے بالکل مخالف ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک استاد اور شاگرد کا رشتہ ماں باپ کے رشتہ کے برابر و مترادف ہوتا ہے۔ ایک استاد جب بچوں سے پہلی مرتبہ روبرو ہوتا ہے تب وہ ان کے لیے ایک انجان اور اجنبی کی حیثیت رکھتا ہے لیکن کچھ عرصہ اور وقفہ گزرنے کے بعد بچوں کی لیے وہی معلم ایک والد، بڑے بھائی، ذمہ دار، رہبر اور معتبر شخص کے مماثل بن جاتا ہے۔ یہ اعتبار، عزت، خلوص اور محبت کیونکر پیدا ہوتی ہے؟ یہ اس لیے پیدا ہوتی ہے کیونکہ ایک طالب علم کو ہمیشہ اپنے استاد کی جانب سے انفرادیت، مفاہمت، تحفظ، احساسِ تقویت، خود اعتمادی، عزت نفس، دوستانہ ماحول، باہمی احترام اور مثالی شخصیت ملتی ہے اور جب تک ایک استاد اور شاگرد کے درمیان اس طرح کا رشتہ وابستہ نہ ہو تب تک تدریس اور اکتساب دونوں ہی غیر موثر اور رسمی ثابت ہوتے ہیں۔

مخفی نصاب مفہوم وتعریف

درس و تدریس ایک ایسا عمل ہے جس میں حرکت و تبدیلی کا ہونا ہی اس کے موثر اور منافع ہونے کی علامت ہے۔ عام سے لفظوں میں پڑھنا پڑھانا نہایت سادہ اور عام سا نظر آتا ہے لیکن جب ہم اس کو علم تدریس کے چشمے اور بصیرت سے دیکھتے ہیں تو تب ہمیں اس کی پیچیدگیاں اور اہمیت نظر آتی ہے۔

تدریس میں وہی چیزیں اہم نہیں ہوتیں جو نصاب میں لکھی ہوتی ہیں بلکہ ایسے بہت سے عناصر بھی لازمی ہوتے ہیں جو نظر نہیں آتے بلکہ طلبہ کی سیکھنے کی صلاحیت، رویوں اور کارکردگی پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ تعلیمی ماہرین ان عوامل کو پوشیدہ نصاب یا کلاس روم کے مخفی عناصر بھی کہتے ہیں۔

موثر اور مفید تدریس کے لیے ضروری ہے کہ استاد اور شاگرد کے درمیان باہمی عزت واحترام، تعاون، طلبہ کی فعال شرکت، مناسب نظم وضبط، خود اعتمادی، متحرک اور تحفظ جیسے عناصر ضرور موجود ہوں۔

مخفی نصاب کے عناصر و نظریات

اس مضمون میں ہم ایسے عناصر کے ساتھ ساتھ ایسے نظریات (Theories) کا بھی ذکر کریں گے جو ایسے عناصر کو اہم قرار دیتے ہیں جو ہمیشہ مخفی ہوتے ہیں لیکن ان کی اہمیت اور افادیت ظاہری عناصر کے با لمقابل ہوتی ہے۔

(1) Philip .W Jackson نے اپنی کتاب Life in Classrooms (1968) میں پہلی بار Hidden Curriculum یعنی پوشیدہ نصاب کے تصور کو نمایاں کیا ہے۔ پوشیدہ نصاب سے مراد اقدار، رویے، عادات اور سماجی اصول ہیں جو طلبہ غیر رسمی طور پر اپنے اساتذہ سے سیکھتے ہیں۔ جیسے: وقت کی پابندی، نظم وضبط، احترام، باہمی تعاون اور ٹیم ورک، مقابلے کا رجحان وغیرہ۔ ایک استاد کی بنیادی اور لازمی خصلت یہ ہونی چاہیے کہ وہ ہمیشہ وقت کا پابند ہو، اس کے کلاس روم میں ایک معیاری نظم وضبط موجود ہو اور بچوں کے درمیان مناسب موازنہ آرائی پیدا کرنے والا ہو۔ طلبہ میں جب تک اپنے ہم جماعتوں سے موازنے اور مقابلے کا جذبہ موجود نہیں ہوتا تب تک اکتساب، مقصود رفتار حاصل نہیں کر سکتا۔ فلپ۔ ڈبلیو۔ جیکسن نے مندرجہ ذیل عناصر کو مخفی عناصر تسلیم کرتے ہوئے تدریس و اکتساب کے لیے موثر و مفید مانا ہے۔

وقت کی پابندی

کسی بھی کام میں تسلسل اور پابندی اس کے کامیاب اور بامراد ہونے کی علامت ہوتی ہے۔ تعلیم و تدریس کے معاملے میں وقت کی پابندی نہ صرف تعلیمی عمل کو بہتر بناتی ہے بلکہ شخصیت سازی، کردار سازی اور جماعت میں نظم وضبط کو قائم رکھنے میں مدد کرتی ہے۔ اسی لیے طالب علم ہونے اور استاد بننے سے پہلے بنیادی خصلت وقت کی پابندی ہے۔ اگر استاد یا طالب علم میں یہ خصلت

موجود نہیں ہے تو اس کا سیدھا سا مطلب یہ ہوگا کہ وہ صرف تعلیمی فعل سے ہی منسلک ہے۔

نظم وضبط

نظم وضبط کسی بھی تعلیمی ادارے کی کامیابی اور استحکام کا بنیادی ستون تصور کیا جاتا ہے۔ یہ طلبہ میں احساس ذمہ داری، وقت کی پابندی اور حسن اخلاق کو فروغ دیتا ہے۔ موثر نظم وضبط تعلیمی ماحول کو پُر امن، منظم اور تدریس کے لیے سازگار بناتا ہے۔ کسی بھی مقصد کے حصول کے لیے ایک منصوبے کے تحت نظام کو بنایا جاتا ہے تاکہ ہر عمل اس کے مقصد کے حصول میں صرف ہو اور کوئی بھی ایسا عمل سرزد نہ ہو جس سے وقت اور وسائل کا ضیاع ہو۔ یہ بات روشن ہے کہ اسکول کی ہر چیز طالب علم کے لیے بنی ہے اسی لیے تدریس و اکتساب سے متعلقہ ہر ایک شے کا نظم وضبط سے ہونا بے حد لازمی ہے چاہے اس کا تعلق کلاس روم سے ہو، استاد سے ہو، نظام اوقات سے ہو یا پھر خود طلبہ سے ہو۔

احترام اساتذہ

استاد کا احترام مخفی نصاب کا ایک بنیادی جزو ہے جو طلبہ کے کردار میں شائستگی اور نظم وضبط پیدا کرتا ہے۔ تعلیمی ماحول میں معلم کی توقیر، طلبہ میں اطاعت، انکساری اور حسن اخلاق کو فروغ دیتی ہے۔ یہ وصف طلبہ کی شخصیت سازی اور مثبت سماجی رویوں کی تشکیل میں موثر کردار ادا کرتا ہے۔

تعاون اور ٹیم ورک

تعاون اور اجتماعی کاوش طلبہ میں باہمی ہم آہنگی، اخوت اور ذمہ داری کے احساس کو مستحکم کرتی ہے۔ اجتماعی سرگرمیوں میں شرکت سے طلبہ ایک دوسرے کے افکار کا احترام اور باہمی اشتراک کا سلیقہ سیکھتے ہیں۔ یہ عنصر مستقبل میں موثر قیادت اور کامیاب سماجی روابط کی بنیادیں فراہم کرتا ہے۔

مقابلے کا رجحان وجذبہ

مقابلہ بازی کا رجحان طلبہ میں محنت، جستجو اور اعلیٰ کارکردگی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ صحت مند مسابقت طلبہ کو اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے اور تعلیمی میدان میں امتیاز حاصل کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ تاہم اعتدال کے ساتھ اختیار کی جانے والی مسابقت ہی مثبت شخصیت سازی اور متوازن ذہنی نشوونما کا سبب بنتی ہے۔

(2) Carl Rogers کی Humanistic Theory کے مطابق محبت، قبولیت اور احترام سیکھنے کے لیے بنیادی ضرورتیں ہیں، استاد کا رویہ، لہجہ، زبان اور طلبہ کے ساتھ تعلقات۔ یہ ایسے عناصر ہیں جو سیکھنے پر بہت اثر انداز ہوتے ہیں۔ Carl Rogers نے کلاس روم کا ماحول (Classroom Climate) میں پوشیدہ نصاب کے تحت ان عناصر کا ذکر کیا ہے۔

استاد کا دوستانہ رویہ

ایک استاد کی بنیادی خصلت یہ ہونی چاہیے کہ اس کا لہجہ نرم اور انداز بیان اُنسیت والا ہو۔ وہ جب بچوں سے ہم کلام ہو تب بچے اس کو شوق سے سماعت کریں اور جس طرح سے ایک دوست کے ساتھ گفتگو کی جاتی ہے ٹھیک اسی طرح سے طلبہ اس سے ہم کلام ہوں۔

> نظم وضبط کسی بھی تعلیمی ادارے کی کامیابی اور استحکام کا بنیادی ستون تصور کیا جاتا ہے۔ یہ طلبہ میں احساس ذمہ داری، وقت کی پابندی اور حسن اخلاق کو فروغ دیتا ہے۔

اگر طلبہ اپنے اساتذہ کے رویے اور سخت لہجے کی وجہ سے اس سے ہم کلام نہیں ہوتے ہیں تو اس کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ استاد مثالی استاد بننے میں ناکامیاب ہیں۔

طلبہ کا اعتماد

بھروسہ حاصل کرنا ایک بہت اہم و معنی خیز لفظ ہے یہ ایک پہچان والے کو انجان اور ایک غیر کو اپنا بھی بنا سکتا ہے۔ دنیا کے ہر کام اور عمل میں بھروسہ ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ درس و تدریس میں بھی اعتماد ایک یقین کی طرف لے کر جاتا ہے اور ایک یقین استاد کے لیے کامیابی کی راہ ہموار کرتا ہے۔ کلاس میں طلبہ کا استاد پر اعتماد ہونا بے حد ضروری ہے اور وہ اعتماد پیدا کرنا ایک استاد کی ذمہ داری ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک بچہ اپنے ماں باپ کا پڑھایا ہوا کاٹ سکتا ہے، بھائی بہن کا پڑھایا ہوا انکار کرسکتا ہے، لیکن اپنے استاد کا پڑھایا ہوا نہیں کاٹ سکتا ہے کیونکہ وہ درس و تدریس کے میدان میں سب سے پُر اعتماد اپنے استاد کو مانتا ہے۔ اسی لیے استاد کو اپنی علمی لیاقت سے طلبہ کا بھروسہ جیتنا بہت ضروری ہوتا ہے۔

خوف یا دباؤ کا موجود نہ ہونا

خوف اور ڈر، درس و تدریس میں صرف بگاڑ ہی پیدا کرسکتے ہیں۔ اگر کلاس روم میں استاد اپنی صلاحیت و لیاقت کی بجائے خوف اور ڈر کا استعمال کرتا ہے تو اس کا صاف مطلب ہے کہ وہ جماعت کے طلبہ کی مختلف صلاحیتوں کو تراشنے کے بجائے ان کو جڑ سے کاٹنے کا کام کرتا ہے۔

باہمی احترام

جس طرح سے خاندان، سماج اور ملک کی ترقی کے لیے باہمی احترام کا ہونا ضروری ہے اسی طرح سے درس و تدریس کے عمل و فعل میں ادب اور عزت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں۔ ادب سے ہی محبت کی شمع روشن ہوتی ہے۔

استاد اور طلبہ کے مابین باہمی احترام کا ہونا بے حد لازمی قرار دیا جاتا ہے کیونکہ باہمی احترام مفاہمت، آپسی تعاون اور مدد کے جذبے کو جنم دیتا ہے اور یہ سارے ایسے عناصر ہیں جو ایک اچھے تعلق اور رشتے کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ اسی لیے درس و تدریس کو پروان چڑھانے کے لیے کلاس میں طلبہ کے درمیان احترام اور خلوص کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

(3) Lenore jacobson اور Robert Rosenthal کے نظریے Pygmalion Effect کے تحت (Teacher Expectations) استاد کی مثبت توقعات طلبہ کی کارکردگی کو بہتر بنا سکتی ہیں۔ یہ بات یقینی ہے کہ کلاس روم میں ہر صلاحیت اور انفرادیت والے بچے موجود ہوتے ہیں اور اکثر اساتذہ انہی بچوں سے اچھی توقعات رکھتے ہیں جو درس و اکتساب میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا ہے کہ ہمیشہ ایک جیسے نتائج ہی حاصل ہوں بلکہ مثبت توقعات اور استاد کا پُر امید یقین بھی طلبہ کے نتائج پر اثر انداز ہوسکتے ہیں۔ اسی لیے ایک استاد کو چاہیے کہ وہ ان طلبہ کے تعلق سے زیادہ مثبت توقعات رکھیں جو اکتسابی معاملے میں کمزور ہیں یا جن کی رسائی مقصودہ نتائج تک نہیں ہو پا رہی ہے۔

(4) Daniel Golemen کی Emotional Intelligence Theory کے مطابق ایک استاد کے لیے بے حد ضروری ہے کہ وہ طلبہ کے جذبات کو سمجھنے والا ہو اور ان کے طرز عمل کے مطابق ان کی

موثر رہنمائی کرے۔ ڈینیل گولمین نے اپنے نظریہ میں ایسے عناصر کا ذکر کیا ہے جو طلبہ کے اکتساب میں مخفی طور پر مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

خود بیداری

ایک طالب علم کے ساتھ ساتھ استاد کے لیے بے حد ضروری ہے کہ وہ طلبہ کی کمزوریوں، صلاحیتوں اور جذبات کو پہچانے اور پھر ان عناصر کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک تدریسی لائحہ عمل اختیار کرے۔ مثال کے طور پر ایک طالب علم کے ساتھ ایک معلم کو بھی اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ اس کا شاگرد کس مضمون کو پسند کرتا ہے اور کس مضمون میں وہ بہت اچھا کر سکتا ہے۔

تقویت

کسی بھی کام کو کرنے کے لیے بنیادی چیز تقویت ہوتی ہے۔ بغیر تقویت کے کام کرنا غیر مفید ثابت ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک بھوکے انسان کے لیے کھانے کی جتنی اہمیت اور افادیت ہو سکتی ہے وہ ایک پیٹ بھرے انسان کے لیے نہیں ہو سکتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح وہ طالب علم جس میں تقویت موجود ہو اس کا اکتساب اور غیر تقویت شدہ طالب علم کا اکتساب ہمیشہ غیر مساوی ہوتا ہے۔

ہمدردی

بردباری، رحم دلی اور ہمدردی یہ ایسی صفات ہیں جو کسی انجان انسان کا بھروسہ جیتنے اور اس کو اپنا بنانے میں سب سے زیادہ کارگر ثابت ہوتی ہیں۔ یہ ایک انسانی فطرت ہے کہ جب ایک انسان دوسرے انسان کو اس کے مطابق عزت اور توجہ دیتا ہے تو وہ انسان اس کو اپنا ہمدرد اور ساتھی بنا لیتا ہے اور اس کو اپنے دکھ اور سکھ میں ہمیشہ شامل کرتا ہے۔ درس و تدریس کے معاملے میں ہمدردی اور انسانی رحم دلی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ جماعت میں طلبہ اور اساتذہ کے درمیان ایک مستحکم رشتے کو ہموار کرتی ہے اور ایک مضبوط و مستحکم رشتہ اچھی تدریس اور اکتساب کا ضامن ہوتا ہے۔

سماجی مہارتیں

سماجی مہارتوں سے مراد ایسی صلاحیتیں ہیں جن کی مدد سے ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ موثر، مثبت اور باوقار انداز میں تعلقات قائم کرتا ہے، بات چیت کرتا ہے، تعاون کرتا ہے اور پیش آنے والے مسائل کو خوش اسلوبی سے حل کرتا ہے۔

درس و تدریس کے معاملے میں ہمدردی اور انسانی رحم دلی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ جماعت میں طلبہ اور اساتذہ کے درمیان ایک مستحکم رشتے کو ہموار کرتی ہے اور ایک مضبوط و مستحکم رشتہ اچھی تدریس اور اکتساب کا ضامن ہوتا ہے۔

(5) Pierre Bourdieu کے نظریہ Cultural Capital Theory کے مطابق مختلف سماجی طبقات کے طلبہ مختلف قسم کے ثقافتی وسائل اسکول لے کر آتے ہیں جو ایک استاد کے لیے بہترین حکمت عملی ثابت ہو سکتی ہے۔ طلبہ کی زبان، خاندان، معاشرتی پس منظر اور ثقافت ان کی تعلیم اور اکتساب پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ ایک استاد کو چاہیے کہ وہ ایسے طلبہ کی شناخت کرے اور ان کے سماجی ضابطوں اور اقدار کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی تعلیم و تعلم کا بندوبست کرے۔ اگر کوئی بھی استاد طلبہ کے سماجی و ثقافتی پس منظر کو نظر انداز کرتا ہے تو وہ کبھی بھی طلبہ کی تعلیمی ضروریات تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا ہے۔

(6) Abraham Maslow کے نظریہ Maslow Hierarchy of Needs کے مطابق طلبہ میں تقویت اور تحریک کا پیدا کرنا ضروری ہے۔ اگر کوئی استاد درس و تدریس سے پہلے طلبہ میں تحریک و تقویت پیدا نہیں کرتا ہے تو وہ طلبہ کے ساتھ ناانصافی کرتا ہے اور اس کی مثال ایسی ہے کہ کھانے کے وقت بھوک لگنے پر کسی انسان کو کھانا نہ دیا جائے بلکہ اس سے اور کام لیا جائے ظاہر ہے کہ اس سے اس کام کی افادیت اور تاثیر منفی ثابت ہوگی۔

(7) Albert Bandura کی Social learning Theory کے مطابق طلبہ سب سے زیادہ مشاہدات اور تقلید کے ذریعہ سیکھتے ہیں۔

استاد کے عمل، طرز عمل اور رویوں کو دیکھ کر بھی سیکھتے ہیں۔ طلبہ کے لیے استاد ایک مثالی شخصیت رکھتا ہے۔ اس کا کرنا، کہنا، بتانا سب کا سب طلبہ کے لیے بے حد ضروری اور لازمی ہوتا ہے۔ اسی لیے ایک استاد کو ہمیشہ اپنے تعلیمی میدان میں، طرز عمل میں، طرز رسائی میں اور عادات و اطوار میں قابلیت کا پیکر ہونا چاہیے۔ یہ نظریہ تدریسی اور اکتسابی عمل میں عملی نمونہ کی اہمیت کو نمایاں کرتا ہے۔ مشاہداتی تعلیم طلبہ کی فکری، سماجی اور اخلاقی نشوونما میں موثر کردار ادا کرتی ہے۔ البرٹ بنڈورا کے نظریہ معاشرتی تعلیم کے مطابق اکتساب عمل محض تلقین کا مرہون منت نہیں بلکہ مشاہدہ، تقلید اور عملی تجربہ اس کے بنیادی عوامل ہیں۔ طالب علم اپنے اساتذہ اور معاشرتی ماحول کے افعال و کردار کو بغیر دیکھے ان کی پیروی اختیار کرتا ہے۔ صالح نمونہ عمل، طلبہ کی فکری بالیدگی، اخلاقی ارتقا اور عملی مہارتوں کے فروغ میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معلم کا عمدہ کردار، شائستہ رویہ اور مثبت طرز عمل، طلبہ کی شخصیت سازی میں نہایت موثر ثابت ہوتا ہے۔ اس نظریہ کی روشنی میں تعلیمی اداروں میں ایسا ماحول فراہم کرنا چاہیے جو طلبہ کی علمی، اخلاقی اور سماجی نشوونما کو مستحکم بنیادیں فراہم کریں۔

اختتامیہ

مخفی نصاب تعلیم کا وہ غیر رسمی مگر نہایت موثر پہلو ہے جو طلبہ کی شخصیت، کردار، اخلاق، معاشرتی رویوں اور عملی زندگی کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

اگرچہ یہ رسمی نصاب کا حصہ نہیں ہوتا تاہم تعلیمی ماحول، اساتذہ کے طرز عمل، نظم و ضبط، باہمی تعلقات اور ادارہ جاتی اقدار کے ذریعہ طلبہ میں وقت کی پابندی، احساس ذمہ داری، تعاون، احترام انسانیت، خود اعتمادی، قیادت اور جذباتی پختگی جیسی اعلیٰ صفات پروان چڑھتی ہیں۔ فلپ ڈبلیو جیکسن، کارل راجرز، روز تھل، ڈینیل گولمین، پیئر بور ڈیو اور البرٹ بنڈورا کے نظریات اس حقیقت کی تائید کرتے ہیں کہ تعلیم و تدریس کی حقیقی کامیابی محض علمی معلومات کی منتقلی میں نہیں، بلکہ ایک صالح با کردار، ذمہ دار اور سماجی شعور سے آراستہ انسان کی تعمیر میں مضمر ہے۔ لہٰذا مخفی نصاب کو تعلیمی نظام کا لازمی جزو سمجھتے ہوئے اس کی اہمیت کو تسلیم کرنا اور عملی تدریس میں موثر انداز بروئے کار لانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

■

Shahabullah Khan
Teacher, STS School
Aligarh Muslim University (AMU)
4/482, Bhamola, Opposite Police Chowki
Civil Lines, Aligarh -202001
E-mail: shahabullahkhan50@gmail.com

خصوصی بچوں کے مسائل اور شمولیاتی تعلیم

احتشام تمیز

خصوصی ضروریات والے بچوں کی تعلیم پر گفتگو سے پہلے تمہیدی طور پر یہ سمجھنا ضروری ہے کہ Disability (معذوری) کیا ہے؟ عام طور پر معذوری کو جسمانی کمزوری یا کسی عضو کے متاثر ہونے سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن جدید علمی تصور میں معذوری صرف فرد کی جسمانی یا ذہنی کیفیت کا نام نہیں، بلکہ فرد کی کیفیت اور اس کے ماحول میں موجود رکاوٹوں کے باہمی تعلق سے پیدا ہونے والی صورتِ حال بھی ہے۔ یہاں Impairment (نقص) اور Disability (معذوری) میں فرق سمجھنا ضروری ہے۔ نقص سے مراد جسمانی ساخت، حسی صلاحیت یا کسی جسمانی و ذہنی کارکردگی میں کمی یا تبدیلی ہے، جب کہ معذوری اس وقت زیادہ نمایاں ہوتی ہے جب یہ کیفیت فرد کی روزمرہ سرگرمیوں یا معاشرے میں شرکت کو محدود کرنے لگے مثلاً نابینا بچے کا Visual Impairment اس کی بینائی سے متعلق نقص ہے، لیکن اگر اسے Braille، Audio Material یا مناسب Assistive Technology دستیاب نہ ہو تو اس کی تعلیم میں پیدا ہونے والی رکاوٹ صرف بینائی کی کمی نہیں بلکہ تعلیمی ماحول کی عدمِ رسائی بھی ہے۔ اسی طرح Wheelchair استعمال کرنے والے بچے کے لیے Ramp اور Accessible Toilet کا نہ ہونا اس کی تعلیمی شرکت میں بڑی رکاوٹ بن سکتا ہے WHO کے ICF کے مطابق معذوری کو فرد کے نقص، سرگرمی میں دشواری اور معاشرتی شرکت میں رکاوٹ کے ساتھ ساتھ ماحول کے اثرات کے تناظر میں سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح United Nations Convention on the Rights of Persons with Disabilities (UNCRPD) معذوری کو انسانی حقوق، مساوات، عزت، رسائی اور شمولیت کے تناظر میں دیکھتا ہے۔ ہندوستان میں (RPWD Ad-2016) بھی معذور افراد کے حقوق کو قانونی تحفظ فراہم کرتا ہے۔

معذوری پیدائشی بھی ہوسکتی ہے اور بیماری، حادثے، چوٹ، غذائی کمی یا دیگر طبی عوامل کے نتیجے میں بھی پیدا ہوسکتی ہے۔ تاہم اس کے اثرات کا انحصار صرف فرد کی حالت پر نہیں بلکہ خاندان کے تعاون، تعلیمی مواقع، معاشرتی رویوں، قابلِ رسائی ماحول اور مناسب سہولیات پر بھی ہوتا ہے۔ اس لیے خصوصی بچے کے بارے میں بنیادی سوال یہ نہیں ہونا چاہیے کہ

''وہ کیا نہیں کرسکتا؟''

بلکہ یہ ہونا چاہیے

''وہ کیا کرسکتا ہے، اور اسے آگے بڑھنے کے لیے کس معاونت کی ضرورت ہے؟''

یہی سوچ Inclusive Education (شمولیاتی تعلیم) کی بنیاد ہے۔

''معذوری جسم کی ایک حالت ہے، انسان کی صلاحیتوں اور ارادوں کی نہیں''۔

کسی بھی معاشرے کی ترقی اور تہذیبی شعور کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے کمزور، محروم اور خصوصی افراد کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرتا ہے۔ بچے کسی بھی قوم کا مستقبل ہوتے ہیں۔ بعض بچے پیدائش سے یا بعد از پیدائش جسمانی، ذہنی، حسی، ابلاغی یا تعلیمی مشکلات کا سامنا کرتے ہیں۔ ایسے بچوں کو خصوصی ضروریات والے بچے (Children with special needs (CWSN)) کہا جاتا ہے۔

خصوصی ضروریات والے بچے بھی عام بچوں کی طرح خواب دیکھتے ہیں، محبت چاہتے ہیں، کھیلنا چاہتے ہیں، تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں اور زندگی میں آگے بڑھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ ان کے اندر بھی بے شمار صلاحیتیں، تخلیقی امکانات اور کامیابی کی خواہش موجود ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے انھیں بعض اوقات اضافی مدد، مناسب تعلیمی حکمتِ عملی، معاون ٹیکنالوجی، خاندانی تعاون اور ایسا سماجی ماحول درکار ہوتا ہے جہاں انھیں ترس نہیں بلکہ احترام، مساوات اور مواقع حاصل ہوں۔

بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں آج بھی بعض اوقات معذوری کو کمزوری، بوجھ، محرومی یا بدقسمتی کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہ رویہ خصوصی بچوں کے لیے ان کی اصل جسمانی یا ذہنی مشکل سے کہیں زیادہ بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معذوری کسی انسان کی مکمل شناخت نہیں ہوتی: یہ اس کی زندگی کا صرف ایک پہلو ہے۔ انسان کی اصل پہچان اس کی صلاحیت، شخصیت، کردار، ارادے اور کارکردگی سے ہونی چاہیے۔

خصوصی بچوں کی دنیا

ہر بچہ اپنی ذات میں امکانات کی ایک نئی دنیا ہوتا ہے۔ خصوصی بچے بھی اسی دنیا کا حصہ ہیں، لیکن ان کی زندگی کا سفر بعض اوقات نسبتاً زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک نابینا بچہ دنیا کو آنکھوں سے نہیں بلکہ لمس، آواز اور احساس کے ذریعے سمجھ سکتا ہے۔ سماعت سے محروم بچہ (Hearing Impaired) خاموشی میں ابلاغ کا دوسرا راستہ تلاش کرتا ہے۔ آٹزم اسپیکٹرم ڈس آرڈر (ASD) Autism Spectrum Disorder سے متاثر بچہ دنیا کو اپنے منفرد انداز میں سمجھ سکتا ہے، جب کہ جسمانی معذوری رکھنے والا بچہ محدود جسمانی حرکت کے باوجود وسیع خواب دیکھ سکتا ہے۔

اصل مسئلہ اکثر معذوری سے زیادہ معاشرے کے رویوں میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ جب بچے کی صلاحیتوں کے بجائے اس کی کمزوریوں کو نمایاں کیا جاتا

ہے تو اس کے اندر احساسِ محرومی، اعتماد کی کمی اور تنہائی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس جب بچے کو قبولیت، محبت، مناسب رہنمائی اور مواقع ملتے ہیں تو اس کی پوشیدہ صلاحیتیں نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ اسی لیے جدید Special Education کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ بچے کو صرف اس کی معذوری سے نہیں بلکہ اس کی صلاحیتوں اور انفرادی ضروریات کے تناظر میں دیکھا جائے۔

نفسیاتی پہلو

بچے کی شخصیت کی تعمیر میں محبت، قبولیت، خود اعتمادی اور حوصلہ افزائی بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ خصوصی ضروریات والے بچوں کے لیے یہ عوامل مزید اہم ہو جاتے ہیں، کیونکہ انھیں اپنی روزمرہ زندگی میں متعدد جسمانی، تعلیمی اور سماجی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ جب ایک بچہ اپنے ساتھیوں کو آسانی سے کھیلتے، دوڑتے، گفتگو کرتے یا تعلیمی سرگرمیوں میں کامیاب ہوتے دیکھتا ہے تو بعض اوقات وہ اپنے آپ کو دوسروں سے مختلف محسوس کرنے لگتا ہے۔ اگر ایسے موقع پر والدین، اساتذہ اور معاشرہ اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے اسے نظرانداز کریں یا اس کا مذاق اڑائیں تو اس کے اندر low Self-Esteem، Anxiety، Stress اور احساسِ تنہائی پیدا ہو سکتا ہے۔

بعض بچے خاموشی اختیار کر لیتے ہیں، بعض غصے، چڑچڑے پن یا ضد کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں، جب کہ کچھ بچے سماجی میل جول سے دور رہنے لگتے ہیں۔ ایسے رویوں کو محض بدتمیزی یا ضد سمجھنے کے بجائے ان کے پسِ پشت موجود جذبات کو سمجھنا ضروری ہے، بچے کو یہ احساس دلانا ضروری ہے کہ وہ قابلِ قدر ہے، اس کی رائے اہم ہے اور اس کی کامیابی کا معیار دوسروں سے موازنہ نہیں بلکہ اس کی اپنی پیش رفت ہے۔ Counselling، Psychological Support، Emotional Support اور مثبت تعلیمی ماحول یہاں نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر بچے کو بروقت رہنمائی، حوصلہ افزائی اور مناسب مدد فراہم کی جائے تو وہ اپنی صلاحیتوں کو بہتر طور پر بروئے کار لا سکتا ہے۔

سماجی رویے

خصوصی بچوں کی زندگی صرف ان کی جسمانی یا ذہنی حالت سے متاثر نہیں ہوتی بلکہ معاشرے کا رویہ بھی ان کی شخصیت اور مستقبل پر گہرا اثر ڈالتا ہے اگر معاشرہ مساوات، احترام اور انسانی وقار کو فروغ دے تو خصوصی بچے اعتماد کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن اگر معاشرے میں تعصب، تمسخر، بے حسی اور امتیاز موجود ہو تو معذوری ایک Social Barrier بن جاتی ہے۔ اسکول میں مذاق اڑانا، چھیڑ چھاڑ، Bullying، کھیلوں اور اجتماعی سرگرمیوں سے دور رکھنا یا بچے کو محض اس کی معذوری کی بنیاد پر کمتر سمجھنا اس کی نفسیاتی نشوونما پر منفی اثر ڈال سکتا ہے۔

یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ خصوصی بچے رحم کے نہیں بلکہ حقوق، احترام اور مساوی مواقع کے مستحق ہیں ایک نابینا بچہ شاعر، موسیقار یا استاد بن سکتا ہے۔ جسمانی معذوری رکھنے والا شخص سائنس، انتظامی امور، تعلیم یا کسی دوسرے شعبے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اسی طرح آٹزم اسپیکٹرم پر موجود افراد اپنی منفرد صلاحیتوں کے ذریعے مختلف شعبوں میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا انسان کو اس کی معذوری سے نہیں بلکہ اس کی صلاحیت اور شخصیت سے پہچاننا چاہیے۔

خاندان

خصوصی بچے کی زندگی میں خاندان کا کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ والدین بچے کے پہلے اساتذہ، رہنما اور مربی ہوتے ہیں۔ جب کسی خاندان میں خصوصی ضروریات والا بچہ پیدا ہوتا ہے تو والدین کو تشویش، بے یقینی اور مستقبل کے بارے میں متعدد سوالات کا سامنا ہو سکتا ہے۔ ایسے میں خاندان کے لیے سب سے اہم مرحلہ بچے کو اس کی حقیقی حالت کے ساتھ قبول کرنا ہے۔ بچے کو چھپانے یا اس کی معذوری کو باعثِ شرمندگی سمجھنے کے بجائے اس کی صلاحیتوں کو پہچاننا چاہیے۔

والدین کو چاہیے کہ بچے کا دوسرے بچوں سے غیر ضروری موازنہ نہ کریں، اس کی چھوٹی چھوٹی کامیابیوں کو فروغ دیں، اس کی دلچسپیوں اور صلاحیتوں کو سراہیں اور Independent Living Skills کی حوصلہ افزائی کریں۔ ضرورت پڑنے پر ماہرین، اساتذہ اور Counsellors سے رہنمائی حاصل کی جانی چاہیے۔ بچے کو خاندان کے فیصلوں اور سرگرمیوں میں شامل کرنا بھی ضروری ہے۔ بہن بھائیوں کا مثبت رویہ بچے کی شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ گھر کا ماحول ایسا ہونا چاہیے جہاں خصوصی بچہ خود کو الگ تھلگ نہیں بلکہ خاندان کا برابر کا فرد محسوس کرے۔ دیہی علاقوں میں خصوصی بچوں کے مسائل ہندوستان کے دیہی علاقوں میں خصوصی بچوں کے لیے چیلنجز نسبتاً زیادہ پیچیدہ ہو سکتے ہیں۔ معذوری کے بارے میں آگاہی کی کمی، تربیت یافتہ اساتذہ کی قلت، قابلِ رسائی تعلیمی عمارتوں کا فقدان، معاون آلات تک محدود رسائی اور معاشی مشکلات بعض خاندانوں کے لیے بڑی رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ کئی علاقوں میں آج بھی معذوری کو قسمت، بدقسمتی یا سماجی شرمندگی سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے۔ نتیجتاً بعض بچے اسکول سے دور رہ جاتے ہیں اور اپنی تعلیمی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لا پاتے۔

اس صورتِ حال کو تبدیل کرنے کے لیے صرف سرکاری اسکیمیں کافی نہیں۔ Family Counselling، School Support، Local Participation اور Community Awareness کو بھی مضبوط بنانا ہوگا۔ خصوصی بچوں کی شناخت، مناسب Assessment، Intervention اور مسلسل Follow-up کے لیے اسکول، خاندان، صحت کے مراکز اور متعلقہ ماہرین کے درمیان موثر رابطہ ضروری ہے۔

ہندوستان میں خصوصی تعلیم

ہندوستان میں گزشتہ برسوں کے دوران Special Education اور Inclusive Education کے میدان میں اہم پیش رفت ہوئی ہے۔ (RTE Act-2009) کے ذریعے بچوں کے تعلیم کے حق کو قانونی بنیاد فراہم کی گئی۔ (RPWD Act-2016) نے معذور افراد کے حقوق اور مساوی مواقع کو مزید مضبوط قانونی تحفظ فراہم کیا۔ اسی طرح (NEP-2020) نے تعلیم کو زیادہ جامع، مساوی اور شمولیاتی بنانے پر زور دیا۔ پالیسی میں ایسے تعلیمی ماحول کی ضرورت کو اجاگر کیا گیا جہاں مختلف صلاحیتوں اور ضروریات رکھنے والے بچے تعلیمی عمل میں موثر طور پر شامل ہو سکیں۔ Samagra Shiksha کے ذریعے بھی خصوصی ضروریات والے بچوں کے لیے مختلف نوعیت کی تعلیمی معاونت، Special Educators، Assistive Devices اور Home- Based Education سمیت دیگر سہولیات کی فراہمی پر توجہ دی گئی ہے۔ تاہم کسی بھی قانون یا پالیسی کی حقیقی کامیابی اس وقت سامنے آتی ہے جب اس کے فوائد آخری بچے تک پہنچیں۔ پالیسی بنانا اہم ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ اہم اس کا Ground Level Implementation ہے۔

شمولیاتی تعلیم

Inclusive Education کا مقصد صرف خصوصی بچے کو عام اسکول میں داخل کرنا نہیں بلکہ اسکول کے تعلیمی، سماجی اور جسمانی ماحول کو اس طرح تبدیل کرنا ہے کہ ہر بچہ بامعنی طور پر سیکھ سکے۔ شمولیاتی کلاس روم میں مختلف صلاحیتوں کے حامل بچے ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس سے خصوصی بچوں کو نہ صرف تعلیمی مواقع ملتے ہیں بلکہ ان کے اندر سماجی اعتماد بھی پیدا ہوتا ہے۔ دوسری طرف عام بچے بھی Diversity، Empathy، Cooperation اور Respect for Differences جیسے انسانی اوصاف سیکھتے ہیں۔

خصوصی تعلیم میں Individualized Education Plan (IEP) ایک اہم تصور ہے۔ بچے کی موجودہ تعلیمی سطح، ضروریات اور اہداف کو سامنے رکھتے ہوئے مناسب تعلیمی Intervention Plan تیار کیا جا سکتا ہے۔ ایک حساس استاد بچے کی کمزوری کو اس کی شناخت نہیں بننے دیتا؛ وہ اس کی پوشیدہ صلاحیت کو تلاش کرتا ہے۔

آج ٹیکنالوجی نے خصوصی تعلیم کے میدان میں نئی راہیں کھولی ہیں۔ ایسی بہت سی چیزیں ممکن ہوگئی ہیں جو ماضی میں خصوصی بچوں کے لیے مشکل سمجھی جاتی تھیں۔ نابینا اور کم بینا طلبہ کے لیے Braille Display، Screen Reader، Magnification Software اور دیگر معاون ٹیکنالوجیز اہم معاونت فراہم کرسکتی ہیں۔ سماعت سے محروم طلبہ کے لیے Hearing Devices، Accessible Digital Content اور Captioning مفید ہو سکتے ہیں۔ زبان اور ابلاغ کی مشکلات رکھنے والے بچوں کے لیے Augmentative and Alternative Communication (AAC) معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ اسی طرح Digital Learning، Smart Classroom اور مصنوعی ذہانت (Artificial Intelligence) پر مبنی بعض تعلیمی وسائل مستقبل میں خصوصی بچوں کی تعلیم کو مزید قابلِ رسائی بنا سکتے ہیں۔ لیکن ٹیکنالوجی خود مقصد نہیں: اصل مقصد یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کو بچے کی Learning Needs کے مطابق استعمال کیا جائے۔

خصوصی بچوں کی تعلیم اور ترقی کے لیے مستقبل کی حکمتِ عملی صرف حکومت تک محدود نہیں ہونی چاہیے۔ خاندان، اسکول، اساتذہ، مقامی برادری اور سول سوسائٹی سب کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ سب سے پہلے خصوصی ضروریات والے بچوں کی بروقت Identification اور Assessment اور Intervention کو مضبوط بنانا ہوگا۔ اساتذہ کی Continuous Professional Development بھی ضروری ہے تاکہ انھیں مختلف ضروریات رکھنے والے بچوں کو سمجھنے اور بنیادی Inclusive Teaching Strategies استعمال کرنے کی تربیت حاصل ہو۔ اسی طرح Counsellors، Therapists اور دیگر ماہرین کے درمیان تعاون کو مضبوط بنانا ہوگا۔ دیہی علاقوں پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے تاکہ شہروں اور دیہات کے درمیان Special Education کی سہولیات کا فرق کم کیا جا سکے۔

خصوصی بچوں کے بارے میں ہماری سوچ میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ انھیں صرف ''بیچارے بچے'' سمجھنے کے بجائے ''صلاحیت رکھنے والے بچے'' سمجھنا ہوگا۔ انھیں خیرات نہیں، مواقع چاہییں: ترس نہیں، احترام چاہیے؛ تنہائی نہیں، شمولیت چاہیے: اور محض داخلہ نہیں بلکہ معیاری تعلیم اور بامعنی شرکت چاہیے۔ جب ہم کسی خصوصی بچے کے لیے اسکول کا دروازہ کھولتے ہیں تو ہم صرف ایک بچے کو تعلیم نہیں دیتے بلکہ ایک خاندان کو امید دیتے ہیں۔ جب ہم اسے خود مختار بناتے ہیں تو ہم پورے معاشرے کے مستقبل کو مضبوط کرتے ہیں۔ خصوصی بچوں پر خرچ ہونے والا سرمایہ دراصل کسی ایک بچے پر خرچ نہیں ہوتا؛ یہ ایک ایسے مستقبل میں سرمایہ کاری ہے جہاں زیادہ سے زیادہ افراد باوقار، خود مختار اور فعال شہری بن سکیں۔

خصوصی ضروریات والے بچوں کی زندگی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ انسان کی قدر اس کی جسمانی یا ذہنی صلاحیتوں سے نہیں بلکہ اس کے انسان ہونے سے ہوتی ہے۔ معذوری کسی بچے کے خوابوں، ارادوں اور مستقبل کا فیصلہ نہیں کرتی؛ اصل فیصلہ معاشرے کا رویہ، خاندان کا تعاون، تعلیمی مواقع اور مناسب سہولیات کرتی ہیں۔ شمولیاتی تعلیم محض تعلیمی نظام کی اصلاح کا نام نہیں بلکہ یہ ایک انسانی، سماجی اور تہذیبی فکر ہے۔ اس کا مقصد صرف خصوصی بچوں کو اسکول میں داخل کرنا نہیں بلکہ انھیں ایسا ماحول فراہم کرنا ہے جہاں وہ سیکھ سکیں، آگے بڑھ سکیں، اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر سکیں اور معاشرے کے فعال رکن بن سکیں۔ ہمیں ایسا معاشرہ تشکیل دینا ہوگا جہاں کسی بچے کی معذوری اس کی منزل کا فیصلہ نہ کرے: جہاں اسکول کی عمارت، نصاب، تدریس اور معاشرتی رویے اس کے لیے رکاوٹ نہیں بلکہ سہارا بنیں؛ جہاں والدین اپنے خصوصی بچے کو بوجھ نہیں بلکہ امکانات کی ایک نئی دنیا سمجھیں؛ اور جہاں استاد ہر بچے میں کامیابی کی ایک نئی کہانی دیکھ سکے۔

خصوصی بچوں کو رحم نہیں، احترام چاہیے؛ ہمدردی سے زیادہ مواقع چاہیے؛ تنہائی نہیں، شمولیت چاہیے: اور محض اسکول میں داخلہ نہیں بلکہ معیاری اور قابلِ رسائی تعلیم چاہیے۔ جب ہم کسی خصوصی بچے کے لیے اسکول کا دروازہ کھولتے ہیں تو ہم صرف ایک بچے کو تعلیم نہیں دیتے بلکہ ایک خاندان کو امید دیتے ہیں۔ جب ہم اسے خود مختار بناتے ہیں تو ہم پورے معاشرے کے مستقبل کو مضبوط کرتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی سمجھنا ہوگا کہ خصوصی بچوں کی تعلیم اور ترقی صرف حکومت یا اسکول کی ذمہ داری نہیں۔ خاندان، اساتذہ، Special Educators، Counsellors، Therapists، مقامی برادری اور پورا معاشرہ اس ذمہ داری میں برابر کے شریک ہیں۔ قوانین اور پالیسیاں راستہ ضرور دکھاتی ہیں، مگر ان کی حقیقی کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب ان کا نفاذ زمین پر نظر آئے اور آخری بچے تک سہولت پہنچے۔

آخرکار، ہماری کامیابی اس وقت ہوگی جب خصوصی بچہ خود کو معاشرے کا بوجھ نہیں بلکہ اس کا برابر کا حصہ محسوس کرے گا: جب اس کی شناخت اس کی معذوری سے نہیں بلکہ اس کی صلاحیت، شخصیت اور کارکردگی سے ہوگی: اور جب ہر بچے کو یہ یقین ہوگا کہ اس کے خواب بھی اتنے ہی قیمتی ہیں جتنے کسی دوسرے بچے کے خواب۔ معذوری نہیں، عزم کا ایک عنوان ہے۔ جہاں امید زندہ ہو، وہیں پرواز ممکن ہے ہم سب کو مل کر ایسا معاشرہ تعمیر کرنا ہوگا جہاں ہر بچہ — چاہے وہ کسی بھی جسمانی، حسی، ذہنی یا تعلیمی ضرورت کے ساتھ زندگی گزار رہا ہو، اپنی صلاحیتوں کو پہچان سکے، تعلیم حاصل کر سکے، عزت کے ساتھ زندگی گزار سکے اور اپنے خوابوں کو حقیقت میں بدل سکے۔ کیونکہ ایک مہذب معاشرے میں کسی بچے کی قدر اس بات سے نہیں ہوتی کہ وہ کیا نہیں کر سکتا، بلکہ اس بات سے ہوتی ہے کہ وہ کیا کر سکتا ہے۔

■

Md. Ehtisham
Ward No.10, Darha, Mahammadia,
Dagarua, Purnia Bihar 854330
Mob. 9519416068
Email: diploma6068@gmail.com

گوشۂ راہی معصوم رضا

راہی معصوم رضا ہماری علمی و ادبی روایت کا اہم حصہ ہیں۔ اگست 2027 کو راہی کی پیدائش کے سو سال پورے ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف اداروں کی جانب سے ان پر صد سالہ تقاریب کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' کا یہ خصوصی گوشہ بھی اسی مناسبت سے راہی کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ اس گوشے میں راہی کی سوانح، شخصیت، فن اور مختلف علمی و ادبی خدمات سے متعلق مضامین شامل ہیں۔ (ادارہ)

سوانحی خاکہ

نام	:	معصوم رضا
خاندانی نام	:	سید معصوم رضا عابدی
تخلص	:	راہی
پیدائش	:	1 اگست 1927، گنگولی، غازی پور، اتر پردیش
وفات	:	15 مارچ 1992 ممبئی، مہاراشٹر
والد	:	سید بشیر حسین عابدی
والدہ	:	نفیسہ بیگم
بیوی	:	نیر جہاں
تعلیم	:	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مکالمہ نگاری/ اسکرپٹ رائٹنگ: مہابھارت، ملی، میں تلسی تیرے آنگن کی، گول مال، قرض، جدائی، طوائف، انجمن

اعزازات برائے مکالمہ نویسی: میں تلسی تیرے آنگن کی (1979)، طوائف (1985)، لمحے (1991)

چند اہم مطبوعات

ناول

آدھا گاؤں (ناول)

ٹوپی شکلا (ناول)

اوس کی بوند (ناول)

سین 75 (ناول)

نیم کا پیڑ (ناول)

دل ایک سادہ کاغذ (ناول)

شاعری

اجنبی شہر کے اجنبی راستے (شعری مجموعہ)

غریب شہر (شعری مجموعہ)

1857 (طویل نظم)

نیا سال (شعری مجموعہ)

رقص مے (شعری مجموعہ)

تنقید

طلسم ہوشربا: ایک مطالعہ (تنقید)

یاس یگانہ چنگیزی (تنقید)

نہاں رباب

راہی صاحب کے لیے الفاظ محض اظہار کا ذریعہ نہیں ان کی اصل پونجی تھے: مظفر علی

پدم شری جناب مظفر علی فلم ساز، شاعر، فنکار، فیشن ڈیزائنراور سماجی کارکن کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ انہوں نے لکھنؤ کے La Martiniere اسکول سے تعلیم حاصل کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے سائنس میں گریجویشن کیا۔ فلم سازی کی طرف آنے سے قبل انہوں نے اشتہاری شعبے میں کام کیا۔ان کی ہدایت کاری میں بننے والی ابتدائی فلموں میں 'گمن' (1978) اور 'امراؤ جان' (1981) کے نام بطور خاص لیے جاسکتے ہیں۔'انجمن' اور 'جانثار' جیسی فلمیں بھی انہوں نے ہی بنائی ہیں۔ مظفر علی کے لیے علی گڑھ خاص اہمیت رکھتا ہے، علی گڑھ میں ہی ان کی ملاقات راہی معصوم رضا جیسی شخصیت سے ہوئی۔ وہ ان کی شخصیت اور صلاحیت سے بہت متاثر ہوئے۔ آج ہم راہی معصوم رضا کو ایک ممتاز ناول نگار اور اسکرپٹ رائٹر کے طور پر جانتے ہیں۔ مظفر علی کی ایک فلم 'انجمن' کا مکالمہ راہی معصوم رضا نے ہی تحریر کیا ہے۔ دراصل یہ انٹرویو راہی معصوم رضا کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات پر مشتمل ہے۔ اس انٹرویو میں مظفر علی نے نہاں رباب کے سوالوں کا بہت خوبصورتی سے جواب دیا ہے۔ (ادارہ)

نہاں رباب: راہی معصوم رضا سے آپ کی پہلی ملاقات کن حالات میں ہوئی؟ علی گڑھ کی اس ادبی فضا کے بارے میں بھی کچھ بتائیے جس میں آپ نے انھیں پہلی بار دیکھا؟

مظفر علی: ہمارے ساتھ ایک دوست اصغر وجاہت بھی پڑھتے تھے۔ ہم لوگ جب کسی سے ملتے تھے تو محض ملاقات تک محدود نہیں رہتے، جانے انجانے میں اس شخص کی پوری شخصیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے، اس کے مزاج، انداز اور کام کو بھی محسوس کرتے تھے۔ راہی صاحب سے ہماری پہلی ملاقات بھی اسی طرح ہوئی۔ ان دنوں علی گڑھ کی لائبریری کی کینٹین، جسے جاوید کمال صاحب چلاتے تھے، شام ڈھلتے ہی ایک خوبصورت ادبی محفل میں تبدیل ہوجاتی۔ مختلف شاعر اپنا کلام لے کر وہاں پہنچتے، جاوید صاحب بھی اپنا کلام سناتے اور دوسرے شعرا اپنی تخلیقات سے محفل کو رونق بخشتے۔ یہی وہ ادبی ماحول تھا جہاں راہی صاحب بھی دکھائی دیے۔ ہمارے لیے، جو ابھی ادب کی دنیا میں بالکل نئے تھے، یہ محض کسی شاعر سے ملاقات نہیں تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اچانک ادب کی ایک ایسی دنیا ہمارے سامنے کھل گئی ہو جس کا ہمیں ابھی پوری طرح ادراک بھی نہیں تھا۔ راہی صاحب کی شخصیت میں بھی ایک خاص کشش تھی۔ ان سے ملتے ہوئے صرف ان کی شاعری نہیں، ان کا مزاج، گفتگو اور ان کے ہونے کا ایک منفرد انداز بھی محسوس ہوتا تھا۔ ہم ان دنوں ادب میں نئے نئے قدم رکھ رہے تھے، اس لیے کسی ایسی شخصیت کا قریب آجانا جس میں تخلیق اور شخصیت دونوں کی کشش موجود ہو، ہمارے لیے ایک غیر معمولی تجربہ تھا۔ شاید اسی کیفیت کو بیان کرنے کے لیے میں کہوں گا کہ راہی صاحب سے وہ پہلی ملاقات ہمارے لیے ایسی تھی جیسے کسی کی اچانک لاٹری نکل آئے۔

ن ر: راہی صاحب کی تحریروں سے تو ان کی تخلیقی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن ان سے قریب رہنے پر ان کی ذات کے کون سے ایسے پہلو سامنے آئے جو ان کی تحریروں سے پوری طرح ظاہر نہیں ہوتے؟

م ع: راہی معصوم رضا کو صرف ان کی تحریروں کے حوالے سے دیکھنا شاید ان کی شخصیت کے ایک بڑے حصے سے محروم رہ جانا ہے۔ ایک انسان جب اپنی پوری زندگی اور تمام تر رنگارنگی کے ساتھ آپ کے سامنے آتا ہے تو اس کے کئی ایسے رنگ بھی سامنے آتے ہیں جو محض تحریر کے ذریعے پوری طرح ظاہر نہیں ہو پاتے۔ راہی صاحب بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ ان کے انداز گفتگو، بات کرنے کے طریقے اور لوگوں سے ملنے کے سلیقے سب میں ایک خاص انفرادیت تھی۔ مجھے آج بھی یہ بات خاص طور پر یاد ہے کہ علی گڑھ میں ایک ایسے شخص کے لیے، جو ابھی یونیورسٹی میں نیا نیا داخل ہوا ہو، راہی صاحب جیسی شخصیت کا اپنے آپ کو اس کے سامنے پوری طرح کھول دینا کتنی بڑی بات تھی۔ ان کے قصے، ان کی شاعری اور ان کی باتیں تو کسی نہ کسی صورت ہم تک پہنچتی ہی تھیں، لیکن جب ان کی اپنی ذات کے وسیلے سے ان تک پہنچنے کا موقع ملا تو محسوس ہوا کہ ان کی شاعری محض الفاظ کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک زندہ تجربہ ہے۔ کئی مواقع پر تو

یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان کا کوئی شعر ہمارے سامنے اچانک زندہ ہو اٹھا ہو۔ شاید اسی لیے راہی صاحب نے اپنی ذات کو بھی ایک شعر میں کچھ یوں بیان کیا تھا۔

انساں تھا کسی اور کا سایہ بھی نہیں تھا
ہر ڈھونڈنے والے کو وہ ملتا بھی نہیں تھا

راہی صاحب واقعی عام لوگوں جیسے نہیں تھے۔ ان میں ایک خاص ادا، بے ساختگی اور کشادگی تھی جو انھیں دوسروں سے الگ کرتی تھی۔ یہ رنگ ہم نے علی گڑھ میں ان کی شخصیت کے بہت قریب رہ کر دیکھا۔

ن د: شاعر، ناول نگار، مکالمہ نگار اور اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے راہی صاحب نے مختلف میدانوں میں اپنی شناخت بنائی۔ آپ کے نزدیک ان تمام حوالوں کو جوڑنے والی ان کی بنیادی تخلیقی قوت کیا تھی؟

م ع: راہی صاحب کی اصلی طاقت تھے۔ ان کے لیے الفاظ محض اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ یہی ان کی اصل پونجی تھے۔ وہ خود کہتے تھے: ”میری پونجی ہے یہی لفظ، یہی تھوڑے سے لفظ۔ مفت کا مال سمجھ کر میں لٹاتا رہا اس دولت بے مایہ کو، جس تصور کے لیے ایک ہی لفظ کافی تھا، سو لفظ کے لیے۔“ میرے خیال میں اس ایک جملے میں راہی صاحب کی پوری تخلیقی شخصیت کا ایک بڑا راز پوشیدہ ہے۔

وہ الفاظ کی قدر و قیمت سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ ایک لفظ کبھی کبھی پورے تصور، پوری کیفیت اور پورے تجربے کو اپنے اندر سمیٹ سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ لفظ کو روک کر رکھنے کے قائل نہیں تھے۔ وہ اسے اپنی تخلیقی سخاوت کے ساتھ برتتے اور دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ راہی صاحب کو الفاظ پر غیر معمولی عبور حاصل تھا، لیکن ان کی اصل طاقت صرف الفاظ کے وسیع ذخیرے میں نہیں تھی۔ اصل کمال یہ تھا کہ وہ لفظ کو کس طرح برتتے اور کس انداز سے پیش کرتے تھے۔ ایک ہی لفظ عام آدمی کے لیے محض ایک لفظ رہ سکتا ہے، لیکن راہی صاحب کے ہاتھ میں آکر وہ معنی کی ایک نئی دنیا کھول دیتا تھا۔ وہ لفظ کے ظاہری معنی کے ساتھ اس کی تہہ میں چھپی کیفیت، اس کی موسیقیت اور اس کے اثر کو بھی محسوس کرتے تھے۔ ان کا کمال یہ تھا کہ وہ لفظ، معنی اور انداز بیان کے درمیان ایسا رشتہ قائم کرتے تھے کہ ایک معمولی بات بھی غیر معمولی محسوس ہونے لگتی تھی۔ یوں کہیے کہ راہی صاحب کو صرف لفظ پر عبور نہیں تھا بلکہ وہ لفظ کے مزاج سے بھی واقف تھے۔ یہی لفظ شناسی اور اظہار کی انفرادیت ان کے فن کی اصل قوت تھی۔

ن د: آپ نے راہی صاحب کے ساتھ رہتے ہوئے ان کی ذاتی دنیا کو بھی قریب سے دیکھا۔ ان کی اپنی مٹی، گنگولی اور بچپن کے تجربات ان کی تخلیقی شخصیت میں کس طرح موجود تھے؟

م ع: راہی صاحب میں ایک بہت خاص بات یہ تھی کہ وہ اپنی زمین سے گہرائی کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ وہ اپنی مٹی سے جڑے تھے، اپنی تہذیب سے جڑے تھے، گنگا سے جڑے تھے اور گنگولی سے بھی ان کا ایسا رشتہ تھا جو محض کسی آبائی گاؤں سے تعلق کا رشتہ نہیں تھا، بلکہ ان کی ذات اور ان کے تخلیقی شعور کا حصہ تھا۔

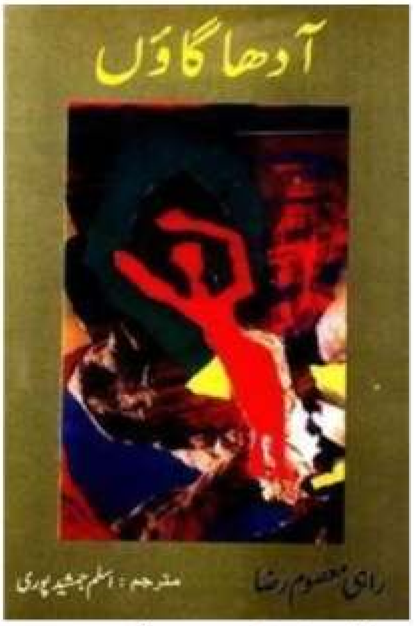

’آدھا گاؤں‘ پڑھتے ہوئے بھی یہ احساس ہوتا ہے کہ گنگولی ان کے لیے صرف ایک جگہ نہیں، ایک پوری دنیا تھی۔ ایسی دنیا جس میں ان کے بچپن کی یادیں، وہاں کے لوگ، رشتے، بولی اور تہذیبی زندگی اپنی پوری معنویت کے ساتھ موجود تھے۔ ان کی تحریر میں یہ دنیا کسی خارجی مشاہدے کی طرح نہیں آتی، بلکہ یوں محسوس ہوتی ہے جیسے وہ خود اس دنیا کے اندر سے بول رہے ہوں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ میں نے راہی صاحب سے کبھی گنگولی یا ان کے بچپن کے بارے میں اس طرح تفصیلی گفتگو نہیں کی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جن چیزوں کو ہم ان سے پوچھ کر جاننا چاہتے، وہ انھیں پہلے ہی لکھ چکے تھے۔ ان کے ذہن میں جو فوری تصویریں ابھرتی تھیں، ان پر وہ خود بات کرتے اور ہم خاموشی سے انھیں سنتے رہتے تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ ان کے سامنے بیٹھ کر ہماری ہمت ہی نہیں پڑتی تھی کہ بیچ میں کچھ کہیں یا کوئی سوال کریں۔ ہم تو انھیں سننے میں اس طرح کھو جاتے تھے جیسے خود اپنی جگہ سے غائب ہو گئے ہوں۔ ان کی باتوں میں ایسی کشش تھی کہ وہ جو کہتے، اس کے ساتھ ایک پوری دنیا ہمارے سامنے آباد ہوتی چلی جاتی تھی۔

ن د: راہی معصوم رضا کے ناولوں میں عام زندگی کے لوگ غیر معمولی معنویت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ آپ کے مشاہدے میں ان کے کرداروں کی تشکیل کا بنیادی سرچشمہ کیا تھا؟

م ع: راہی صاحب کے کردار کسی بنائی ہوئی دنیا سے نہیں آتے تھے۔ جو لوگ ان کی روزمرہ زندگی سے جڑتے تھے، جو ان کے آس پاس ہوتے تھے، جنھیں وہ دیکھتے، سنتے اور اپنے تجربے میں محسوس کرتے تھے، وہی کسی نہ کسی طرح ان کے کردار بن جاتے تھے۔ ان کے لیے کردار محض کہانی کو آگے بڑھانے والے لوگ نہیں تھے، بلکہ یہ زندگی کے وہ چہرے تھے جن سے راہی صاحب کا براہ راست واسطہ پڑا تھا۔ میرا خیال ہے کہ راہی صاحب اپنے آس پاس کی زندگی کو بہت غور سے دیکھتے تھے۔ روزمرہ میں ملنے والا کوئی شخص، اس کا انداز گفتگو، اس کا رویہ، اس کی عادتیں یا اس کی کوئی چھوٹی سی بات بھی ان کے ذہن میں محفوظ ہو جاتی تھی۔ پھر یہی چیز تخلیق میں ایک نئے روپ کے ساتھ سامنے آتی تھی۔ اسی لیے ان کے کردار ہمیں محض ناول کے کردار نہیں لگتے بلکہ ایسے لوگ محسوس ہوتے ہیں جن سے ہماری کبھی نہ کبھی ملاقات ہوئی ہے، جنھیں ہم اپنے آس پاس دیکھتے رہے ہیں۔ ان میں زندگی کی وہ حرارت اور سچائی محسوس ہوتی ہے جو کسی مصنوعی کردار میں پیدا کرنا آسان نہیں۔

مجھے لگتا ہے کہ راہی صاحب کے یہاں کردار نگاری دراصل زندگی کا ایک حصہ تھی۔ وہ زندگی کو دیکھتے تھے، اسے اپنے اندر جذب کرتے تھے اور پھر اپنی تخلیقی قوت سے اسے ایک نئی معنویت عطا کرتے تھے۔ ان کی خاص بات شاید یہی تھی کہ وہ اپنے کردار زندگی سے لیتے تھے، لیکن انھیں محض نقل نہیں کرتے تھے۔ ان کے تخلیقی عمل میں وہ کردار ایک ایسی دنیا میں داخل ہوتے تھے جہاں وہ اپنی پوری معنویت کے ساتھ زندہ ہو جاتے تھے۔

ن د: راہی معصوم رضا کی زبان میں اردو، ہندی اور مقامی بولیوں کا امتزاج ایک خاص تہذیبی رنگ پیدا

کرتا ہے۔ زبان، اس کے برتاؤ اور بالخصوص اردو رسم الخط کے بارے میں راہی صاحب کا بنیادی تصور کیا تھا؟

م ع: راہی صاحب تو بنیادی طور پر زبان کو زندہ کرنا، زندہ رکھنا اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اسے پہنچانا چاہتے تھے۔ میرے خیال میں یہی ان کا بنیادی مشن تھا۔ وہ زبان کو کسی ایک دائرے میں قید کر کے دیکھنے کے قائل نہیں تھے۔ ان کا ذہن بہت کھلا ہوا تھا اور وہ زبان کو اس کی پوری وسعت کے ساتھ دیکھتے تھے۔ اگر ہندی کے ذریعے کوئی لفظ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ رہا ہے تو ان کے نزدیک یہ اچھی بات تھی۔ وہ اس معاملے میں کسی تعصب کے شکار نہیں تھے ان کے لیے اصل اہمیت زبان کے زندہ رہنے اور لوگوں تک پہنچنے کی تھی۔

دیکھیے! ہندوستان میں اردو اور ہندی کے درمیان جو تقسیم پیدا ہوئی، اس کا ایک تاریخی پس منظر ہے اور اتفاق سے جس زبان کے پاس اقتدار اور رسائی زیادہ ہے، اس کے ذریعے الفاظ بھی زیادہ لوگوں تک پہنچتے ہیں۔ راہی صاحب شاید اسی حقیقت کو بہت صاف نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کی تحریروں میں جو باتیں، جو احساسات اور جو تجربات تڑپ رہے تھے کہ لوگوں تک پہنچیں، ان کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ ان تک پہنچنے کا راستہ بھی تلاش کریں۔ اگر وہ ہندی میں نہ لکھتے تو میرے خیال میں یہ ایک طرح کی حماقت ہوتی۔ ہندی میں لکھنے سے ان کے کام کو ایک نئی زندگی ملی، ایک وسیع تر پہچان ملی اور لوگوں کے درمیان ان کی اپنی الگ شناخت قائم ہوئی۔ راہی صاحب کے نزدیک شاید زبان کا اصل مسئلہ یہی تھا کہ وہ زندہ رہے، لوگوں تک پہنچے اور اپنے اندر موجود تجربے کو پوری قوت سے منتقل کرے۔

ن د: راہی معصوم رضا کی شوخی، برجستگی اور بے باکی ان کی نجی زندگی میں کس طرح جلوہ گر ہوتی تھی؟ کوئی ایسی یاد جو آج بھی آپ کو مسکرانے پر مجبور کر دیتی ہو؟

م ع: اس بارے میں بہت سی باتیں ہیں، لیکن بعض باتیں ذاتی نوعیت کی ہوتی ہیں، انھیں اسی طرح رہنے دینا بہتر ہے۔ البتہ ایک واقعہ ہے جو آج بھی یاد آتا ہے تو راہی صاحب کی شوخی اور ان کے مخصوص اندازِ اظہار کی ایک پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ 1964 میں علی گڑھ کے جنرل ایجوکیشن سینٹر کے کینیڈی ہال میں ہم نے ایک پینٹنگ کی نمائش منعقد کی تھی اور راہی صاحب کو اس میں بطور مہمان خصوصی مدعو کیا تھا۔ انھوں نے پہلے تو ہنستے ہوئے کہا: ''یار، مجھے کہاں بلا رہے ہو!'' لیکن پھر وہ آئے، نمائش دیکھی اور ہماری کتاب پر ایک شعر لکھ گئے۔ وہ شعر آج بھی ان کی شخصیت کی برجستگی کا آئینہ معلوم ہوتا ہے۔

ایک ہم ہیں لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے

یہ صرف ایک شعر نہیں تھا، اس میں ان کی شوخی بھی تھی، خود پر ہنس لینے کا حوصلہ بھی اور دوسروں کی خوبی کو پہچان لینے کی وہ نظر بھی جو راہی صاحب کے مزاج کا حصہ تھی۔

> **راہی صاحب ایک نہایت حساس انسان تھے۔ وہ اپنے حالات اور اپنے Predicament کو بھی سمجھتے تھے، مگر ان میں کسی طرح کا ایگو نہیں تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ آج کل کے بہت سے شاعروں اور ادیبوں میں جو ایک طرح کا ایگو نظر آتا ہے، راہی صاحب اس سے بالکل مختلف تھے۔**

ان کے ساتھ جو ایک حلقہ تھا، اس میں رہتے ہوئے ایک بات بہت شدت سے محسوس ہوتی تھی کہ He never let anything weigh him down یعنی زندگی کی سنجیدگیوں اور پریشانیوں کو وہ اپنے اوپر اس طرح سوار نہیں ہونے دیتے تھے کہ آدمی کی بے ساختگی ہی ختم ہو جائے۔ وہ زندگی کو ایک خاص ادا، ایک خاص انداز اور اپنی مخصوص شوخی کے ساتھ جیتے تھے۔ ان کی شخصیت میں ایک ایسی روانی تھی کہ غم بھی آئے تو اس کے ساتھ مسکرانے کی گنجائش باقی رہتی تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ راہی صاحب کی یاد صرف ان کی تحریروں سے نہیں، ان کے جملوں، ان کی ادا اور ان کے ساتھ گزارے ہوئے لمحوں سے بھی زندہ رہتی ہے۔

ن د: آپ کی فلم 'انجمن' میں راہی معصوم رضا کی مکالمہ نگاری نے فلم کے تہذیبی اور سماجی مزاج کو ایک خاص گہرائی عطا کی۔ راہی صاحب کے ساتھ انجمن پر کام کرنے کا تجربہ کیسا رہا؟ کیا اس دوران ان کے ساتھ کام کرنے کا کوئی خاص پہلو یا یاد آپ کے ذہن میں آج بھی محفوظ ہے؟

م ع: جی جی! راہی صاحب کے ساتھ کام کرنے کا ہمارا طریقہ ہی کچھ ایسا تھا کہ ایک بہت خوبصورت ورکنگ ریلیشن شپ بن گئی تھی۔ وہ کہتے تھے، ''تم سب سے ملے ہو، تم سب کو جانتے ہو، میں تو انھیں صرف الفاظ دوں گا۔ تم انھیں کرداروں کے بارے میں جتنا بتا سکتے ہو، اپنے طریقے سے بتاتے رہو، پھر میں انھیں لفظوں میں پروؤں گا۔'' چنانچہ میں کرداروں اور ان کی دنیا کے بارے میں انھیں بتاتا رہتا اور وہ ان تمام کیفیات کو اپنے الفاظ میں ڈھالتے جاتے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس سے بہتر کام ہم نے کسی اور کے ساتھ آج تک نہیں کیا۔ کام کرتے ہوئے بہت مزا آتا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے چیزیں خود بخود ہمارے سامنے آتی جا رہی ہیں۔ میں شروع ہی سے چاہتا تھا کہ راہی صاحب کے ساتھ کام کروں۔ جب انھوں نے میری فلم 'گمن' دیکھی تو وہ بہت متاثر ہوئے۔ ان کے بیٹے ندیم خان نے اس میں کیمرہ مین کا کام کیا تھا۔ فلم دیکھنے کے بعد راہی صاحب نے 'شمع' میں لکھا تھا کہ ''گمن دیکھ کر لگا کہ میں بھی بمبئی میں غلام حسن کی طرح اپنے قلم کی ٹیکسی چلا رہا ہوں۔''

راہی صاحب ایک نہایت حساس انسان تھے۔ وہ اپنے حالات اور اپنے Predicament کو بھی سمجھتے تھے، مگر ان میں کسی طرح کا ایگو نہیں تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ آج کل کے بہت سے شاعروں اور ادیبوں میں جو ایک طرح کا ایگو نظر آتا ہے، راہی صاحب اس سے بالکل مختلف تھے۔ وہ ہر شخص سے ایسے ملتے تھے جیسے وہ ان کا دوست ہو۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ لوگوں سے ملنے کو سیکھنے کا ایک موقع سمجھتے تھے۔ دوسروں کو سننا، ان کے تجربات کو سمجھنا اور پھر انھیں اپنی تخلیق کا حصہ بنا لینا، ان کے مزاج کا ایک اہم پہلو تھا۔ یہی بے تکلفی اور کشادہ دلی ہمارے کام کے رشتے کو بھی غیر معمولی بناتی تھی۔

ن د: 'انجمن' کے علاوہ بھی کیا آپ کو راہی معصوم رضا کے ساتھ کسی اور فلم یا تخلیقی منصوبے پر کام کرنے کا موقع ملا؟ یا 'انجمن' ہی آپ دونوں کا واحد مشترکہ کام تھا؟

م ع: نہیں! بس 'انجمن' ہی ہمارا مشترکہ کام تھا۔ 'انجمن' 1986 میں بنی تھی۔ اس کے بعد میں 'زونی' بنانے کے لیے کشمیر چلا گیا اور اپنی دوسری فلم میں مصروف ہو گیا۔ پھر وقت بہت تیزی سے گزر گیا اور 1992 میں راہی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اس طرح 'انجمن' ہی وہ واحد فلم رہی جس میں ہمیں ایک ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔

شاید اس بات کا افسوس ہمیشہ رہے گا کہ راہی

صاحب کے ساتھ کام کا یہ سلسلہ آگے نہیں بڑھ سکا۔ ہماری جو ورکنگ ریلیشن شپ انجمن کے دوران بنی تھی، اس میں ایک خاص تخلیقی ہم آہنگی تھی اور مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ہم ایک دوسرے کی بات کو بہت جلد سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن زندگی نے ہمیں زیادہ وقت نہیں دیا۔ اس لیے انجمن میرے لیے صرف ایک فلم نہیں، راہی صاحب کے ساتھ کام کرنے کی وہ ایک یاد بھی ہے جو اپنے اندر ایک پورا تخلیقی زمانہ محفوظ کیے ہوئی ہے۔

ن د: علی گڑھ سے بمبئی تک راہی صاحب کا سفر ایک بڑے تخلیقی اور تہذیبی سفر کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ آپ نے ان کے اندر اس تبدیلی کو کیسے محسوس کیا؟ کیا بمبئی نے راہی کو بدلا یا راہی نے بمبئی کی دنیا کو اپنی شخصیت اور انداز کے مطابق قبول کیا؟

م ع: نہیں! مجھے نہیں لگتا کہ ممبئی نے راہی صاحب کو بدلا۔ علی گڑھ میں ہم بھی جس دور میں تھے، وہاں ہم سب کچھ سیکھ رہے تھے۔ شاید علی گڑھ کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ آپ کو سکھانے کے بعد خود ہی آپ کا ٹکٹ کاٹ دیتا ہے کہ اب جاؤ، کسی دوسرے شہر اور کسی دوسری دنیا میں اپنے لیے جگہ بناؤ، اپنا کماؤ اور کھاؤ! راہی صاحب کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ وہ علی گڑھ کو چھوڑ کر بمبئی چلے گئے۔ ہم یہ فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھے کہ علی گڑھ میں لوگ کس طرح رہتے ہیں یا وہاں سے نکلنے کے بعد انسان میں کیا تبدیلی آتی ہے، ہم خود بھی اسی سفر کا حصہ تھے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ بمبئی ان کے لیے ایک نسبتاً کٹھور اور مشکل شہر ثابت ہوا، مگر راہی صاحب نے اس شہر کو اپنے انداز میں نبھایا۔ انھوں نے لکھا بھی ہے۔

ہر گلی ہجر کی اک گلی بمبئی شہر میں
درد کے راستے ہیں کئی بمبئی شہر میں
ہر پڑوسی کوئی اجنبی بمبئی شہر میں
کیسے زندہ رہے آدمی بمبئی شہر میں

مگر وہ ممبئی میں بھی اپنی شرطوں پر جیے۔ ظاہر ہے، وہ لطف کہاں جو اپنے شہر میں رکشے پر بیٹھ کر گھومنے میں ہوتا ہے، لیکن راہی صاحب نے ممبئی میں بھی اپنی ادا نہیں چھوڑی۔ وہ شطرنج کھیلتے ہوئے، پان کھاتے ہوئے اور اپنی مخصوص بے فکری کے ساتھ اس شہر کا حصہ بنے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ انھیں وہاں اچھے مواقع ملے اور پروڈیوسرز کے ساتھ ان کے خوشگوار تعلقات قائم ہوگئے تھے۔ فلمی دنیا میں ان کی بڑی عزت تھی۔ اسٹوڈیو ہو، ڈبنگ ہو یا کوئی اور جگہ، لوگ انھیں پہچانتے تھے۔ اس میدان میں راہی صاحب کا ایک الگ مرتبہ اور اپنی ایک الگ شناخت بن گئی تھی۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ممبئی نے راہی کو اپنے رنگ میں نہیں ڈھالا، راہی نے ممبئی کی دنیا میں رہتے ہوئے بھی اپنی شخصیت اور اپنی ادا کو برقرار رکھا۔

ن د: راہی معصوم رضا کی تحریروں میں عام آدمی کے دکھ، محرومی اور عزت نفس کے ساتھ ایک گہری انسان دوستی نظر آتی ہے۔ آپ کے خیال میں اس حساسیت کے پیچھے ان کے ذاتی تجربات اور اجنبی شہر میں زندگی گزارنے کا تجربہ کس حد تک کارفرما تھا؟

م ع: ایک مرتبہ جب ہم بھی ممبئی گئے تو ہمیں بھی وہی اجنبیت اور تنہائی کا احساس ہوا جو شاید راہی صاحب نے وہاں پہنچ کر محسوس کیا ہوگا۔ جیسے کہ

سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے

ممبئی جیسے شہر میں پہنچ کر آدمی صرف ایک نئی جگہ میں داخل نہیں ہوتا بلکہ اپنے مانوس ماحول، اپنی تہذیب اور اپنے لوگوں سے بھی ایک فاصلے میں آجاتا ہے۔ ہم نے ساری دنیا دیکھی، لیکن اجنبی شہر کی وہ کیفیت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ اسی احساس کو راہی نے بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

اجنبی شہر کے اجنبی راستے، میری تنہائی پر مسکراتے رہے
میں بہت دور تک یوں ہی چلتا رہا تم بہت دیر تک یاد آتے رہے

میرے خیال میں اس طرح کے تجربات انسان کے اندر ایک خاص قسم کی حساسیت پیدا کرتے ہیں۔ علی گڑھ سے کوئی شخص اکھڑ کر ممبئی پہنچے، یا لکھنؤ جیسے اپنے مانوس تہذیبی ماحول سے نکل کر ایسے شہر میں آئے، تو ان احساسات کا شدت سے پیدا ہونا فطری ہے۔ اپنے لوگ، اپنی زبان، اپنی گلیوں اور اپنے ماحول سے دوری انسان کو دوسروں کے دکھ اور تنہائی کو زیادہ گہرائی سے محسوس کرنا سکھاتی ہے۔ راہی صاحب کی تحریروں میں عام آدمی کے دکھ، محرومی اور اس کی عزت نفس کے حوالے سے جو حساسیت نظر آتی ہے، اس میں میرے خیال میں ایسے ذاتی تجربات کی ایک اہم جگہ ضرور تھی۔ وہ اجنبی شہر کی تنہائی کو صرف دیکھنے والے نہیں تھے، اسے جینے والے بھی تھے۔

ن د: راہی صاحب کے تہذیبی شعور میں ان کے خاندانی پس منظر اور ذاتی ماحول کی کیا اہمیت تھی؟ ان کے یہاں رشتوں کو دیکھنے کا انداز کس نوعیت کا تھا؟

م ع: دیکھیے! ذاتی ماحول میں تو راہی صاحب کی زندگی میں کئی اتار چڑھاؤ رہے، لیکن ان کے آس پاس کا ماحول اپنی جگہ بہت تہذیب یافتہ اور کشادہ تھا۔ ان کے خاندانی اور ذاتی تعلقات میں بھی ایک ایسی بے تکلفی تھی جس میں رشتوں کی ظاہری حدیں زیادہ اہم نہیں رہتی تھیں۔

مثلاً نیر آپا سے ان کی شادی ہوئی تھی۔ نیر آپا کی پہلے بھی شادی ہو چکی تھی اور ان کے پہلے شوہر کے بیٹے ندیم تھے، جن کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ راہی صاحب ندیم کو بھی اپنے بیٹے کی طرح سمجھتے تھے۔ ان کے ساتھ ہمارا بھی خاندانی تعلق تھا وہ ہمارے چچا، یعنی پھوپھا کے بھائی لگتے تھے۔ یہ سب رشتے اپنی اپنی جگہ موجود تھے، لیکن راہی صاحب کے یہاں ان رشتوں کو کسی پیچیدگی یا فاصلے کے ساتھ دیکھنے کا انداز نہیں تھا۔

وہ بڑے تہذیب یافتہ لوگ تھے اور شاید ان کی تہذیب کی سب سے خوبصورت بات یہی تھی کہ انھیں اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ کون کیا ہے اور کون کیا نہیں ہے۔ وہ رشتوں کو ان کے ظاہری خانوں میں تقسیم کر کے نہیں دیکھتے تھے۔ یہی کشادگی ان کے ذاتی ماحول میں بھی تھی اور یہی چیز رفتہ رفتہ ان کے تہذیبی شعور کا حصہ بنتی گئی۔

میرے خیال میں راہی صاحب کی گنگا جمنی تہذیب کا ایک بڑا حوالہ یہی انسانی کشادگی تھی، جہاں مختلف شناختیں ایک دوسرے سے الجھتی نہیں تھیں بلکہ ایک دوسرے میں گھل مل کر زندگی کا حصہ بن جاتی تھیں۔

ن د: راہی صاحب کی زندگی میں محبت اور انسانی تعلقات کا پہلو بھی نمایاں تھا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان کے ذاتی جذبات اور رومانیت نے ان کی تخلیقی شخصیت کو بھی متاثر کیا؟

م ع: نہیں! مجھے لگتا ہے کہ راہی صاحب کی زندگی کافی کھلی ہوئی تھی۔ کوئی ایسی پیچیدہ زندگی نہیں تھی ان کی۔ بس یہی تھا کہ وہ تھوڑے Romantic nature کے تھے۔ لوگ ان پر عاشق ہو جاتے تھے، وہ لوگوں پر عاشق ہو جاتے تھے۔ یہ ان کی شخصیت کا ایک پہلو تھا، ان کے مزاج میں ایک طرح کی رومانیت تھی۔ لیکن میں اسے ان کی زندگی کی کوئی ایسی پیچیدگی نہیں سمجھتا جسے داخلی کشمکش کہا جائے۔

دیکھیے! ہم لوگ اسے معیوب سمجھتے ہیں، لیکن ایک آرٹسٹ کے لیے معاملہ کچھ اور ہوتا ہے۔ ایک آرٹسٹ

جو ہوتا ہے، وہ اسے Inspiration سمجھتا ہے۔ لوگوں سے ملنا، ان کی طرف متوجہ ہونا، کسی سے متاثر ہونا یا خود کسی کی طرف کھنچ جانا یہ سب ایک آرٹسٹ کے لیے اس کے تجربے کا حصہ ہوتا ہے۔

راہی صاحب بھی ایک آرٹسٹ تھے، اس لیے وہ انسانی تعلقات اور جذبات کو اسی نظر سے دیکھتے تھے۔ میرے خیال میں ان کی زندگی کی یہ رومانیت ان کی تخلیقی شخصیت کے لیے ایک Inspiration تھی، نہ کہ کوئی ایسی Complex کیفیت جسے ہم داخلی کشمکش کہیں۔

وہ جس طرح زندگی کو دیکھتے اور محسوس کرتے تھے، اسی کھلے پن کے ساتھ اسے جیتے بھی تھے۔ ان کے اندر زندگی کے تجربات کو قبول کرنے کی ایک آزادی تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں بھی انسانی جذبات کسی مصنوعی ترتیب کے ساتھ نہیں آتے، بلکہ زندگی کی طرح اپنی تمام تر پیچیدگی اور سادگی کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔

ن ر: راہی صاحب کی تخلیقات میں عورت مختلف انسانی اور علامتی صورتوں میں سامنے آتی ہے۔ آپ ان کی اس نسائی حسیت یا عورت کو دیکھنے کے منفرد انداز کو کس طرح بیان کریں گے؟

م ع: یہ بہت امپورٹنٹ سوال کیا آپ نے، خاص طور پر اس دور کے لوگوں کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو راہی ہوں یا کیفی اعظمی، ان لوگوں میں یہ چیز بہت زیادہ ملتی ہے۔ دیکھیے! راہی صاحب کی خاص بات یہ تھی کہ انھوں نے ہر چیز کو ایک Feminine gender دے دیا۔ ان کے یہاں عورت صرف ایک کردار نہیں رہتی بلکہ وہ ایک تصور، ایک احساس اور ایک پوری کیفیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

مثلاً 1857 کی جو لڑائی تھی، اس میں ملک بھی ایک عورت بن جاتا ہے، گومتی بھی ایک عورت بن جاتی ہے۔ یہ معمولی بات نہیں ہے۔ وہ چیزوں کو محض ان کی ظاہری شکل میں نہیں دیکھتے تھے بلکہ ان کے اندر ایک انسانی اور جذباتی وجود تلاش کرتے تھے۔ اسی لیے ان کے یہاں عورت محض کہانی کا ایک کردار نہیں رہتی بلکہ بعض اوقات ایک علامت، ایک احساس یا ایک پورے تہذیبی تصور کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

میرے خیال میں یہ راہی صاحب کی تخلیقی حسیت کا ایک اہم پہلو تھا۔ وہ اپنے گرد و پیش کی دنیا کو صرف واقعات اور کرداروں کے طور پر نہیں دیکھتے تھے، اس کے اندر موجود جذبات اور کیفیتوں کو بھی محسوس کرتے تھے۔ شاید اسی لیے ان کی تخلیقات میں عورت اور اس سے وابستہ تجربات کے کئی مختلف معنی سامنے آتے ہیں۔

یہ Feminine sensibility ان کے یہاں صرف عورت تک محدود نہیں رہتی، وہ پورے ماحول اور بعض اوقات پوری تاریخ کو ایک انسانی اور جذباتی پیکر میں دیکھنے لگتے ہیں۔ یہی چیز ان کے فن کو ایک الگ شناخت عطا کرتی ہے۔

ن ر: راہی صاحب کے ساتھ آپ کی بے تکلف رفاقت میں گفتگو کا انداز کیسا ہوتا تھا؟ کیا وہ اپنی گہری فکری شخصیت کا اظہار گفتگو میں بھی اسی طرح کرتے تھے؟

م ع: ایک طریقے سے دیکھا جائے تو ہماری گفتگو میں کوئی بہت گہری یا فلسفیانہ باتیں نہیں ہوا کرتی تھیں۔ بالکل بچپنے والی باتیں ہوتی تھیں، بالکل سادہ باتیں۔ یہ راہی صاحب کی شخصیت کا ایک عجیب اور خوبصورت پہلو تھا کہ وہ بظاہر بہت گہرے آدمی لگتے تھے لیکن ان کی باتیں بہت سادہ ہوا کرتی تھیں۔

وہ زندگی کی معمولی سے معمولی بات کو بھی اسی بے تکلفی سے بیان کرتے جیسے اس میں کوئی خاص فلسفہ تلاش کرنا مقصود ہی نہ ہو۔ شاید یہی سادگی ان کی گہرائی کا ایک حصہ تھی۔ بعض لوگ اپنی گہرائی کو اپنی گفتگو پر طاری کر دیتے ہیں لیکن راہی صاحب کے یہاں ایسا نہیں تھا۔ وہ بہت گہرے آدمی تھے مگر ان کی گفتگو پر گہرائی کا بوجھ نہیں تھا۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر ایسا محسوس نہیں ہوتا تھا کہ کوئی بڑا ادیب یا فلسفی آپ سے کوئی بڑی بات کہہ رہا ہے بلکہ یوں لگتا تھا جیسے کوئی اپنا بہت قریبی زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں آپ کے ساتھ بانٹ رہا ہے۔ ان کی شخصیت میں ایک بے ساختگی تھی جو گفتگو کو کبھی بوجھل نہیں ہونے دیتی تھی۔

شاید انسان کی اصل گہرائی بھی یہی ہے کہ وہ زندگی کو پیچیدہ بنائے بغیر اس کی سادگی کو محسوس کر سکے۔ راہی صاحب کی شخصیت میں یہ سادگی اور گہرائی ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ یہی تضاد یا امتزاج ان کی گفتگو کو بھی دلچسپ بناتا تھا اور شاید اسی لیے ان کے ساتھ گزارا ہوا معمولی وقت بھی بعد میں ایک یاد کی صورت میں باقی رہ جاتا تھا۔

ن ر: آج کی نسل کے لیے راہی معصوم رضا کی معنویت کیا ہے؟ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے فن میں اپنے عہد سے آگے کے زمانے کو محسوس کرنے کی کوئی صلاحیت موجود تھی؟

م ع: دیکھیے! راہی جو تھے، ایک جدید آدمی تھے۔ بلکہ جدید ہی نہیں، وہ اس سے بھی آگے، وقت سے آگے کے آدمی تھے۔ اس لیے راہی نے جو لکھا، جو محسوس کیا، وہ بہت حد تک وقت سے آگے کی بات تھی۔ یہی ان کی خاص بات ہے۔ اگر آپ ان کی شاعری پڑھیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ محض اپنے عہد کی ترجمانی نہیں کر رہے ہیں بلکہ آنے والے زمانے کی آہٹوں کو بھی محسوس کر رہے ہیں اور اپنے کلام میں مستقبل کی جھلک پیش کر رہے ہیں۔ ان کی شاعری میں کل کا گمان ہوتا ہے جیسے وہ آج میں کھڑے ہو کر کل کو دیکھ رہے ہوں۔ ان کی ایک نظم ہے۔

وقت ہے نا آشنا نامہرباں اس شہر میں
بند رکھیے اپنے زخموں کی زباں اس شہر میں
ہر دریچہ مضمحل دروازے ہیں کمھلائے ہوئے
آج کی آنکھوں میں ہے کل کا دھواں اس شہر میں

یعنی وہ آج، کل اور آنے والے کل کو ایک ہی سانس میں دیکھتے ہیں۔ میرے خیال میں یہی راہی صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت تھی کہ ان کی نظر اپنے وقت تک محدود نہیں تھی۔ ان کے اندر آنے والے وقت کو محسوس کرنے کی ایک عجیب صلاحیت تھی۔

آخر میں میں بس اتنا کہوں گا کہ راہی صاحب کی چیزیں مجھے آج بھی بہت یاد ہیں۔ میں نے ان کے کام کو بہت قریب سے محسوس کیا ہے اور اپنی فلموں میں بھی ان کے کام اور ان کی فکر کو یاد کیا ہے۔ ان سے جو کچھ ملا، اسے اپنی بساط کے مطابق اپنے فن میں برتنے کی کوشش کی۔ راہی صاحب جیسے بڑے تخلیق کار کے ساتھ جڑنا اور ان کے کام کو اپنے سفر کا حصہ بنا پانا میرے لیے خود ایک اعزاز ہے۔ ان سے وابستہ ہونا ہی میرے لیے ایک بڑی نسبت ہے۔

ن ر: بہت بہت شکریہ سر! آپ نے اپنا قیمتی وقت دیا اور راہی صاحب سے جڑی اپنی یادیں، مشاہدات اور تجربات ہمارے ساتھ شیئر کیے۔ آپ سے ہونے والی یہ گفتگو ہمارے لیے نہایت قیمتی اور یادگار رہی۔ دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں۔

■

Neha
(Neha Rubab)
Assistant Editor, NCPUL
New Delhi- 110025
Mob.: 7985966630

شافع قدوائی

نوآبادیاتی مزاحمت کا شعری استعارہ

راہی کا رزمیہ 1857

رزمیہ شاعری محض کسی تاریخی، تہذیبی اور دیومالائی قصوں کو ایک فنی تجربہ کے طور پر پیش نہیں کرتی بلکہ یہ انسان کی اجتماعی اور لاشعوری یادداشت میں موجود تاریخ اور اساطیری روایات کو ایک زندہ اور متحرک واردات کی صورت میں پیش کرتی ہے۔ یہ ایک ایسی شعری صنف ہے جہاں معلوم شدہ حقائق، دستاویزی شواہد اور انسانوں کے حافظہ میں ثبت اسطور اور واقعات کے مابین تفریق ختم ہو جاتی ہے۔ شعری سطح پر تاریخ اور حکایت انسان کی تہذیبی اور آرزومندیوں کی تکمیل کا مرکزی حوالہ ہو جاتی ہے۔ رزمیہ شاعری زمانہ قدیم سے مختلف تہذیبوں میں مقبول رہی ہے اور میسوپوٹیمیا میں 8 صدی قبل مسیح لکھی جانے والی نظم The Epic of Gilgamesh دنیا کا قدیم ترین رزمیہ ہے۔ پشکن کی نظم Poltava جو 1709 میں پیٹر گریٹ کی سویڈن پر فتح پر مبنی مشہور رزمیہ ہے جو 1829 میں شائع ہوئی۔

مذہبی اور اساطیری طویل رزمیہ نظموں سے قطع نظر دنیا کے مختلف ملکوں میں تاریخی رزمیے بھی لکھے گئے جن کا منشا اصل تاریخی تنازعات، سیاسی جنگوں اور ملکوں کو محکوم بنانے والی مہموں کو تعبیر وتشریح اور عوامی حافظہ میں زندہ رہنے والی روایات سے ہم آہنگ کر کے ان کی ایک اجتماعی تہذیبی وقوعے کے طور پر صورت گری کرنا ہوتا ہے۔ کسی ملک میں ہونے والی اقتدار کی کشاکش اور پھر لبرل نقطہ نظر کی فتح کی شعری تجسیم کی سب سے بہتر مثال ولیم ورڈز ورتھ کی طویل نظم The Prelude or Growth of a poet's mind کی ہے جو انقلاب فرانس کی جدوجہد کے چشم دید مشاہدہ پر مبنی ہے۔ ورڈز ورتھ 1791–1792 کے دوران فرانس میں اقامت گزیں رہے اور ان کی یہ نظم ایک نوع کی منظوم آپ بیتی ہے۔ یہ نظم کتابی شکل میں ورڈز ورتھ کے انتقال کے بعد 1850 میں شائع ہوئی۔ مگر اس سے قبل یہ نظم کولرج کے رسالہ The Friend میں 1809 میں The French Revolution as it appeared to Enthusiast at its commencement کے نام سے شائع ہوئی تھی۔

20ویں صدی میں والٹ وہٹ نے مین امریکی خانہ جنگی پر نظمیں لکھیں اور ڈیرک والکاٹ Derek Walcott کی نظم Omeros نوآبادیات، جنگ، بے دخلی، ہجرت سے متعلق جانگسل احساسات کا ایک مرتعش رویا خلق کرتی ہے۔

برصغیر میں 1857 نوآبادیاتی تسلط کے خلاف ایک اجتماعی تجربے پر ابھرا اور ہندوستانیوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے والی حکومت کے خلاف خون آشام مزاحمت نے برطانوی سامراج کو متزلزل کر دیا تھا۔ عزت نفس اور غلامی کے خلاف لڑائی شمالی ہند کے ایک حصے میں لڑی گئی اور سپاہیوں کی بغاوت نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہندوستانیوں کو عارضی طور پر کئی مقامات پر فتح بھی حاصل ہوئی مگر آخر کار حکومت برطانیہ ہی فتح یاب ہوئی۔ مورخوں کے علاوہ عالموں، مفکروں، ادیبوں اور شاعروں نے بھی اس انقلاب آفریں عوامی جدوجہد کو اپنی تخلیقی تگ وتاز کا ہدف بنایا۔

اردو کی دو نامور اور سرکردہ شخصیتوں نے جو 1857 کے چشم دید گواہ بھی تھے، اپنے مشاہدات نثر میں بیان کیے۔ غالب نے دہلی میں شورش کے نقطہ آغاز 11 مئی 1857 سے لے کر یکم اگست 1858 تک پڑنے والے رن اور عوام پر مظالم کی خونچکاں داستان اپنے روزنامچے ''دستنبو'' میں خاصے جذباتی خروش کے ساتھ مشکل فارسی میں رقم کی ہے۔ غالب کی اس نثری تحریر سے حکومت برطانیہ کی غیر مشروط حمایت اور ہندوستانی عوام کے تئیں گہری نفرت اور بےزاری کا گہرا احساس ہوتا ہے۔

سرسید ہندوستان کے پہلے ایسے ادیب اور عوامی دانشور ہیں جنھوں نے اس موضوع پر چار متون تیار کیے۔ سرسید 1857 کے واقعات کے نہ صرف عینی شاہد تھے بلکہ انھوں نے حکومتِ برطانیہ کے ایک اہلکار کے طور پر اس میں اپنا رول بھی ادا کیا تھا۔ بغاوت کے آغاز کے وقت وہ بجنور میں تعینات تھے اور انھیں ضلع کی ذمہ داری سپرد کر کے انگریز حکام چلے گئے تھے۔ ان کی چار کتابیں ''رسالہ تاریخ سرکشی بجنور'' (1858)، مضمون ''کیا سبب ہوا سرکشی ہند کا جواب'' المعروف بہ ''اسباب بغاوتِ ہند'' (1858)، رسالہ ''خیر خواہان مسلمانان ہند'' (تین شمارے 1860 اور 1861) اور 1857 کے واقعات سے متعلق برطانوی سول سرونٹ اور ہندوستانی امور کے سکریٹری جان ولیم کے (Sir John William Kaye 1814-1876) کے نام تفصیلی خط (مورخہ 12 دسمبر 1869) ہے۔

برصغیر کی نوآبادیاتی تاریخ میں 1857 کو مرکزی اہمیت حاصل ہے کہ اس برس پورے شمالی ہند اور مشرقی ہند کو خاک وخون کے طوفان سے گزرنا پڑا تھا اور برطانوی جبر واستبداد نے ظلم کی نئی اور خونچکاں داستان رقم کی تھی مگر بعض استثنائی مثالوں سے قطع نظر ہندوستانی ادبیات میں ان لرزہ خیز واقعات پر مبنی کسی ایسے متن کا سراغ نہیں ملتا جو اس عدیم المثال تجربے کے ناقابل فراموش نقوش کو تخلیقی دبازت کے ساتھ اجاگر کرتا ہو اور جسے والٹیرؔ کے

رزمیہ The Henriade (1723) کے ہم پلہ قرار دیا جا سکے۔ 1857 میں دہلی کا محاصرہ کئی دنوں تک جاری رہا اور فصیل بند شہر کے باشندوں کو عدیم المثال صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس طرح کی صورتحال فرانس میں ہنری چہارم کے دور میں پیش آئی تھی۔ جب 1723 میں پیرس کا محاصرہ کر لیا گیا تھا اور پھر ہنری چہارم نے مذہبی جنگوں کے خاتمے میں بہت اہم رول ادا کیا تھا اور روشن خیالی کی جیت ہوئی تھی۔ ہندوستان کے ادیبوں نے 1857 کے اس عظیم تجربے کو بڑی حد تک ضائع کر دیا۔ اردو کے بعض شعرا نے ان واقعات سے متاثر ہو کر مفرد اشعار کہے اس ضمن میں بہادر شاہ ظفر کی متعدد غزلوں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے مگر اس انقلاب آفریں واقعہ پر تفصیلی نظم سے اردو شاعری کا دامن تہی ہے۔

بنگالی کے مشہور شاعر اور وکیل ہیم چندر بندھو پادھیائے (1903–1838) نے 13 سال بعد یعنی 1870 میں ایک نظم ''بھارت سنگیت'' لکھی تھی جس میں جارحانہ قوم پرستی کی ترویج کی گئی تھی۔ نوآبادیاتی نظام کے خلاف شعری مزاحمت کی یہ غالباً پہلی کاوش تھی جس کی گونج پورے بنگال میں سنائی دی تھی اور یہ نظم اس زمانے کے سیاسی ڈسکورس کے ایک اہم متن کے طور پر ابھری تھی۔ مراٹھی پنڈت وشنو بھٹ گوڈسے نے 1883 میں اپنے وسطی اور شمالی ہندوستان کے سفر 58-1857 کی روداد لکھی اور ان کا یہ سفرنامہ 1857 کے واقعات کی بازآفرینی کرتا ہے۔ ہندی کی مشہور شاعرہ سبھدرا کماری چوہان (1948–1904) نے ''مکل'' میں رانی لکشمی بائی کی مزاحمت پر ''جھانسی کی رانی'' پر ایک منظوم ڈرامہ ''جھانسی کی رانی'' لکھا (بحوالہ مجموعہ کلام مکل، 1930) جو ہندوستان میں جنگِ آزادی کا اساسی متن بن گیا اور اسے لاتعداد بار اسٹیج کیا گیا اور اسکولوں کے نصاب کا حصہ بھی بنا۔ اس کا یہ مصرعہ تو زبان زد عام ہے۔

''خوب لڑی مردانی وہ تو جھانسی والی رانی تھی''

سبھدرا کماری چوہان کی زبان زد نظم میں پدر اساس معاشرہ کے نظریات کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ لڑنا بمعنی بہادری انسانی صفت ہے، اس کا تعلق مرد یا عورت سے نہیں، مگر اسے صرف مرد کی صفت ٹھہرانا ''خوب لڑی مردانی''، محل نظر ہے۔

اردو میں 1857 کو ایک کثیر حسی رزمیہ کا موضوع بنانے کا سہرا راہی معصوم رضا کے سر بندھتا ہے گو کہ ان کی اصل شہرت ان کے ناولوں علی الخصوص ''آدھا گاؤں'' اور مہابھارت کے اسکرپٹ رائٹر کے طور پر قائم ہے۔

راہی معصوم رضا نے ملکی، شخصی، عزت نفس، اخلاقی نقطہ نظر اور اسطوری رسومیات کے باہمی ادغام سے انقلاب اولین کی واقعاتی تعبیر و تشریح اور قارئین سے جذباتی مدارات کا اہتمام نہیں کیا بلکہ غلامی اور آزادی کی ازلی کشاکش اور انسانی نی عظمت کی سربلندی کے جہد کو ایک لازمی جہت عطا کرنے کے لیے طویل نظم ''1857'' لکھی۔ یہ نظم ہندوستان کے اولین جنگِ آزادی کے تقریباً سو سال بعد سپرد قلم کی گئی۔ راہی کے مطابق 1857 غیر منظم بغاوت یا سپاہیوں کی حکم عدولی نہیں بلکہ غیر ملکی تسلط کے خلاف عوامی بغاوت تھی جس کی ابتدا ضرور سپاہیوں کی بغاوت سے ہوئی تھی۔ راہی معصوم رضا کی نظم ایک نئے شعری بیانیہ کی تشکیل کرتی ہے جو ہندوستان کے عوام کی اجتماعی مزاحمت کی تخلیقی جہت کو آشکارا کرتی ہے۔ راہی معصوم رضا کے مطابق اس نظم کی ابتدا پہلی ا 22 جنوری 1955 کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مزمل ہوسٹل کے وارڈن روم سے ہوئی اور یہ 10 جولائی 1959 کو پایۂ تکمیل تک پہنچی۔ 292 صفحات پر مشتمل اور 1857 مختلف بحور میں پابند اور آزاد نظم کی ہیئتوں پر مشتمل یہ نظم 1960 میں نیا کتاب گھر علی گڑھ اور فردوس پبلیکیشن الٰہ آباد سے شائع ہوئی۔ راہی معصوم رضا نے ''1857'' کی تاریخ رقم نہیں کی بلکہ اس کے حسیاتی سطح پر اثرات کو واضح کیا ہے اور انھوں نے نظم کی غایت کو واضح کرتے ہوئے لکھا:

''یہ کوئی تاریخ کی کتاب نہیں، یہ ایک طویل نظم ہے اور اس کے کئی کردار ہیں جن کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں ہے وہ شاعر کی تخلیق ہیں اس کتاب سے تاریخی صحت کا مطالبہ نہ کیجیے۔ میرا موضوع تاریخ نہیں، صرف تاریخ شعر کا موضوع نہیں بن سکتی۔''[1]

راہی شاعری کو تاریخ کے طور پر پڑھنے کی روش کے قائل نہیں تھے اور ان کا یہ خیال درست تھا کہ شاعر زندگی کا نقل نویس نہیں ہوتا اور نہ ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ تخلیق کار ہر خارجی واقعہ کو اپنے موضوعی تجربے کی تابناکی سے روشن تر کر دیتا ہے اور واقعہ کی ایک ایسی جہت سامنے آتی ہے جس سے لوگ واقف نہیں ہوتے۔ راہی نے درست لکھا کہ ''شاعر نقال نہیں ہوتا، وہ خالق ہوتا ہے اور وہ ناقد ہوتا ہے جو اپنے رد و قبول سے قدر و قیمت کا تعین کرتا ہے۔''[2]

راہی نے اپنی طویل نظم کے مقدمے میں 1857 کے واقعات اور ان کے وسیع تر مضمرات، تاریخ اور شعر کے باہمی ربط، معرکہ حق و باطل میں شکست و فتح کی نوعیت اور انسان کی جدوجہد پر تفصیلی اظہار خیال کیا ہے۔ راہی کی نثر پر خطابت کے اثرات واضح ہیں۔ انھوں نے لڑائی اور جنگ کے مابین فرق کو خاطر نشان کرتے ہوئے لکھا کہ لڑائی ہارنے کا مطلب جنگ میں شکست سے دوچار ہونا نہیں ہے۔ لڑائی سے مراد جدوجہد اور سعی پیہم ہے اور راہی کا یہ قول کہ ''میں کہنا چاہتا ہوں کہ انسانوں کی جیت ہوئی ہے اور ان کی جیت ہمیشہ ہوگی'' بھی ان کے رجائی اور رومانی نظریہ حیات کی چغلی کھاتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ ''1857 اس نظم کا موضوع نہیں، اس کا موضوع کوئی سنہ نہیں ہے، اس کا موضوع انسان ہے جو کبھی نہیں ہارتا۔'' یہ بات صحیح ہونے کے باوجود Rhetorical Flourish سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ انسان کے نہ ہارنے پر یقین یقیناً کسی خارجی واقعہ کی تصدیق کا متقاضی ہوتا ہے، لہٰذا اس نوع کے تجریدی بیان سے نظم کی شعری قدر و قیمت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

راہی کے مطابق یہ نظم ان کے ذاتی تجربات کے تخلیقی اظہار سے عبارت ہے، اور اس کا تعلق کتابی علم سے نہیں ہے۔ 1857 کے خالق نے لکھا ہے کہ ''میں نے یہ نظم چند کتابوں کی مدد سے اپنے کمرہ میں بیٹھ کر نہیں لکھی ہے میں نے اس لڑائی میں شرکت کی ہے، میں نے زخم کھائے ہیں، میں نے زخم لگائے ہیں''[3]

لڑائی میں ذاتی سطح پر شرکت محض زور بیان یا خطیبانہ حربہ نہیں بلکہ یہ باور کراتا ہے کہ شاعر نے واقعات کو اپنے حواس پر ایک زندہ تجربے کے طور پر قبول کرنے اور اپنے شعری پیکر کی صورت میں منقلب کرنے کی سعی کی ہے۔

شاعر کے نزدیک پہلی جنگِ آزادی دراصل بہار کی جدوجہد کا استعارہ ہے جس میں تحیر زائی کا وافر سامان موجود ہے۔ 1857 کی دلدوز داستان صرف تشدد، ظلم اور خاک و خون سے عبارت نہیں بلکہ اس میں ہندو مسلم اور ہندوستانی زبانوں اور فنون لطیفہ کے باہمی ارتباط کے ایسے قصے موجود ہیں جن پر حیرت کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔

کچھ اس طرح ہوں بیاں داستان جہد بہار
ہر ایک حلقہ زنجیر دیکھتا رہ جائے

ہر ایک روزن در کی پلک جھپکنے لگے
ہر ایک قفل کا حیرت سے منہ کھلا رہ جائے [4]

یہ اشعار نظم کے سرنامے کے طور پر شامل ہیں۔ حلقہ زنجیر سے مراد ہندوستان کے عام انسان ہیں جو انگریزوں کے زیرِنگیں ہیں اور وہ زندگی کی آزمائشوں اور کشاکش سے واقف نہیں ہیں۔ آزادی کی جستجو دراصل ''بہار'' کے مترادف ہے۔ جس کا ہر شخص متمنی ہے۔ جہد بہار کا اصل مقصد حلقہ زنجیر، دیوار زندان اور قفل کو شکست کرنا ہے بظاہر یہ عمل ناممکن محسوس ہوتا ہے اور اس کی ادنیٰ سی مثال بھی حیرت کے داعیوں کو متحرک کرتی ہے۔

نظم کا آغاز واحد متکلم کے مشاہدات اور محسوسات کے بیان سے ہوتا ہے۔ نظم کا راوی سڑک پر نکلتا ہے تو اسے ہر سو قتل و غارت کے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں اور آزادی کے متوالوں کی درخت سے جھولتی لاشیں نظر آتی ہیں اور اسے زندگی اور مقتل میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ نظم کے ابتدائی حصے کا عنوان یہ آدمی کی گزرگاہ ہے اور پہلے بند میں وطن عزیز کی آزادی کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے والوں کا عمداً نام نہیں لیا گیا ہے اور کلمہ استفسار ''کون'' سے تاثر کو دو چند کیا گیا ہے۔

یہ راستے پہ ہیں مصلوب کون لوگ آخر
یہ راستہ ہے کہ ویرانیوں کا جنگل ہے
سڑک کے دونوں طرف یہ درخت لاشوں کے
یہ زندگی کی گزرگاہ ہے کہ مقتل ہے [5]

راہی معصوم رضا کی نظم فنی تراش خراش کے لحاظ سے منفرد اور ان کی تخلیقی تازہ کاری کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ ہندوستان میں رہنے والے اور مختلف مذاہب پر کاربند عوام میں اتحاد اور موانست کا ذکر عام طور پر کیا جاتا ہے مگر ذہن انسانی کے سب سے طاقتور وسیلے ''زبان'' اور فنونِ لطیفہ کی وساطت سے جنگ آزادی کی اشاعت و ترویج کے ذکر سے اردو شاعری کے صفحات عام طور پر عاری ہیں۔

مذہبی رواداری سے قطع نظر راہی نے پہلی جنگِ آزادی میں دانشورانہ اتحاد کی نئی مثالیں تلاش کیں۔ بھوجپوری، اودھی، کھڑی بولی اور بھاشا کس طرح اقتدار کے خلاف ایک نیا اظہاری میڈیم وضع کر رہی ہیں، راہی نے اس کی نشاندہی کی کوشش کی ہے اور جنگ آزادی میں ان بولیوں کے Contribution کا اعتراف کرنے کے لیے راہی نے ان بولیوں کا بیک وقت ذکر کیا۔

بھوجپوری بھی دیکھ رہی تھی دور تک رستہ
اودھی کے ہر چار طرف بھی تھا گہرا سناٹا
ایک اُپی تلوار بنی بیٹھی تھی میٹھی بھاشا
اور تاریخ بھی دیکھ رہی تھی رنگ کھڑی بولی کا [6]

مختلف مذاہب کے پیروکاروں کا ذکر یہاں نہیں ہے بلکہ انسانی فطرت کی سب سے مظہر زبان اور بولی کو باہمی اتحاد کا پیکر بنایا گیا ہے۔ اسی طرح فنون لطیفہ پر غلامی کے اثرات کس طرح مرتب ہوتے ہیں اس کا بیان دیکھیے۔

غم غم غم طبلہ بولا
سارے گاما پادھا نی سا
گھنگھرو نے یہ ٹھوکر کھائی
پاچھن چھن چھن شیشہ ٹوٹا [7]

راہی معصوم رضا کی نظم فنی تراش خراش کے لحاظ سے منفرد اور ان کی تخلیقی تازہ کاری کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ ہندوستان میں رہنے والے اور مختلف مذاہب پر کاربند عوام میں اتحاد اور موانست کا ذکر عام طور پر کیا جاتا ہے مگر ذہن انسانی کے سب سے طاقتور وسیلے "زبان" اور فنون لطیفہ کی وساطت سے جنگ آزادی کی اشاعت و ترویج کے ذکر سے اردو شاعری کے صفحات عام طور پر عاری ہیں۔

راہی معصوم رضا نے اس طویل نظم کو مختلف منظر ناموں میں تقسیم کیا ہے اور ہر منظر نامے کا ایک عنوان بھی قائم کیا ہے۔ ابتدا میں راوی دو رویہ درختوں سے آباد سڑک سے گزرتا ہے جہاں درختوں پر لاشیں لٹکی ہوئی ہیں اور اس منظر کو ''آدمی کی گزرگاہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے جو اصلاً مقتل ہے۔ آزادی اور عزت نفس پر اصرار کی قیمت اکثر انسان کو اپنی جان سے ادا کرنا پڑتی ہے، اس لحاظ سے انسانی تاریخ ایسے افراد کی سرکوبی اور ان پر شدید مظالم کی داستان سناتی ہے۔ اس طرح اقتدار کی پاسداری کرنے والی زندگی مقتل کی ایک صورت بن جاتی ہے۔ شاعر نے بغاوت کے اثرات کا ذکر ماں کی خود کلامی سے جو اپنے بچے کو لوری سنا رہی ہے، کے ذریعے کیا ہے۔ 1857 کی جنگ کس طرح ایک شدید قسم کا خانگی تجربہ میں منقلب ہوئی تھی، اس کے اظہار کا سب سے موثر وسیلہ ایک ایسی لوری ہے جو شمالی ہند علی الخصوص مشرقی یوپی اور بہار میں اب تک مقبول ہے۔

آجا ری ندیا تو آ کیوں نہ جا
را جا کو مورے سلا کیوں نہ جا
آتی ہوں بی بی آتی ہوں
را جا کو تورے سلاتی ہوں [8]

ہر منظر کے بعد ''کرانت کتھا'' کے عنوان سے ایک ٹکڑا شامل ہے جس میں داستان سنانے والا راوی سامعین کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

''سنو بھائیو، سنو بھائیو کتھا ستاون کی
کان کھول کر سنو کتھا ہے کرانت کے پہلے ساون کی''

ساون ہندوستان میں نشاط اور بہجت کا موسم ہوتا ہے اور آزادی کی پہلی لڑائی کو ساون سے تعبیر کرنا شاعر کی تخلیقی صلاحیت کو ظاہر کرتا ہے۔

نظم کا سب سے موثر حصہ منگل پانڈے کی قربانی اور پھر اس کا بیان ایک فوجی کی زبان سے ہے جو چھٹیوں میں اپنی بیوی سے ملنے آتا ہے۔ کتھا نامہ کا یہ جوان اپنی بزدلی پر اس قدر شرمسار ہے کہ وہ نہ تو بیوی سے آنکھیں ملا پاتا ہے اور نہ گاؤں والوں کا سامنا کر پاتا ہے۔ وہ بالکل چپ چاپ رہتا ہے اور سپاہی، بہت پوچھنے پر منگل پانڈے کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے۔

کام پتنگے کا ہے اپنے دیپک پر مر جانا
منگل پانڈے تھا ہم میں سب سے بڑا دیوانہ
ایسی ہوا تھی کہ بدھ کا کھیل ہی کھیل رہے تھے بچے
انتیس مارچ کو بیرک پور میں لڑ گئے منگل پانڈے [9]

کسی بلند تر مقصد کے لیے اپنی جان نچھاور کرنے والے تختہ دار پر چڑھتے ہوئے بھی شاداں و فرحاں اور نازاں ہوتے ہیں، نظم کا راوی کہتا ہے۔

اب تک یاد ہے پھانسی کے پھندے میں اینٹھن گردن کی
سنو بھائیو! سنو بھائیو! کتھا سن ستاون کی [10]

سپاہی خود پر لعنت بھیجتے ہوئے کہتا ہے۔

ہم تو خاک رہ وفا بھی بن گئے
آج منگل کا بول بالا ہے
سر سے اونچے اس کے تلوے بھی
تختہ دار پر ستاروں سے اونچا ہے''[11]

راہی معصوم رضا نے اپنی اس نظم میں بھوجپوری کے متعدد ٹکڑے اور اودھی کے متعدد محاوروں اور فقروں

کو شامل کر کے، اس نظم کو رنگا رنگ تہذیبی اور لسانی وحدت کے طور پر پیش کیا ہے۔ نظم کی انتہائی الم ناک صورت حال کو وقفہ وقفہ سے کم کرنے کے لیے شاعر نے رومانی طرز اظہار بھی اختیار کیا ہے مثلاً بھوجپوری میں ایک مرد کی خواہش کا اظہار دیکھیے۔

گوری سن کے ارجیا ہمار گگریا چھلکت بائے نا
گنڈ چھینک کے پٹھل بارن تو ہرے گھڑے کا موڑ
چلو پھر ہم ہوں پی لیں کا گگری تمھار
بدن وا چھلکت بائے نا
گوری سن کے ارجیا ہمار گگریا چھلکت بائے نا[12]

یہ غالباً اردو کی پہلی ایسی طویل نظم ہے جس میں بولیوں بھوجپوری، اودھی اور برج بھاشا کا تخلیقی طور پر تواتر کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔

نظم میں میرٹھ، دہلی، جھانسی، کانپور، لکھنؤ کے واقعات کا تاریخی اور دستاویزی بیانیہ بلکہ عوامی حافظہ میں محفوظ ان دلدوز واقعات کے اثرات کو مرتعش حسی منظروں کے توسط سے پیش کیا گیا ہے۔ انگریز کی حکومت کے روشن خیالی، ترقی اور انسان دوستی کے بیانیہ کو فنکارانہ شعور کے ساتھ شکست ہمہ جہت کی ترقی کی ضامن ریل، جس میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے لیے الگ الگ ڈبے ہیں، عدم مساوات اور نسلی تفریق کی گواہ بن کر ابھرتی ہے اور انگریزوں کے غیر انسانی رویے کو نشان زد کرتی ہے۔

یہ ریل کی پٹری ہے کہ دھامن کی جوڑی
چھو لیں جسے یہ سانپ وہ ہو جاتے ہیں کوڑھی
بھگوڑوں کو ڈسنے یہ تلے بیٹھے ہیں موذی
ان کے لیے انسان ہیں کس کھیت کی مولی[13]

میرٹھ سے اٹھنے والی عوامی بغاوت کی طرح پورے ملک عوام کی دھڑکن بن سکتی ہے، اس کی تفصیل درج ذیل ڈرامائی اشعار میں موجود ہے۔

کلکتہ سے پشاور تک ہوا اک موسم
یہاں نہ شور زیادہ ہے، نہ وہاں یہ ہے کچھ کم
ایک طرح کے زخم دلوں پر، ایک طرح کا مرہم
ایوانوں میں نعرے گونجے، انگریزوں میں ماتم[14]

پورے ملک میں انقلاب کی صدا گونجنے لگی تو یہ مظاہر فطرت جس پر رومانی سائے لرزاں نظر آتے ہیں، آلات حرب کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں۔

جو کنول دیکھ کے آتا تھا فقط یاد کوئی
وہ کنول اب کسی تلوار سے کچھ کم بھی نہیں[15]

راہی معصوم رضا مذہبی اور مسلکی تعصب سے پوری طرح پاک تھے۔ اس نظم میں جب عوام طوق غلامی اتار پھینکنے پر کمربستہ ہو جاتے ہیں تو ان کو Inspire کرنے کے لیے کرشن، رام، بھیم، ارجن کے ساتھ اسلام کے چاروں خلفا کا ذکر کیا جاتا ہے۔ شیخین کا مدحیہ پیرایے میں ذکر، مسلکی عقائد سے ماورا ہونے کا بھی اشاریہ ہے، اس نوع کی مثالیں اردو شاعری میں بہت کم ملتی ہیں۔

پھر وہی داستان دہراؤ
زور بازوئے حیدری لاؤ
ذہن فاروق کی چمک دکھلاؤ
نور اسلام کی دمک دکھلاؤ
عشق صدیق و اعتماد غنی
پھر ہو اک بار شغل صف شکنی
منبر پرچم فضا میں لہرائے
اس چمن میں پھر بہار آئے
یوں کھینچو، رام کی بان بنو
کرشن کا چکر بن کر وار کرو
بھیم کا گرز، بان ارجن کا
گورا تو بلبلہ ہے صابن کا[16]

دہلی، کانپور اور جھانسی میں ہندوستانیوں اور انگریز فوجوں کے تصادم اور ابتداءً حکومت برطانیہ کی پسپائی اور بعض ہندوستانیوں کی غداری کی تفصیل اور ان کے عوام پر پڑنے والے اس کے اثرات کا حیاتی سطح پر ادراک کرنا آسان کام نہیں ہے، مگر راہی معصوم رضا نے یہ تخلیقی کارنامہ انجام دیا اور پیرن کے اشعار مبنی بر صداقت ہیں۔

میں مورخ نہیں ہوں، ایک شاعر ہوں میں
دل کی دھڑکن بتانا میرا کام ہے
جس کہانی سے تاریخ واقف نہیں ہے
وہ کہانی سنانا میرا کام ہے[17]
جاگ دیوانوں کے دامن کی ہوا لایا ہوں
تحفہ خون شہیدان و وفا لایا ہوں

جھانسی میں رانی لکشمی بائی کی قیادت میں عوام نے ہندوستانی عوام اور فوجیوں نے کس طرح داد شجاعت دی، نظم اسے تخلیقی ارتکاز کا ہدف بناتی ہے اور اس جنگ میں عوام کی شمولیت اس حد تک تھی کہ ماں اپنے بچوں کو میدان میں سلامت نہ آنے کی دعا دیتی تھیں۔

مسکراتے ہوئے جانے کی رضا دیتی ہوں
جاؤ بیٹوں تمھیں مرنے کی دعا دیتی ہوں[18]

آزادی کی جنگ کی ابتدا باعث اضطراب اور اندوہ نہیں بلکہ باعث انبساط اور اہتزاز ہے۔

خاک اطراف کی خوش رنگ ہوا چاہتی ہے
تھوڑی ہی دیر میں اب جنگ ہوا چاہتی ہے

نظم کا اختتامی حصہ ایک مختصر غنائیہ ''گومتی'' پر مشتمل ہے جس میں بوڑھے شاعر، مولوی، انگریز افسروں، حضرت محل اور گومتی وغیرہ کردار کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں اور ان کے مکالموں سے 1857 کا شعری بیانیہ خلق کیا گیا ہے۔

راہی معصوم رضا کی نظم 1857 موضوع کی پیش کش میں تخلیقی اختراع، شعری محاسن کی نادر کاری اور اجتماعی حافظہ کی حیاتی سطح پر باز دید کے باعث اردو میں ایک تخلیقی بیانیہ کے طور پر قائم کرتی ہے، مگر یہ افسوس کا مقام ہے کہ اس کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی اور اردو تنقید کے ناخن پر یہ قرض ہنوز باقی ہے۔

حواشی

1. راہی معصوم رضا: 1857، صفحہ 4، نیا کتاب گھر علی گڑھ، 1960
2. ایضاً صفحہ 5
3. ایضاً صفحہ 7
4. ایضاً صفحہ 10
5. ایضاً صفحہ 13
6. ایضاً صفحہ 33
7. ایضاً صفحہ 38
8. ایضاً صفحہ 20
9. ایضاً صفحہ 54
10. ایضاً صفحہ 55
11. ایضاً صفحہ 75
12. ایضاً صفحہ 18
13. ایضاً صفحہ 44
14. ایضاً صفحہ 153
15. ایضاً صفحہ 157
16. ایضاً صفحہ 167
17. ایضاً صفحہ 178
18. ایضاً صفحہ 232

Prof. Shafey Kidwai
Director Sir syed Academy
AMU, Aligarh- 202002 (UP)
Mob.:9412317370
Email: shafeykidwai@gmail.com

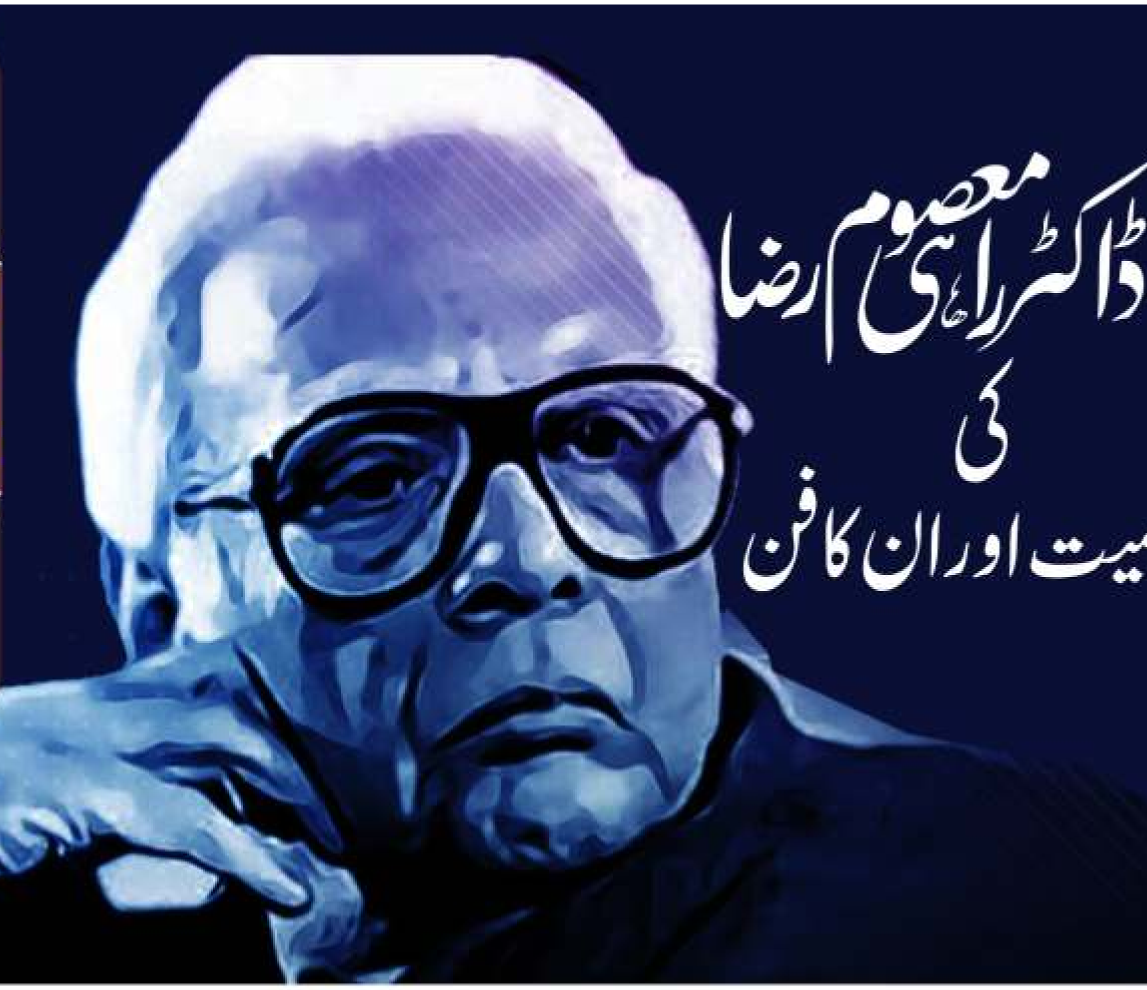

ڈاکٹر راہی معصوم رضا کی شخصیت اور ان کا فن

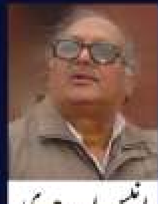

انیس امروہوی

مغربی اتر پردیش کے مشہور ضلع غازی پور کے قصبہ گنگولی میں یکم اگست 1927 کو راہی معصوم رضا کی ولادت وہاں کے ایک معزز خاندان کے فرد جناب بشیر حسین عابدی کے گھر ہوئی۔ ان کے والد اپنے علاقے کے نہ صرف یہ کہ بڑے زمیندار تھے بلکہ ایک مشہور وکیل بھی تھے۔ انھوں نے اپنے وکالت کے پیشے کی وجہ سے غازی پور میں رہائش اختیار کی اور ان کا حویلی نما مکان ''بشیر منزل'' کے نام سے آج بھی وہاں موجود ہے۔ ڈاکٹر راہی کی شہرت اور عزت کو مدنظر رکھتے ہوئے ''بشیر منزل'' سے ملحق سڑک کا نام ''راہی معصوم رضا روڈ'' رکھا گیا ہے۔

راہی معصوم رضا کی ابتدائی تعلیم ایک مدرسے میں شروع ہوئی تھی۔ بچپن میں ہی صحت خراب ہونے کی وجہ سے راہی کے تعلیمی سلسلے میں رکاوٹ آتی رہی۔ ان کو پہلے بھوالی میں اور پھر دوبارہ صحت خراب ہونے کی وجہ سے کشمیر میں ٹی۔ بی کا علاج کرانا پڑا، اس کی وجہ سے 1956 تک وہ یونیورسٹی میں داخلہ نہیں لے پائے۔ بعد میں انھوں نے 1960 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے مکمل کیا۔ اس سے قبل اے۔ ایم۔ یو سے ہی انھوں نے بی۔ اے بھی کیا تھا۔

راہی معصوم رضا کے دادا اعظم گڑھ ضلع کے تھیمکا بجاؤلی قصبے کے تھے جو بعد میں گنگولی منتقل ہو گئے تھے۔ راہی صاحب نے کبھی اپنے دادا کا گاؤں بجاؤلی نہیں دیکھا تھا، اور نہ کبھی ان کو وہاں سے کوئی رغبت پیدا ہوئی۔ ان کا روحانی تعلق صرف گنگولی یا غازی پور سے ہی رہا۔

ڈاکٹر راہی نے اپنے گاؤں گنگولی کے تعلق سے ہی اپنا ناول ''آدھا گاؤں'' لکھا ہے اور وہاں کی اصل زندگی کو اس ناول کا حصہ بنایا ہے۔ اس ناول کا پورا پس منظر 1935 کے آس پاس والی یعنی دوسری جنگ عظیم شروع ہونے سے پہلے کے زمانے سے متعلق ہے۔ یہ سب وہ زمانہ ہے جو راہی نے خود اپنی شعور کی بڑھتی عمر میں وہاں گزارا ہے۔

اے۔ ایم۔ یو سے ایم۔ اے کرنے کے بعد راہی وہیں شعبہ اردو میں عارضی طور پر لیکچرار مقرر ہو گئے تھے۔ اسی دوران انھوں نے صدر، شعبہ اردو، آل احمد سرور صاحب کی نگرانی میں ''طلسم ہوشربا میں ہندوستانیت'' کے موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی تیاری بھی شروع کر دی۔ داستان ''طلسم ہوشربا'' ہندوستان میں اسلامی دنیا کی سب سے مشہور نثری تخلیق میں سے ایک ہے۔ یہ اپنی جادوئی دنیا، شاندار بیانیہ انداز اور قاری انداز میں کہانی کہنے کے ملے جلے طرز کے لیے بے حد مقبول ہے۔

1960 کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں راہی معصوم رضا اور نیر جہاں کے عشق کی داستانیں دھیمے دھیمے لہجے میں علی گڑھ یونیورسٹی کی فضاؤں میں سنائی دینے لگی تھیں۔ 1966 میں ایک ڈرامائی سین کی طرح راہی معصوم رضا نے نیر جہاں سے شادی کر لی۔ نیر جہاں طلاق شدہ تھیں اور اس سے قبل ان کی شادی رامپور کے شاہی خاندان کے لفٹیننٹ کرنل صاحبزادہ محمد یونس خان سے ہوئی تھی۔ کرنل صاحب ہندستانی فوج کی گڑھوال رائفل رجمنٹ میں تعینات تھے اور انھوں نے اپنی خرابی صحت کے مدنظر وقت سے پہلے ہی فوج سے سبکدوشی حاصل کر لی تھی۔ فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے علی گڑھ کے جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج میں ہاسپٹل سپرنٹنڈنٹ کے طور پر ملازمت اختیار کر لی تھی۔

نیر جہاں، صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کی پوتی تھیں، جو سرسید تحریک کے ایک اہم رکن تھے اور سرسید احمد خاں سے ان کی دور کی رشتہ داری بھی تھی۔ یہ رشتہ داری سرسید کے پوتے سر راس مسعود کی شادی ان کی پھوپی زہرہ بیگم سے ہونے کی وجہ سے قائم ہوئی تھی۔ حالانکہ

ڈاکٹر راہی نے اپنے گاؤں گنگولی کے تعلق سے ہی اپنا ناول ''آدھا گاؤں'' لکھا ہے اور وہاں کی اصل زندگی کو اس ناول کا حصہ بنایا ہے۔ اس ناول کا پورا پس منظر 1935 کے آس پاس والی یعنی دوسری جنگ عظیم شروع ہونے سے پہلے کے زمانے سے متعلق ہے۔ یہ سب وہ زمانہ ہے جو راہی نے خود اپنی شعور کی بڑھتی عمر میں وہاں گزارا ہے۔

دونوں خاندانوں کا پس منظر مختلف تھا۔ نیر جہاں کا خاندان افغانستان سے ہجرت کر کے آئے ہوئے پٹھانوں کا تھا۔ جب کہ راہی معصوم رضا کا خاندان شیعہ سیدوں کا تھا۔ نیر جہاں کا جنم یکم مارچ، 1930 کو ہوا تھا۔ لہٰذا پہلے شوہر سے طلاق کے بعد راہی معصوم رضا سے شادی کے وقت ان کی عمر لگ بھگ چھتیس برس رہی ہوگی اور وہ ایک پختہ ذہن کی خوبصورت اور باوقار شخصیت کی مالک تھیں۔ جس زمانے میں بدرالدین طیب جی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، ان کو راہی معصوم رضا کے طور طریقوں سے اختلاف تھا اور اس کے ساتھ ہی اور بھی کئی لوگ تھے جو راہی صاحب کی بیباکی اور آزادیِ طبع کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ادھر جیسے جیسے راہی معصوم رضا کا مطالعہ وسیع ہوتا جا رہا تھا ویسے ہی ان کی تخلیقات میں پختگی اور ترقی پسند تحریک کا عنصر نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔ ان کی زندگی سے جدوجہد کرنے کی عادت بچپن سے ہی پڑ چکی تھی۔ ادھر ملک کی تقسیم اور معاشرے کی ٹوٹ پھوٹ بھی راہی صاحب کو متاثر کر رہی تھی، مگر وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھے۔ انھوں نے اپنا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ مکمل کیا اور یہی وقت تھا جب زندگی سے جدوجہد کا اثر ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔

زہر ملتا رہا زہر پیتے رہے
زندگی بھی ہمیں آزماتی رہی
اور ہم بھی اُسے آزماتے رہے

ان کی تخلیقات میں ایک خاص قسم کی دیوانگی تھی، اس کی ایک اپنی ہی الگ دھن تھی۔ رضا صاحب اپنی اسی دھن میں مست رہنے والے تخلیق کار تھے۔

ہم کیا جانیں قصہ کیا تھا، ہم ٹھہرے دیوانے لوگ
اس بستی کے بازاروں میں روز کہیں افسانے لوگ

نیر جہاں سے شادی کی مخالفت کو انھوں نے بہت دلیری کے ساتھ برداشت کیا اور اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کی لیکچرارشپ کی ملازمت چھوڑ کر بمبئی جانے کا فیصلہ کیا اور وہاں 1967 سے باقاعدہ فلموں کے لیے لکھنا شروع کر دیا۔

راہی صاحب نے الٰہ آباد کے نکہت پبلشرز کے لیے شاہد اختر اور دیگر فرضی ناموں سے کئی ناول لکھے، جن میں سے کچھ جاسوسی ناول بھی تھے۔ رومانی دُنیا کے لیے بھی انھوں نے فرضی ناموں سے کئی ناول لکھے۔

ہندی فلموں میں رضا صاحب کا کیریر رشی کیش مکھرجی کی رومانی ڈراما فلم ''ملی'' سے شروع ہوا، جو 1975 میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم کے مکالمے کافی پسند کیے گئے۔ اس طرح ہندی سنیما میں ان کی پہچان بنتی چلی گئی۔

ڈاکٹر راہی معصوم رضا کو پہلا فلم فیئر ایوارڈ بہترین مکالموں کے لیے 1978 میں ریلیز ہوئی فلم ''میں تلسی تیرے آنگن کی'' کے لیے ملا تھا۔ اس کے ہدایت کار راج کھوسلہ تھے۔ یہ فلم پیار، ایثار اور معاشرے کے جذباتی رشتوں کے مرکزی تانے بانے پر بنائی گئی تھی۔ ان تمام موضوعات کو ناظرین تک پہنچانے میں راہی معصوم رضا کے لکھے مکالموں نے بہت عمدہ کردار نبھایا تھا۔

فلم ''گول مال'' (1979)، ''قرض'' (1980)، ''جدائی'' (1980) اور 1982 میں ریلیز ہونے والی فلم ''ڈسکو ڈانسر'' جیسی کئی کامیاب فلموں میں کام کرنے کے بعد ڈاکٹر راہی صاحب کا اگلا اہم پروجیکٹ رومانٹک ڈراما فلم ''طوائف'' (1985) تھا جسے ہدایت کار بی۔ آر۔ چوپڑا نے ڈائریکٹ کیا تھا۔ ایک طوائف کی اصل زندگی اور اس کی پیچیدگیوں کو دکھانے والی اس فلم میں راہی کے لکھے مکالموں نے کرداروں کو انسانی جذبات اور کہانی کی جذباتی گہرائی کو ناظرین تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم کے لیے انھیں بیسٹ ڈائلاگ رائٹر کا فلم فیئر ایوارڈ بھی پیش کیا گیا تھا۔

ہندستانی ٹیلی ویژن پر راہی معصوم رضا نے سیریل ''مہابھارت'' کے لیے منظر نامہ اور مکالمے لکھے تھے۔ جب اس سیریل لکھنے کے لیے بی۔ آر۔ چوپڑا نے راہی صاحب کا نام تجویز کیا، تب کافی لوگوں نے اس بات پر اعتراض کیا تھا، کہ یہ سیریل قدیم ہندستانی تہذیب پر مبنی ایک مذہبی سیریل ہوگا اور ایک مسلمان ہوتے ہوئے راہی صاحب اس موضوع کے ساتھ کیسے انصاف کر پائیں گے۔ لیکن بی۔ آر۔ چوپڑہ صاحب اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ راہی صاحب ہندوستان کے قدیم اور روایتی ادب سے بہت اچھی طرح واقف ہیں اور ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب سیریل ''مہابھارت'' ٹی۔ وی اسکرین پر دکھایا گیا تو یہ سیریل اس وقت کا کامیاب ترین ٹی۔ وی شو بن گیا۔

اس کے بعد رضا صاحب نے ننی ایرانی کے ساتھ

مل کریش چوپڑہ کی موسیقی ریز رومانی ڈراما فلم ''لمحے'' (1991) کا منظر نامہ اور مکالمے تحریر کیے۔ یہ فلم اپنے زمانے سے آگے کی سوچ والی فلم تھی، جس میں الگ الگ نسلوں کے درمیان پیار کے انوکھے رشتوں کو بیان کیا گیا تھا۔ راہی صاحب کے لکھے مکالموں نے فلم ''لمحے'' کی کہانی میں جذباتی اور ترقی پسند پہلوؤں کو نہایت خوبصورتی سے پیش کیا تھا۔ اس فلم کے ریلیز ہونے پر فلمی حلقوں اور فلمی ناقدین نے رضا صاحب کی بہت تعریف کی تھی۔

37ویں فلم فیئر ایوارڈ میں اس فلم نے مختلف زمروں میں سب سے زیادہ 5 ایوارڈ حاصل کیے تھے جن میں راہی صاحب کو بیسٹ ڈائلاگ رائٹر کے لیے ان کی زندگی کا تیسرا فلم فیئر ایوارڈ ملا تھا۔ فلم ''لمحے'' راہی صاحب کی زندگی میں ریلیز ہونے والی آخری فلم تھی۔

راہی صاحب تمباکو والا پان بہت کھاتے تھے اور سگریٹ پینے کے بھی عادی تھے جس کی وجہ سے ان کو منھ کا کینسر ہو گیا تھا، اور اسی بیماری میں 15 مارچ 1992 کو 64 برس کی عمر میں ڈاکٹر راہی معصوم رضا صاحب کا انتقال ممبئی میں ہو گیا۔ راہی صاحب کے انتقال کے بعد ''یش چوپڑہ فلمس'' کی دو اور فلمیں ''پرمپرا'' (1992) اور ''آئینہ'' (1993) بھی نمائش کے لیے پیش کی گئی تھیں۔ اِن دونوں ہی فلموں کے مکالمے ڈاکٹر راہی معصوم رضا کے تحریر کردہ تھے۔

ڈاکٹر راہی معصوم رضا کو ان کی ادبی تخلیقات اور فلمی خدمات کے پیش نظر حکومت ہند کی جانب سے پہلے پدم شری اور پھر پدم بھوشن کے اعزازات سے بھی نوازا گیا تھا۔

ڈاکٹر راہی معصوم رضا کے تحریر کردہ ناولوں میں ''آدھا گاؤں، دل ایک سادہ کاغذ، ٹوپی شکلا، نیم کا پیڑ، اوس کی بوند، کٹرہ بی آرزو'' اور ''سین نمبر 75'' وغیرہ بے حد مقبول ہوئے۔ ناول ''آدھا گاؤں'' ہندی میں پہلے شائع ہوا اور لگ بھگ ایک لاکھ سے زائد کاپیاں فروخت ہوئیں جو اپنے آپ میں ایک ریکارڈ ہے۔

''آدھا گاؤں'' کے بارے میں راہی صاحب کی فیملی دوست سہاشنی علی نے ایک ملاقات میں بتایا تھا کہ ان کی بیوی نیر جہاں دیوناگری رسم الخط نہ پڑھ پانے کی وجہ سے ان کا یہ ناول نہیں پڑھ سکی تھیں۔ حالانکہ اس ناول پر اتنی زیادہ بات چیت ہوئی کہ اس ناول کی پوری کہانی ان کو یاد ہو گئی تھی۔

سہاشنی علی نے یہ بھی بتایا تھا کہ ابتدا میں ڈاکٹر راہی معصوم رضا انجمن ترقی پسند مصنّفین کے بہت سرگرم رکن تھے، بعد میں وہ اس انجمن سے علیحدہ ہو گئے اور جنوادی لیکھک سنگھ سے منسلک ہو گئے تھے۔ حالانکہ ان کا تمام تخلیقی ادب اور فلمی تحریریں اردو میں ہی لکھی ہوئی ہیں، مگر وہ اردو زبان کو دیوناگری رسم الخط میں لکھنے کے حق میں تھے۔ نئی دہلی میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے میوزیم میں ان کی بہت سی تحریریں اردو میں ہی اپنی اصل حالت میں موجود ہیں اور اب انجمن ان تمام تحریروں کو اُردو میں شائع کرنے کا پروگرام بنا چکی ہے۔

ڈاکٹر راہی معصوم رضا کے ذریعہ لکھے گئے ٹی۔وی سیریل ''نیم کا پیڑ، کسی سے نہ کہنا'' اور ''مہابھارت'' بے حد مقبول رہے، اور فلموں میں ''میں تلسی تیرے آنگن کی'' اور ''ڈسکو ڈانسر'' کی کہانیاں، منظرنامہ اور مکالموں کی وجہ سے بے حد مقبول رہیں۔ جن فلموں میں ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے صرف مکالمے لکھے ان میں ہدایت کار رشی کیش مکھرجی کی فلم ''ملی'' (1975) اور ''آلاپ'' (1977)، ہدایت کار راج کھوسلہ کی فلم ''میں تلسی تیرے آنگن کی'' (1978)، ہدایت کار رشی کیش مکھرجی کی فلم ''گول مال'' (1979)، ہدایت کار سبھاش گھئی کی فلم ''قرض'' (1980)، ٹی۔ راماراؤ کی ہدایت میں بننے والی فلم ''جدائی'' (1980)، فلمساز بونی کپور اور ہدایت کار باپو کی فلم ''ہم پانچ'' (1980)، ہدایت کار ٹی۔ راماراؤ کی فلم ''جیون دھارا'' (1982)، ہدایت کار دساری نارائن راؤ کی فلم ''آج کا ایم۔ ایل۔ اے: رام اوتار'' (1984)، ہدایت کار بی۔ آر۔ چوپڑہ کی فلم ''طوائف'' (1985)، فلمساز و ہدایت کار ٹی۔ راماراؤ کی فلم ''دوستی دشمنی'' (1986)، فلمساز راجو میتھیو کی فلم ''انوکھا رشتہ'' (1986)، ہدایت کار بھارت رنگاچاری کی فلم ''بات بن جائے'' (1986)، ہدایت کار ٹی۔ راماراؤ کی فلم ''ناچے میوری'' (1986)، ہدایت کار و فلمساز بی۔ آر۔ چوپڑہ کی فلم ''عوام'' (1987)، فلمساز و ہدایت کار یش چوپڑہ کی فلم ''لمحے'' (1991) اور ''پرمپرا'' (1993)، ہدایت کار دیپک سرین کی فلم ''آئینہ'' (1993) وغیرہ کافی مشہور رہیں اور عوام میں پسند کی گئیں۔ فلم ''آلاپ'' کے نغمے بھی ڈاکٹر معصوم رضا نے ہی تحریر کیے تھے۔ مشہور غزل گائک جگجیت سنگھ اور ان کی بیگم چترا سنگھ کی آوازوں میں راہی معصوم رضا کا لکھا نغمہ ''ہم تو ہیں پردیس میں، دیس میں نکلا ہوگا چاند'' بھی عوام میں بے حد مقبول ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر راہی معصوم رضا اپنی تحریروں میں بھی بہت بیباک تھے۔ ان کے مکالموں میں بھی اکثر یہ بیباکی محسوس کی جا سکتی ہے۔ اگر ان کے ناول کا کوئی کردار اپنے ماحول میں گالیاں بکتا ہے تو انھوں نے اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی ہے۔ ان کی تحریروں کی بیباکی خاص طور سے ان کے تحریر کردہ مضامین اور چند کتابوں پر ان کے لکھے ہوئے تبصروں میں بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ان کا قلم ایسے موقعے پر دودھاری تلوار کی طرح کام کرتا ہے، مگر ان کی یہ دودھاری تلوار زہر میں بجھی ہوئی کہیں بھی نظر نہیں آتی۔

■

Anees Amrohvi
104/B, Yawar Manzil
I-Block Laxmi Nagar, Delhi-110092
Mob. 9811612373
E-mail: qissey@rediffmail.com

ہندستانی ٹیلی ویژن پر راہی معصوم رضا نے سیریل "مہابھارت" کے لیے منظرنامہ اور مکالمے لکھے تھے۔ جب اس سیریل لکھنے کے لیے بی۔آر۔ چوپڑا نے راہی صاحب کا نام تجویز کیا، تب کافی لوگوں نے اس بات پر اعتراض کیا تھا، کہ یہ سیریل قدیم ہندستانی تہذیب پر مبنی ایک مذہبی سیریل ہوگا اور ایک مسلمان ہوتے ہوئے راہی صاحب اس موضوع کے ساتھ کیسے انصاف کر پائیں گے۔ لیکن بی۔ آر۔ چوپڑہ صاحب اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ راہی صاحب ہندوستان کے قدیم اور روایتی ادب سے بہت اچھی طرح واقف ہیں اور ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب سیریل "مہابھارت" ٹی۔وی اسکرین پر دکھایا گیا تو یہ سیریل اس وقت کا کامیاب ترین ٹی۔وی شو بن گیا۔

گوشۂ راہی معصوم رضا

راہی معصوم رضا

ایک وسیع الذہن تخلیق کار

معصوم مرادآبادی

ممتاز ادیب، شاعر اور مکالمہ نویس راہی معصوم رضا یکم اگست 1926 کو غازی پور کے گاؤں گنگولی میں پیدا ہوئے تھے۔ اس اعتبار سے 2026 ان کی صدی سالگرہ کا سال ہے۔ کئی ادبی اداروں نے ان کی سالگرہ کا جشن منانے کے لیے خصوصی پروگراموں اور اشاعتوں کا اہتمام کیا ہے۔ اس موقع پر وہ تمام باتیں اور تنازعات ایک ساتھ منظر عام پر آ گئے ہیں جن کا تعلق راہی کی شخصیت اور ادبی زندگی سے ہے۔ راہی اردو اور ہندی کی مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کی پیداوار تھے اور وہ تمام زندگی اس کی آبیاری کرتے رہے۔ وہ خالص اردو کے ادیب تھے اور اسی میں ان کی تعلیم وتربیت بھی ہوئی تھی مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی پذیرائی اردو سے زیادہ ہندی حلقوں میں ہوئی اور اس حد تک ہوئی کہ لوگ انھیں ہندی کا ادیب سمجھنے لگے۔ ان کا شہرہ آفاق ناول ''آدھا گاؤں'' بھی پہلی بار ہندی میں شائع ہوا اور اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے 10 ایڈیشن شائع ہوئے اور دس لاکھ سے زیادہ نسخے فروخت ہوئے جو اپنے آپ میں ایک ریکارڈ ہے۔ شاید ہی کسی اردو ادیب کو ہندی میں اتنی مقبولیت اور پذیرائی ملی ہو۔ ان کی شہرت کا دوسرا بڑا حوالہ ٹی وی سیریل 'مہابھارت' ہے، جس نے مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ اس مقبول عام ٹی وی سیریل کے مکالمے راہی نے لکھے تھے اور کچھ لوگوں کو اس بات پر سخت اعتراض تھا کہ 'مہابھارت' جیسے مذہبی رزمیہ کے مکالمے ایک مسلمان کیسے لکھ سکتا ہے۔ 'مہابھارت' کے پروڈیوسر، ڈائرکٹر بی آر چوپڑہ کو اس سلسلے میں خاصی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور ان پر مکالمہ نگار تبدیل کرنے کا دباؤ بھی پڑا مگر انھوں نے رجعت پسندوں کے آگے سرنگوں نہیں کیا۔

راہی کی سب سے زیادہ تخلیقات چونکہ ہندی میں شائع ہوئی ہیں، اس لیے بیشتر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہندی میں ہی لکھتے تھے، لیکن اب یہ انکشاف ہوا ہے کہ ان کا اپنا رسم الخط اردو تھا۔ انھوں نے نہ صرف 'آدھا گاؤں' اردو میں لکھا بلکہ 'مہابھارت' کے مکالمے بھی اردو میں لکھے جنھیں بعد کو ناگری میں تبدیل کیا گیا۔ معروف اسکالر ڈاکٹر اطہر فاروقی نے اپنے ایک طویل مضمون میں راہی کے حوالے سے کچھ انکشافات کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''مجھے یکم مارچ 2026 کو راہی معصوم رضا کے آرکائیوز کو دیکھنے کا موقع ملا جہاں ان کے دیگر مسودوں کے علاوہ ان کے مشہور زمانہ ناول 'آدھا گاؤں' کا قلمی مسودہ مرقومہ 29 جولائی 1964 بھی دریافت ہوا۔ اس کے ساتھ مشہور ٹی وی سیریل 'مہابھارت' کے ایپی سوڈز بھی راہی کے قلم سے اردو میں لکھے ہوئے ملے۔ اس دریافت سے راہی سے متعلق ہندوستان کے ادبی معاشرے کا یہ زاویہ نظر مکمل طور پر تبدیل ہونا طے ہے کہ ان کا تعلق ہندی ادب سے ہے۔ اب یہ پروپیگنڈہ بھی کہ راہی اردو کے لکھنے والے نہیں تھے، ختم ہو جائے گا۔ راہی کے ہزاروں صفحات میں کم از کم مجھے ان کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی ایک سطر بھی ناگری میں نہیں ملی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ ناگری رسم خط سے واقف نہیں تھے یا اسے استعمال نہیں کرتے تھے۔''

(روزنامہ 'انقلاب' نئی دہلی، 2 اگست 2026)

راہی معصوم رضا کی علمی وادبی سرگرمیوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے ناول نگاری کی، شاعری میں نام کمایا، سیاسی اور سماجی مسائل پر اظہار خیال کیا۔ فلم اور ٹی وی سیریلوں کے لیے مکالمے لکھے۔ ادب میں ان کا داخلہ شاعری کے توسط سے ہوا۔ ناول نگاری سے قبل ہی وہ اس میں کمال حاصل کر چکے تھے۔ انھوں نے پہلی جنگ آزادی کو بنیاد بنا کر 'رزمیہ کرانتی' لکھی جو 1857 کی صدی کے موقع پر 1957 میں منظر عام پر آئی۔ سبھی جانتے ہیں کہ 1857 کی جنگ آزادی پر کم ہی لوگوں نے قلم اٹھایا ہے۔ راہی نے اپنی رزمیہ کو پورے

راہی معصوم رضا کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے ناول نگاری کی، شاعری میں نام کمایا، سیاسی اور سماجی مسائل پر اظہار خیال کیا۔ فلم اور ٹی وی سیریلوں کے لیے مکالمے لکھے۔ ادب میں ان کا داخلہ شاعری کے توسط سے ہوا۔

سیاق وسباق کے ساتھ، مہارت کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ اس کتاب میں 'کرانتی کتھا' پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے تین شعری مجموعے 'ایک پھیری والا'، 'شیشے کے مکان والے' اور 'غریب شہر' ہندی میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان مجموعوں میں شامل اشعار میں راہی کے ضمیر کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ ہندی میں راہی کی کتاب 'چھوٹے آدمی کی بڑی کہانی' ویر عبدالحمید کی داستان ہے جنھیں ان کی بہادری کے لیے 'پرم ویر چکر' سے سرفراز کیا گیا تھا۔ اس سوانح کو راہی نے ملک کی حفاظت میں عام آدمی کی جان قربان کرنا اور مادر وطن کے تئیں فرائض کو پورا کرنے کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔ راہی نے ہندی میں 10 ناول لکھے جن میں 'آدھا گاؤں' اور 'ٹوپی شکلا' خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ راہی معصوم رضا کی ادبی اور شعری خدمات پر اردو میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ شاید راہی کو ہندی کا ادیب تسلیم کرنا رہی ہو۔ اس سے بڑا المیہ کیا ہو سکتا ہے کہ راہی پر ابھی تک کسی اردو ادارے نے کوئی مونوگراف شائع نہیں کیا۔ سوائے ساہتیہ اکادمی کے جس نے 2007 میں کنور پال سنگھ کے ایک مونوگراف کو اردو میں ترجمہ کرا کے شائع کیا تھا۔ 117 صفحات کے اس مختصر مونوگراف کا ہندی سے اردو ترجمہ محمد ہادی رہبر نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ اردو میں راہی معصوم رضا پر کوئی کتاب تلاش بسیار کے بعد بھی نہیں ملی۔ معروف ترقی پسند ادیب اور دانشور پروفیسر قمر رئیس نے اپنی کتاب 'ترقی پسند ادب کے معمار' میں راہی معصوم رضا کا تعارف محض ڈھائی صفحہ میں کرایا ہے۔ یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ راہی معصوم رضا کی ادبی قدر و منزلت کا تعین کرنے میں اردو معاشرے نے کوتاہی کا ثبوت دیا۔ اس کی طرف ڈاکٹر اطہر فاروقی نے بھی اپنے مذکورہ بالا مضمون میں اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''بیسویں صدی کے ہندستانی ادیبوں میں راہی معصوم رضا کا شمار ان معدودے چند اہل قلم میں ہوتا ہے جنھیں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی مگر ان کی ادبی قدر و منزلت کا تعین اردو کا علمی معاشرہ یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں کی سیاست کی وجہ سے عام ہونے والی غلط فہمیوں کے سبب کر ہی نہیں سکا۔ ان کے اسکرپٹ رائٹر اور فلم کے مکالمہ نگار ہونے کی شناخت بھی اس قدر غالب آ گئی کہ ان کی ادبی کاوشیں اردو کے ادب نواز معاشرے کی نظروں سے پوری طرح اوجھل ہی ہو گئیں۔

راہی معصوم رضا کے اردو سے شغف کے بارے میں ڈاکٹر اطہر فاروقی لکھتے ہیں:

''راہی معصوم رضا اردو کے ایک صاحب اسلوب شاعر تھے جن کے 7 شعری مجموعے، جی ہاں اردو رسم الخط ہی میں شائع ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے تمام ناول بھی اردو ہی میں لکھے لیکن جن میں سے صرف ایک ناول 'محبت کے سوا' ہی 1950 میں اردو میں شائع ہو سکا۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اردو معاشرہ اس ناول سے بھی واقف نہیں۔ راہی نے مہابھارت کا اسکرپٹ، اسکرین پلے اور ڈائیلاگ بھی صرف اردو میں لکھے تھے۔ اردو معاشرے نے راہی کی تحریروں کو خود ہی 'ہندی' تحریریں کہہ کر نہ پڑھنے کا جواز بھی ڈھونڈ لیا ہے۔''
('انقلاب' نئی دہلی، مورخہ 2 اگست 2026)

راہی معصوم رضا کا ادبی سفر الہ آباد سے شروع ہوا۔ بچپن میں ٹی بی کی بیماری کی وجہ سے وہ اپنی تعلیم مکمل نہیں کر سکے۔ انھوں نے باقی تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پوری کی اور وہاں درس و تدریس سے بھی وابستہ رہے۔ علی گڑھ کے زمانہ قیام سے متعلق راہی کی کئی اچھی بری کہانیاں بیان کی جاتی ہیں اور ان میں ایک کہانی وہ بھی ہے جس کی وجہ سے انھیں علی گڑھ بدر کیا گیا۔ وہ 1954 کے آس پاس علی گڑھ آئے اور اپنے بڑے بھائی پروفیسر مونس رضا (سابق وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی) کے ساتھ رہنے لگے۔ علی گڑھ میں وہ اپنی منفرد شناخت بنانے میں کامیاب رہے۔ یہاں انھوں نے اردو میں ایم اے کرنے کے بعد 'طلسم ہوشربا' پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور یہیں شعبہ اردو میں ایڈہاک پر پڑھانے لگے۔ انھوں نے تقریباً 4 برس شعبہ اردو میں عارضی استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ انھیں علی گڑھ سے والہانہ لگاؤ تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ یہاں سے کہیں اور نہیں جانا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنے ناول 'سین 75' کا انتساب ان الفاظ میں کیا ہے:

''میں تین ماؤں کا بیٹا ہوں، نفیسہ بیگم، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور گنگا۔ یہ 'سین 75' ناول اپنی تینوں ماؤں کی نذر کرتا ہوں۔ نفیسہ بیگم مر چکی ہیں۔ اب یاد نہیں آتیں، باقی دونوں مائیں زندہ ہیں اور یاد بھی ہیں۔''

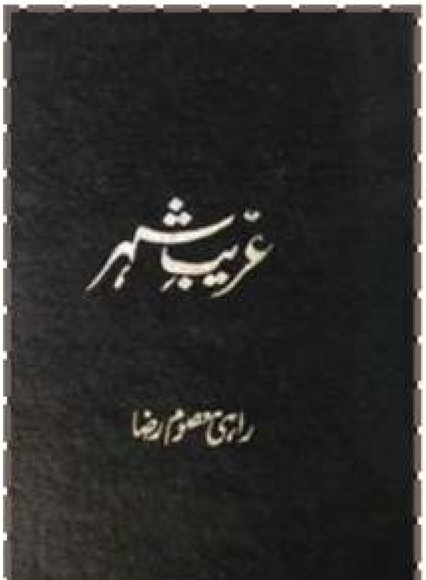

علی گڑھ کو انھوں نے ہمیشہ 'ماں' کا درجہ دیا۔ لیکن 1967 میں مجبوراً انھیں علی گڑھ کو الوداع کہنا پڑا۔ علی گڑھ میں ہی انھوں نے ترقی پسند تحریک میں شمولیت اختیار کی۔ اس وقت یونیورسٹی میں پروفیسر نورالحسن، ڈاکٹر عبدالعلیم، ڈاکٹر ستیش چندر، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور پروفیسر آل احمد سرور جیسے اساتذہ تھے۔ راہی نے یہیں 1945 میں پروگریسیو رائٹرز ایسوسی ایشن کی رکنیت حاصل کی اور وہ تمام عمر ترقی پسند تحریک کا اہم حصہ رہے۔ لیکن علی گڑھ ان کے لیے اس وقت اجنبی بن گیا جب انھوں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایسا قدم اٹھایا جس کی وجہ سے علی گڑھ کی زمین ان کے لیے تنگ ہو گئی۔ یوں بھی علی گڑھ میں ان کے مخالفین کا بھی ایک حلقہ تھا،

جو موقع کی تاک میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس واقعہ کو کنور پال سنگھ نے جو راہی کے قریبی دوست اور علی گڑھ میں ان کے ہم جماعت بھی تھے، ان کے مونوگراف میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''1965 میں راہی کے مخالفوں کو ایک موقع میسر آیا۔ نیر جہاں سے شادی کیا کی کہ علی گڑھ میں طوفان بپا ہوگیا۔ نیر جہاں کرنل یونس کی شریک حیات تھیں، جو نواب رامپور کے سالے تھے۔ مشہور مورخ اور اس وقت ڈین فیکلٹی آف آرٹ پروفیسر نورالحسن نواب رامپور کے داماد تھے۔ موجودہ وائس چانسلر علی یاور جنگ بھی نواب رامپور کے قریبی رشتے دار تھے۔ اوّل تو سبھی نے راہی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ نیر جہاں سے شادی مت کرو۔ تم عارضی طور پر لیکچرار ہو، نوکری جا سکتی ہے۔ راہی نے کہا جان بھی چلی جائے تو بھی پروا نہیں، نوکری تو بہت چھوٹی چیز ہے۔ راہی انتہا کے جذباتی، انا پرست اور ضدی تھے۔ ان دنوں پروفیسر آل احمد سرور صدر شعبہ اردو تھے۔ ان کی صدارت میں سلیکشن کمیٹی کی میٹنگ منعقد ہوئی۔ باہمی اتفاق سے سلیکشن کمیٹی نے فیصلہ لیا کہ راہی کو ادب کی سمجھ نہیں ہے، اس لیے ان کا تقرر نہیں ہوسکتا۔ یونیورسٹی کی تاریخ میں یہ سب سے بھدا مذاق تھا۔ راہی نے ہر ممکن کوشش کی، اس سلسلے میں انھوں نے عدالت کا دروازہ بھی کھٹکھٹایا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا، علی گڑھ ان کے لیے بیگانہ ہوگیا۔''

(کنور پال سنگھ: 'مونوگراف راہی معصوم رضا' صفحہ 12)

اس کے بعد راہی نے دہلی اور لکھنؤ میں لیکچررشپ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ دہلی میں ہی آل انڈیا ریڈیو میں انھیں 800 روپے کی نوکری آفر ہوئی مگر انھوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ معروف ہدایت کار اور فلم ساز آر چندرا کا تعلق علی گڑھ ہی سے تھا اور وہ راہی کے شناسا تھے۔ ان ہی کے توسط سے راہی کی فلمی دنیا تک رسائی ہوئی اور وہ 1967 میں بمبئی چلے گئے اور یہاں انھوں نے ایک نئی جدوجہد شروع کی جو خاصی مشکل تھی۔ فلمی دنیا میں رہ کر اپنی شناخت بنانا اس دور میں بھی ایک مشکل ترین کام تھا، لیکن انھوں نے اس چیلنج کو قبول کیا۔

ابتدائی دور میں علی گڑھ ہی میں راہی کی ملاقات الہ آباد کے مشہور زمانہ نکہت پبلی کیشنز کے مالک عباس حسینی سے ہوئی، جو اس زمانے میں الہ آباد سے اردو ماہنامہ 'نکہت' نکال رہے تھے۔ عباس حسینی کا سب سے بڑا کارنامہ 'جاسوسی دنیا' کی اشاعت ہے جس کے ذریعہ انھوں نے ابن صفی جیسے شہرہ آفاق جاسوسی ناول نگار کو اردو دنیا سے متعارف کرایا۔ اسی ادارے سے ایک اور ماہانہ سلسلہ 'رومانی دنیا' بھی شائع ہوتا تھا۔ راہی نے یہیں سے شاہد اختر کے قلمی نام سے ناول لکھنا شروع کیا۔ یہ وہ دور تھا جب پورے ملک میں نکہت پبلی کیشنز کی دھوم تھی۔

راہی معصوم رضا (دائیں کھڑے ہوئے) کی ایک یادگار تصویر۔ ان کے ساتھ کھڑے ہیں شکیل جمالی اور بیٹھے ہوئے دائیں نکہت پبلی کیشن کے بانی عباس حسینی اور ان کے ساتھ پروفیسر مجاور حسین۔ یہ جاسوسی دنیا کی ابتدائی ادارتی ٹیم ہے جہاں سے راہی معصوم رضا نے اپنا کیریئر شروع کیا تھا۔

نظریاتی طور پر راہی معصوم رضا ترقی پسند افکار کے حامل تھے اور یہ وہ زمانہ تھا جب پورے ملک میں ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی اور تمام ہی ادیب اس سے وابستگی پر فخر محسوس کرتے تھے۔ ممتاز انور نے لکھا ہے:

''ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے 1945 میں ترقی پسند مصنفین کی رکنیت قبول کی اور آخر تک اس سے جڑے رہے۔ اس بات کی گواہ ان کی تحریریں ہیں، جن میں مذہب کے نام پر ملک و قوم کو تقسیم کرنے والی طاقتوں اور تنظیموں کی انھوں نے آخری دم تک مخالفت کی۔ قدامت پرستی کو وہ بالکل برداشت نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے ہندستانی تہذیب کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا، لہٰذا ان کی تحریروں میں ہندستانی تہذیب کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں اور ساتھ ہی اس ملی جلی تہذیب کو باقی رکھنے کا جذبہ بھی۔ ان کی نظر میں نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری کائنات ایک کنبہ ہے۔ یہاں کوئی نہ چھوٹا ہے اور نہ بڑا بلکہ سب برابر ہیں۔ ان کی نظر میں انسانیت سے بڑا کوئی دھرم نہیں تھا۔ ان کی تحریریں انسانیت کے لیے ہیں۔'' ('ترقی پسند ادب کے معمار'، صفحہ 262، دہلی 2006)

راہی معصوم رضا کو یوں تو اپنے شہرہ آفاق ناول 'آدھا گاؤں' سے ملک گیر شہرت حاصل ہوچکی تھی لیکن ان کی ناموری کو اس وقت پر لگ گئے جب انھوں نے مشہور زمانہ ٹی وی سیریل 'مہابھارت' کے مکالمے لکھے۔ اس کے توسط سے پہلی بار وہ ادبی حلقوں سے نکل کر عام لوگوں تک پہنچے۔

راہی معصوم رضا کو یوں تو اپنے شہرہ آفاق ناول 'آدھا گاؤں' سے ملک گیر شہرت حاصل ہوچکی تھی لیکن ان کی ناموری کو اس وقت پر لگ گئے جب انھوں نے مشہور زمانہ ٹی وی سیریل 'مہابھارت' کے مکالمے لکھے۔ اس کے توسط سے پہلی بار وہ ادبی حلقوں سے نکل کر عام لوگوں تک پہنچے۔

Mr. Masoom Moradabadi
Z-103, Taj Enclave
Geeta Colony
Delhi-110031
Mob.:9810780563
Email: masoom.moradabadi@gmail.com

راہی معصوم رضا اور یاس یگانہ شناسی

نسیم احمد نسیم

تاریخ ادب اردو شاہد ہے کہ یاس یگانہ چنگیزی کو زیر اور ان کے قد کو کم کرنے کے لیے ان کا پورا ادبی عہد مصروف کار تھا۔ ایسے میں ان کی شاعرانہ عظمت پر توجہ دینے والا ایک کشادہ ذہن، کشادہ قلب اور انصاف پسند فنکار سامنے آیا جس نے نہ صرف یاس یگانہ کی حمایت کی بلکہ ان کی شاعری کے مقام و مرتبے کی تفہیم کے لیے ایک پوری کتاب تصنیف کردی اور وہ فنکار تھا اردو اور ہندی کا معروف ناول نگار، ڈراما نگار، مکالمہ نگار اور شاعر راہی معصوم رضا۔

اس سے قبل کہ یاس یگانہ کی ذات اور ان کی ادبی خدمات کے متعلق راہی کے معروضی اور غیر جانبدارانہ خیالات سے استفادہ کیا جائے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یگانہ کے ادبی مناقشے اور دیگر احوال پر مختصر روشنی ڈالی جائے۔

لکھنؤ میں سکونت کے دوران یگانہ نے احساسِ ذات اور یاسِ خودی کا اظہار اس شدت سے کیا کہ ان کے مقامی معاصر شعرا ان سے بدظن ہوگئے۔ وہ پہلے سے ہی احساسِ برتری اور دبستانی اختصاص کے سبب کسی کو نہیں گردانتے تھے، اس پر غضب یہ ہوا کہ عظیم آباد کا ایک شاعر ان کی شاعری اور زبان دانی پر نہ صرف کلام کرنے لگا بلکہ ان کی غالب پرستی کو بھی نشانہ بنانے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ معرکے، مجادلے اور مناقشے کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو یگانہ کی موت پر جا کر ختم ہوا اور وہ شاعر ادبی معرکوں اور تنازعات کا محض ایک تاریخی حوالہ بن کر رہ گیا۔ جب کہ اصل یہ ہے کہ یگانہ اپنے عہد کا ایک بڑا اور قادر الکلام شاعر تھا مگر اس کی شاعری چشمکوں اور معرکوں کے شور میں دب کر رہ گئی۔ یگانہ کو اگر تھوڑی بہت شہرت ملی تو وہ 'غالب شکن' اور 'شہرت کا ذبہ' کی وجہ سے ملی، اور کمال ہے کہ انھیں تصنیفات نے ایک ایسی زمین تیار کردی جو میدانِ جنگ بن کر رہ گئی۔ مرزا غالب یگانہ کے ہم عصر شعرا کے لیے آئیڈیل تھے۔ اس لیے یگانہ نے قصداً غالب کو اپنا ہدف بنایا تھا کہ اپنے معاصرین کو زیر کرسکیں۔ حالانکہ ادب میں اس طرح کا رویہ مستحسن نہیں ہوسکتا، لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ یگانہ کے مزاج میں حد درجہ کجی تھی، ساتھ میں جنگجویانہ انداز و ڈھب الگ سے تھا۔ حالانکہ وہ غالب کے کلیتاً منکر نہیں تھے۔ اس ضمن میں ان کا ایک مضمون بعنوان 'میرزا غالب اور میں' رسالہ مخزن میں شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے اصل صورت حال کی توضیح پیش کی تھی اور اسے ڈاکٹر نجیب جمال نے نقل کیا تھا۔ ملاحظہ کریں:

''میں نے غالب پر جو کچھ لکھا وہ بعض مقامی ضرورتوں سے مجبور ہو کر لکھا جس سے محض لکھنؤ کے چند نافہموں کی چشم کشائی مقصود تھی۔ یہ بحث صفی و عزیز و ثاقب کی چشم کشائی کے لیے چھیڑی گئی تھی، اور آج ختم ہوگئی۔'' (رسالہ مخزن، جون 1918، ص 52)

یگانہ کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنے دور سے بالکل الگ مزاج اور سوچ رکھتے تھے۔ انھوں نے الگ الگ وقتوں میں عظیم آباد، کلکتہ، علی گڑھ، حیدرآباد، لکھنؤ اور لاہور جیسے بڑے شہروں میں سکونت اختیار کی۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ کوئی جگہ انھیں راس نہیں آئی۔ ان کی پوری زندگی بیگانگی اور تنہائی کا شکار رہی۔ ان کے یہاں احساسِ تفاخر اس قدر حاوی تھا کہ انھیں نہ کوئی جگہ جچی اور نہ کوئی فنکار۔ وہ میر و غالب اور پھر اقبال جیسے شعرا کے مقابل میں یا تو خود کو کھڑا کرتے رہے یا ان کو کم تر آنکتے رہے اور اپنی انا کی تسکین کا سامان فراہم کرتے رہے۔ خود کو کبھی لسان العصر، ابوالمعانی اور امام الغزل قرار دیتے رہے، اور معاصرین کو اکساتے رہے۔

کون ہوں، کیا ہوں دیکھ لیں اہلِ نظر
آبروئے لکھنؤ، خاکِ عظیم آباد ہوں

ان سطور میں جیسا کہ ظاہر ہے یگانہ کی زیادہ تر ادبی لڑائیوں اور چشمکوں کی طرف اشارے کیے گئے ہیں، لیکن میں یگانہ کے ان حامیان کا بھی ذکر کرنا چاہوں گا جنھوں نے ان کے شاعرانہ مرتبے اور ان کی لسانی مہارتوں کا اعتراف کیا ہے۔ ان میں نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، شاہد احمد دہلوی، عبدالماجد دریابادی، آل احمد سرور اور باقر مہدی کے ساتھ ڈاکٹر راہی معصوم رضا کے نام بھی آتے ہیں۔ یاس یگانہ چنگیزی کے متعلق راہی کی کتاب شاہین پبلشر کے زیر اہتمام 1967 میں الہ آباد سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے ابتدائیہ میں راہی نے اس کی وجہ تخفیف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یگانہ چنگیزی پر مقالہ لکھنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ یگانہ ایک بحث طلب شخصیت ہے۔ ان کے بارے میں نہ تو ان کی زندگی میں غیر جانبداری اور ناقدانہ ہمدردی سے سوچا گیا اور نہ ان کے مرنے کے بعد یا غالب شکن اور 'شہرت کا ذبہ' کے ہنگاموں میں یہ بات تقریباً نظر انداز کردی گئی کہ یگانہ شاعر بھی تھے۔۔۔ اس کتاب کا مقصد یہی ہے کہ یگانہ اور ان کی شاعری کو سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کی جائے، ان کی خوبیوں اور خامیوں کا تجزیہ کیا جائے اور جدید اردو شاعری میں ان کے مقام کا تعین کیا جائے... میں نے کوشش کی ہے کہ بزمِ شعر میں یگانہ کو وہ جگہ مل جائے جس پر ان کا حق ہے۔''

(یاس یگانہ چنگیزی: راہی معصوم رضا، الہ آباد، 1967، ص 8)

راہی معصوم رضا نے ابتداءً یگانہ کے سوانحی احوال اوران کے عصری پس منظر کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ بعدازاں ان کی شاعری کو دو حصوں یعنی 'یاس عظیم آبادی' اور پھر 'یگانہ چنگیزی' کا بہت ہی معروضیت کے ساتھ جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا حالات تھے جنھوں نے یاس کو یگانہ بنا دیا— یگانہ عظیم آباد میں علامہ جمیل مظہری کے شاگرد تھے اور انھیں اس بات پر فخر تھا کہ اپنے عہد کے ایک استاد فن اور عظیم المرتبت شاعر کے آگے انھوں نے زانوئے ادب تہہ کیا تھا۔ حالانکہ جمیل مظہری کے یہاں موضوعات کا تنوع تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ تشکیک کا بڑا غلبہ تھا، لیکن شاگرد نے استاد سے صرف فن لیا، ان کا نظریہ اور اسلوب نہیں؟ یگانہ کی شاعری پڑھیں یا نثر، ان کے یہاں نہ کوئی روایتی انداز و اسلوب ہے اور نہ کوئی بندھا ٹکا نظریہ یا رجحان۔ وہ اپنے موقف کی ترسیل کے دوران ہر طرح کی بندش اور قدغن سے آزاد ہیں۔ وہ زندگی کو متحرک اور ناقابلِ فن تصور کرتے ہیں اور ہر لمحہ زندگی اور انسانیت کی بقا اور اس کے ارتقا میں یقین رکھتے تھے۔ اس بات کو انھوں نے اپنی تصنیف آیات وجدانی (ص 62) میں بھی فرمایا تھا کہ انسانیت جب تک زندہ ہے، پچھلے سبق سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتی رہے گی۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھیے۔

رفتارِ زندگی میں سکوں آئے کیا مجال
طوفان ٹھہر بھی جائے تو دریا بہا کرے

کارگاہِ دنیا کی نیستی بھی ہستی ہے
اک طرف اجڑتی ہے، اک سمت بستی ہے

وہی نیرنگیٔ طلسم ہوا
موج کیا اور بلبلا کیا ہے

موجِ ہوائے خاک اگر آشنا نہ ہو
دنیائے گرد و باد کی نشو و نما نہ ہو
صورت نہ پکڑے جلوۂ بے معنی حباب
قطرہ اگر اسیرِ طلسمِ ہوا نہ ہو

ہمیں اس امر کا احساس کراتے ہیں کہ یگانہ نہ صرف زندگی کے مختلف رنگوں سے واقف ہیں بلکہ ان رنگوں کو مزید گہرا ہوتا ہوا دیکھنا بھی پسند کرتے ہیں۔ ان اشعار کے متعلق راہی معصوم رضا کا خیال ہے کہ زندگی کا ارتقا اور جذبۂ انسانیت کسی سماجی شعور کے راستے نہیں آیا ہے بلکہ وہ ان کی غیرت کے راستے آیا ہے اور اس جذبے نے یاس کا ساتھ جبھی نہیں چھوڑا۔ یگانہ نے بہت بلندی سے چیزوں کو دیکھا اور محسوس کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں ہر چیز چھوٹی اور معمولی نظر آئی۔ شاید یہی سبب تھا کہ وہ اپنے عہد کی مروجہ عشقیہ شاعری سے بہت اوپر اٹھ گئے۔ ان کے یہاں لب و رخسار اور گل و بلبل کے ذکر و اذکار کی کوئی گنجائش نہ تھی اور اگر کبھی بھولے سے حسن کا ذکر بھی کیا تو ہمیشہ عشق کو ہی مقدم رکھا۔ راہی نے یاس عظیم آبادی کے اور بھی بہت سے اشعار نقل کیے ہیں اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ یاس یگانہ نے پرانے بتوں کو توڑنے کا کام کیا۔ سب سے پہلے تشبیب کو درکنار کیا۔ اس کے بعد تمام روایتی موضوعات سے دوری بنائی اور پھر حقائق کی ترجمانی کو اصل شاعری کا جوہر قرار دیا۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ یاس کے یہاں زندگی کو اولیت حاصل ہے اس لیے حسن و عشق دونوں کے لیے ان کا رویہ حقارت آمیز ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ' آیاتِ وجدانی' میں انھوں نے فرمایا کہ:

''غزل بہت وسیع چیز ہے۔ محض عورت اور مرد کے معاملات تک محدود نہیں۔۔۔ حقیقی شاعری کے لیے زندگی کے حقائق کیا کم ہیں کہ انھیں چھوڑ کر رومان کی طلسم بندیوں سے دل بہلایا جائے۔''

(آیاتِ وجدانی (جدید)، یگانہ چنگیزی، ص59-134)

حالانکہ یاس کا یہ نظریہ ہماری پوری غزلیہ روایت کی نفی ہے، مگر چونکہ وہ حسن و عشق کے شعور میں زندگی اور اس کے تعمیری پہلوؤں کو اجاگر کر رہے تھے، اس لیے بعض پارکھی نظروں نے اس کی قدر بھی کی اور ستائش بھی۔ مثلاً مجنوں گورکھپوری کا یہ اقتباس دیکھیں:

''غزل جواب تک صرف حسن و عشق کی شاعری سمجھی جاتی رہی ہے، یگانہ نے اسے زندگی کی شاعری بنا دیا انسان و کائنات کے ہستی کے رموز و اشارات کو اپنی غزلوں کا موضوع قرار دیا۔۔ یگانہ پہلے شاعر ہیں جو ہم کو زندگانی کا 'جبروتی' رخ دکھاتے ہیں اور ہمارے اندر سعی و پیکار کا ولولہ پیدا کرتے ہیں۔''

(آیاتِ وجدانی وجدید، مجنوں گورکھپوری، ص 1)

اس اقتباس کے متعلق راہی فرماتے ہیں کہ یاس کی شاعری کے متعلق مجنوں نے بہت ہی اچھی اور مناسب تاویل پیش کی ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ یاس کی کجی اور ضد نے ان کے کلام میں جو حسن اور توانائی پیدا کی اسے مجنوں نے دیکھ لیا تھا جب کہ باقر مہدی اس کو نہیں دیکھ پائے۔ اس لیے یہ بات بلا تردد کہی جا سکتی ہے کہ یاس کی شاعری کا جو حسن ہے، اس میں نرمی، معصومی اور سپردگی کا خمیر نہیں ہے۔ بطور مثال یہ رباعی ملاحظہ کریں۔

سنتے نہیں پھر جو ہم بگڑ جاتے ہیں
دشمن ہو کہ دوست سب سے لڑ جاتے ہیں
ہلنے کے نہیں اپنی جگہ سے کبھی یاس
ہٹتے نہیں جب بات پہ اڑ جاتے ہیں

یہ رباعی ایک طرح سے یاس کی پوری زندگی اور شخصیت کی تفسیر ہے۔ یہاں راہی یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ یاس لکھنؤ میں سکونت سے قبل بھی نہ صرف خود پسند تھے بلکہ باغیانہ مزاج بھی رکھتے تھے اور اس باغیانہ مزاج اور خود پسندی کو وہ سرکش قرار دیتے ہیں نیز اس خود پسندی اور بغاوت کو وہ یاس کی شاعری کا بنیادی پتھر بھی ثابت کرتے ہیں۔ انھوں نے یاس کی ایک بڑی خصوصیت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ باغی اور سرکش ضرور تھے مگر وہ جس معاشرے میں رہتے تھے، اس کے ساتھ انھوں نے کبھی بغاوت یا غداری نہیں کی۔ ان کا مزاج سب کو ساتھ لے کر چلنے والا تھا، یعنی وہ 'واسودیو کٹمبکم' (Vasudhaiva Kutumbakam) کے نظریے کے حامی تھے۔ یگانہ ایک ایسے معاشرے کا خاکہ اپنے ذہن میں رکھتے تھے جو نہ مسلم معاشرہ ہو، نہ ہندو معاشرہ ہو اور نہ آریہ سماجی معاشرہ ہو، بلکہ وہ آدم معاشرہ ہو۔ اس دعوے کی دلیل کے طور پر وہ یاس کے چند اشعار نقل کرتے ہیں۔

بندے نہ ہوں گے جتنے خدا ہیں خدائی میں
کس کس خدا کے سامنے سجدہ کرے کوئی

کیا خبر تھی یہ خدائی اور ہے
ہائے میں نے کیوں خدا لگتی کہی

دہائی ہے دل درد آشنا دہائی ہے
کہ آہِ سرد پہ تہمت ہے دل دکھانے کی

راہی نے یاس کے یہاں احساسِ تنہائی اور شدتِ انا کا ذکر کئی مقامات پر کیا ہے، یعنی یہ چیزیں لکھنؤ پہنچنے سے پہلے بھی ان کے اندر موجود تھیں۔ ان کے مطابق یاس سماجی اور سیاسی معاملات سے بے خبر نہیں تھے، لیکن ملک میں چلنے والی تحریکوں سے علاحدگی

نے ان کے اندر تنہائی کا ایک شدید احساس پیدا کردیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ان کے اندر انا کا نشتر اور تیز ہوگیا تھا مگر یہاں یاس کے مزاج اور نفسیات پر غور کرنا ہوگا۔ انھیں تنہائی عزیز تھی اور وہ قصداً اپنے خول میں سمٹ کر رہنا پسند کرتے تھے۔ وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ ان کے اشعار لوگوں تک پہنچیں، لیکن وہ جان بوجھ کر اپنے قارئین اور سامعین سے دور رہنا چاہتے تھے۔ اب اسے یاس کی انفرادیت کہیں یا کلبیت، کہنا مشکل ہے۔

راہی نے یگانہ کو اردو کے جدید شعرا میں نہ صرف اہم قرار دیا ہے بلکہ ان کے دورِ دوم کی شاعری کو زیادہ قابلِ قدر ثابت کیا ہے، مگر یہاں آ کر ان کی راہ میں کئی رکاوٹیں آئیں۔ لکھنؤ میں مخالفین کی یلغار نے انھیں اکسایا اور انھوں نے نہ صرف اپنے مقامی معاصرین بلکہ فراق و جوش جیسے مشاہیر کو بھی نشانے پر لیا اور انھیں کچا اور ناپختہ شاعر گردانا۔ یگانہ کے اس انحرافی رویے نے بہتیرے شعرا کو ناراض کردیا۔ جواب میں ان کے مخالفین نے بھی انھیں نشانہ بنایا اور غالب شکنی کے الزام میں ہر طرف سے معتوب بھی کیا۔ اس طرح یگانہ کے شاعرانہ جوہر اور ان کی خداداد صلاحیت، دونوں کو نقصان پہنچا۔ اس ضمن میں راہی کا یہ اقتباس صورت حال کی حقیقی عکاسی کرتا ہے:

''انھیں غالب کے پرستاروں نے دھکا دے کر غالب شکنی کے کگار تک پہنچا دیا۔''

(یاس یگانہ چنگیزی، راہی معصوم رضا،ص209)

اس کے بعد ترقی پسند مصنفین نے بھی یگانہ کو پورے طور پر اپنے نشانے پر لیا اور ان کی شاعرانہ حیثیت کو خاک میں ملانے کا کام کیا۔ وہ اس لیے کہ یگانہ ترقی پسند تحریک کو ادب کے لیے غیر ضروری اور ضرر رساں تصور کرتے تھے، لیکن ان تمام نامساعد حالات کے باوجود یگانہ کی شاعری کے مداحوں کی بھی کمی نہیں تھی— راہی معصوم رضا نے اپنی تصنیف 'یاس یگانہ چنگیزی' میں اس بات کی وضاحت کی کہ یگانہ کے شاعرانہ مقام و مرتبے تک پہنچنے کے لیے ان کے متنازعہ بیانات اور ان کی ادبی جنگوں سے باہر نکلنا ہوگا۔ تب ہی جا کر ان کے ساتھ انصاف ہوگا۔ اس ضمن میں وہ فرماتے ہیں کہ 'آیاتِ وجدانی' اور 'نشترِ یاس' یگانہ شناسی کے لیے بہت اہم حوالے ہیں، اس لیے ان پر توجہ مرکوز رکھنی ہوگی۔ وہ یگانہ کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''یگانہ چنگیزی زمانے کے سرد و گرم سے متاثر ہوئے، لیکن وہ زندگی جیسی نعمت سے آزردہ نہیں ہوئے۔ زندگی جیسی نعمت سے آزردہ نہ ہونا بڑی حرارت کا کام ہے۔ یہ وہ بنیادی قدر ہے جس پر یاس کی شاعری کی ٹھوس عمارت کھڑی ہے... یاس کی شاعری کا حسن اس کی توانائی میں ہے اور وطن کی تعمیر نو کے اس عہد میں ہمیں اس توانائی کی ضرورت ہے، جو ہمیں سرد و سرگرم سے متاثر ہونے کے باوجود یہ سکھائے کہ زندگی جیسی نعمت سے آزردہ نہیں ہوا کرتے۔''

(یاس یگانہ چنگیزی: راہی معصوم رضا،ص62)

مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں اگر یاس یگانہ کے شعری سرمایے پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی غزلوں اور رباعیوں کے ذریعے اپنے عہد اور بعد کے معروف شعرا کو بڑے پیمانے پر متاثر کیا۔ جوش اور فراق کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ حالانکہ ان کے اور جوش و فراق کے راستے الگ الگ تھے مگر فکری اعتبار سے یگانہ مذکورہ دونوں مشاہیر سے قریب ہیں۔

اب یہاں مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر یاس یگانہ کی چند رباعیاں ملاحظہ کریں۔

ساجن کو سکھی منا لو، پھر سو لینا
سوتی قسمت جگا لو پھر سو جانا
سوتا سنسار سننے والا بیدار
اپنی بیتی سنا لو پھر سو جانا

دنیائے دنی مجھ سے عداوت رکھے
جھوٹی سچی ہزار تہمت رکھے
تیرے دم سے ہے اپنی دنیا آباد
اے درد! خدا تجھے سلامت رکھے

وہ مست کہ بے پیے چھلکتا جائے
نشہ میں شباب کے بہکتا جائے
آئینہ کا سامنا کرے گا کیوں کر
اپنے سائے سے جو بھڑکتا جائے

ان رباعیوں کے غائر مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا اچھا خاصا اثر فراق اور ان کے 'روپ' کی رباعیوں پر پڑا۔ کچھ یہی حال جوش کا بھی ہے۔ وہ بھی کہیں نہ کہیں یگانہ سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ یگانہ کا ہی اثر تھا کہ جوش نے ایک فلم 'من کی جیت' کے لیے جو گانا لکھا اس میں ایک بول اس طرح تھا کہ یگانہ کے ایک شعر کا پورا مصرعہ اس میں آگیا۔ جوش کے گانے کا بول تھا۔

دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

اب یگانہ کا پورا شعر دیکھیں۔

ہر شام ہوئی صبح تو اک خواب فراموش
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

راہی معصوم رضا نے یہاں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ یگانہ صرف ایک متنازعہ شخصیت نہیں تھے بلکہ وہ ایک منجھے ہوئے قادر الکلام شاعر بھی تھے، نیز یہ کہ ان کے افکار اور لب و لہجے سے ان کے ہمعصروں اور بعد کے شاعروں نے بھی استفادہ کیا۔ جہاں تک یگانہ چنگیزی کی غزلیہ شاعری کا تعلق ہے، تو اس سلسلے میں بھی راہی نے کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ انھوں نے یاس یگانہ کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھا کہ انھوں نے لکھنؤ والوں کی سطحی جذباتیت اور لفظی بازیگری سے باہر نکل کر زندگی کی سنگلاخ زمین پر قدم رکھا۔ یہی نہیں، انھوں نے غزل کو اس کے مستقل کرداروں کے انجمن سے باہر نکالا۔ یعنی یاس یگانہ کے یہاں ناصح، واعظ، رقیب، ترک بچے، نحیف اور بے غیرت عاشق نظر نہیں آتے۔

اخیر میں اب اتمامِ حجت کے طور پر یاس یگانہ کے چند غزلیہ اشعار ملاحظہ کریں۔ ان اشعار کی قرأت سے اندازہ ہوجائے گا کہ یہ نہ صرف موضوعات اور لب و لہجے کے اعتبار سے الگ ہیں بلکہ اپنے پیش روؤں اور ہمعصروں سے بھی جدا اور منفرد ہیں۔

دنیا سے یاس جانے کو جی چاہتا نہیں
اللہ رے حسن گلشنِ ناپائیدار کا

سایۂ دیوار سے لپٹے پڑے ہو خاک پر
اٹھ چلو ورنہ وہ کافر بدگماں ہوجائے گا

دردِ دل صیاد کو کچھ کچھ سنایا جائے
گھٹ کے مرجاؤں تو پھر لطفِ گرفتاری نہیں

پھاڑے کھاتی ہے ہمیں یہ ملگجی پوشاک یاس
جامۂ تن بتاؤ دھجیاں کیوں کر کریں

■

Dr. Nassem Ahmad Naseem
Kali Bagh, Bettiah
West Chmparan- 845438 (Bihar)
Mob.: 7011548240
E-mail: ahmad.naseem7011@gmail.com

راہی معصوم رضا

ادب سے پردۂ سیمیں تک

صدر عالم گوہر

ادب کی دنیا میں کچھ نام ایسے ہوتے ہیں جو محض کتابوں کے صفحات پر درج نہیں رہتے بلکہ وقت کے ساتھ ایک پورے عہد کی علامت بن جاتے ہیں۔ ان کے الفاظ اپنی تخلیق کے زمانے سے نکل کر آنے والی نسلوں کے حافظے کا حصہ بن جاتے ہیں۔ راہی معصوم رضا بھی ایسا ہی ایک نام ہے۔ وہ صرف شاعر، ناول نگار یا مکالمہ نگار نہیں تھے؛ وہ ہندستانی تہذیب کے ان حساس ترجمانوں میں شامل تھے جنھوں نے اپنے قلم سے گاؤں کی مٹی، انسان کی داخلی کشمکش، رشتوں کی پیچیدگی، مذہبی ہم آہنگی اور بدلتے ہوئے ہندوستان کی تصویر کشی کی۔

میری راہی معصوم رضا سے پہلی شناسائی ان کے شہرہ آفاق ناول ''آدھا گاؤں'' کے ذریعے ہوئی۔ اسے پڑھتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ میں کسی ایک ناول کو نہیں بلکہ ایک پورے عہد کو پڑھ رہا ہوں۔ گنگولی کا گاؤں، وہاں کے لوگ، ان کے باہمی رشتے، رسم و رواج، سیاسی اور سماجی تبدیلیاں اور تقسیم ہند کے زخم— سب کچھ اس طرح زندہ ہو کر سامنے آتا ہے کہ قاری خود کو اس ماحول کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہی راہی کی تخلیقی قوت تھی کہ وہ بڑے تاریخی واقعات کو محض تاریخ کے طور پر بیان نہیں کرتے بلکہ انھیں عام انسان کی زندگی میں اترتے ہوئے دکھاتے ہیں۔

راہی معصوم رضا 1927 میں اتر پردیش کے ضلع غازی پور کے گاؤں گنگولی میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک علمی و ادبی خانوادے سے تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پہنچے، جہاں کی علمی اور فکری فضا نے ان کی شخصیت اور ادبی شعور کو نئی وسعت عطا کی۔ انھوں نے اردو ادب میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور پی ایچ ڈی کی سند بھی علی گڑھ ہی سے حاصل کی۔ علی گڑھ اس زمانے میں محض ایک تعلیمی ادارہ نہیں تھا بلکہ ایک فکری اور تہذیبی مرکز بھی تھا، راہی کی شخصیت پر اس ماحول کے اثرات ان کی پوری تخلیقی زندگی میں محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

ان کا ادبی سفر شاعری سے شروع ہوا۔ شاعر ان کے اندر ابتدا ہی سے موجود تھا، مگر بعد میں ناول نگاری نے انھیں ایک الگ شناخت عطا کی۔ ''آدھا گاؤں'' ان کی ادبی زندگی کا وہ سنگِ میل ہے جس نے اردو ناول کو ایک نئی سمت دی۔ اس ناول میں تقسیم ہند کو کسی سیاسی دستاویز کے طور پر نہیں بلکہ انسانی رشتوں کے المیے کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے الگ خانوں میں نہیں بلکہ ایک مشترکہ معاشرت کے افراد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ جاگیرداری، مذہبی شناخت، طبقاتی کشمکش، محبت، نفرت اور بدلتے ہوئے سماجی حالات سب ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہیں کہ ناول ایک پورے معاشرے کا آئینہ بن جاتا ہے۔

ان کے دوسرے ناولوں میں بھی یہی بیباکی اور تخلیقی آزادی نظر آتی ہے۔ ''ٹوپی شکلا''، ''دل ایک سادہ کاغذ''، ''ہمت جونپوری''، ''اوس کی بوند''، ''سین 75'' اور دوسرے کام ان کی فنی وسعت کے گواہ ہیں۔ راہی کسی ایک موضوع یا ایک اسلوب کے پابند نہیں تھے۔ ان کے ہاں زندگی اپنی تمام پیچیدگیوں کے ساتھ موجود ہے۔ وہ انسان کو اس کی مذہبی یا سماجی شناخت سے پہلے ایک انسان کے طور پر دیکھتے ہیں۔

یہی نظریہ بعد میں ان کے فلمی کام میں بھی نمایاں ہوا۔

ممبئی کی فلمی دنیا میں داخل ہونے کے بعد راہی معصوم رضا کی شناخت ایک نئے انداز میں ہوئی۔ جس شاعر اور ناول نگار کو ادبی حلقے جانتے تھے، فلمی دنیا نے اسے ایک غیر معمولی مکالمہ نگار کے طور پر دریافت کیا۔ یہ تبدیلی بظاہر حیرت انگیز تھی، مگر حقیقت میں راہی کے اندر موجود تخلیقی استعداد ہی کا ایک نیا اظہار تھی۔

فلمی مکالمہ نگاری میں ان کا کمال یہ تھا کہ وہ الفاظ کو کردار کے مزاج سے الگ نہیں کرتے تھے۔ ان کے مکالمے مصنوعی ادبی زبان نہیں بولتے؛ کردار اپنی سماجی حیثیت، نفسیات اور تجربے کے مطابق گفتگو کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لکھے ہوئے جملے فلمی پردے سے نکل کر عام بول چال کا حصہ بن جاتے تھے۔

'میں تلسی تیرے آنگن کی'، 'نکاح'، 'طوائف'، 'گول مال'، 'قرض'، 'لمحے'، 'اندھا قانون' اور متعدد دوسری فلموں میں ان کی مکالمہ نگاری نے کہانی کو محض واقعات کا سلسلہ نہیں رہنے دیا بلکہ کرداروں کے جذبات اور باطن کی آواز بنا دیا۔ انھوں نے یہ ثابت کیا کہ فلمی مکالمہ اگر زندگی کی سچائی سے جڑا ہو تو وہ ادب سے کم موثر نہیں ہوتا۔

ان کی مکالمہ نگاری کو فلم فیئر ایوارڈ سے بھی سراہا گیا اور انھیں بہترین مکالمہ نگاری کے لیے متعدد مرتبہ اعزاز حاصل ہوا۔ لیکن ان کے لیے اصل انعام شاید وہ تھا جو انھیں عوام کی زبان سے ملا۔ ان کے مکالمے یاد کیے گئے، دہرائے گئے اور فلموں سے باہر بھی زندہ رہے۔

راہی معصوم رضا کی فلمی کامیابیوں میں راج کھوسلہ کے ساتھ ان کا تعلق بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ راج کھوسلہ اپنے زمانے کے نہایت کامیاب اور صاحبِ بصیرت ہدایت کار تھے۔ جب انھوں نے 'میں تلسی تیرے آنگن کی' کے لیے راہی کو منتخب کیا تو یہ محض ایک پیشہ ورانہ فیصلہ نہیں تھا؛ یہ ایک فنکار کا دوسرے فنکار کی تخلیقی صلاحیت پر اعتماد بھی تھا۔

راہی نے کرداروں کے جذبات، رشتوں کی نزاکت اور گھریلو زندگی کی کشمکش کو اس زبان میں بیان کیا جس میں بناوٹ نہیں بلکہ زندگی کی حرارت تھی۔ فلم کی کامیابی اور راہی کو ملنے والا اعزاز اس تخلیقی اشتراک کی توثیق تھا۔

اسی طرح بی۔ آر۔ چوپڑا کے ساتھ ان کا تعلق بھی ہندستانی فلمی تاریخ کا اہم باب ہے۔ 'نکاح' جیسی حساس اور سماجی موضوع کی فلم میں راہی کے مکالموں نے کرداروں کے دکھ، معاشرتی دباؤ اور انسانی رشتوں کی پیچیدگی کو بھرپور اظہار دیا۔ ان کے ہاں جذبات کبھی نعرہ نہیں بنتے؛ وہ کردار کی زندگی سے پھوٹتے ہیں۔

لیکن راہی معصوم رضا کی تخلیقی زندگی کا سب سے غیر معمولی باب 'مہابھارت' سے وابستہ ہے۔

جب بی۔ آر۔ چوپڑا نے ہندوستان کے عظیم رزمیے کو ٹیلی ویژن پر پیش کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے مکالموں کی ذمہ داری راہی معصوم رضا کو سونپی تو یہ ایک جرات مندانہ انتخاب تھا۔ ایک مسلمان ادیب کا ہندو مذہب کی عظیم ترین رزمیہ روایت کے مکالمے لکھنا بعض لوگوں کے لیے سوال کا باعث بن سکتا تھا، مگر راہی نے اسے مذہبی حدود کے بجائے ادبی اور انسانی سطح پر دیکھا۔

انھوں نے 'مہابھارت' کو محض ایک مذہبی داستان کے طور پر نہیں برتا بلکہ انسانی کرداروں، اخلاقی سوالات، اقتدار کی کشمکش، فرض، محبت، انتقام اور تقدیر کی عظیم داستان کے طور پر پیش کیا۔ ان کے مکالموں میں بھیشم کی عظمت، ارجن کی کشمکش، کرشن کی حکمت اور دوسرے کرداروں کے باطن کی آواز سنائی دیتی ہے۔

یہاں راہی کی گنگا جمنی تہذیبی بصیرت اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ انھوں نے کسی روایت کو باہر سے دیکھنے کے بجائے اس کے اندر داخل ہو کر اس کی روح کو سمجھنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مکالمے مذہبی شناخت کی دیواروں سے بلند ہو کر انسانی تجربے کی زبان بن گئے۔

'مہابھارت' کی مقبولیت غیر معمولی تھی۔ جب یہ سیریل نشر ہوتا تو ملک کے بے شمار گھروں میں لوگ اپنے

ممبئی کی فلمی دنیا میں داخل ہونے کے بعد راہی معصوم رضا کی شناخت ایک نئے انداز میں ہوئی۔ جس شاعر اور ناول نگار کو ادبی حلقے جانتے تھے، فلمی دنیا نے اسے ایک غیر معمولی مکالمہ نگار کے طور پر دریافت کیا۔ یہ تبدیلی بظاہر حیرت انگیز تھی، مگر حقیقت میں راہی کے اندر موجود تخلیقی استعداد ہی کا ایک نیا اظہار تھی۔

معمولات روک کر ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھ جاتے۔ اس مقبولیت میں اداکاروں، ہدایت کار اور پوری ٹیم کی محنت شامل تھی، مگر راہی کے مکالموں نے کرداروں کو وہ زبان عطا کی جس کے ذریعے وہ عوام کے ذہن میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے۔ اس سیریل کے حوالے سے 'میں وقت ہوں' جیسا تصور بھی نہایت اہم ہے۔ وقت کو ایک کردار کی طرح سامنے لانا اور اس کے ذریعے پوری داستان پر ایک فلسفیانہ نظر ڈالنا راہی کی تخلیقی بصیرت کی مثال ہے۔ وقت یہاں صرف واقعات کا گواہ نہیں بلکہ انسانی اعمال، ان کے نتائج اور تاریخ کے مسلسل بہاؤ کا خاموش مبصر بن جاتا ہے۔ اس تصور نے 'مہابھارت' کے بیانیے کو محض ایک داستان نہیں رہنے دیا بلکہ اسے فکر و فلسفے کی ایک وسیع دنیا میں تبدیل کر دیا۔

راہی معصوم رضا کی زبان کا ایک اور دلچسپ پہلو ان کی لسانی اختراع تھی۔ انھوں نے اردو اور ہندی کے تہذیبی مزاج کو اس طرح باہم ملایا کہ بعض نئے مرکبات نہ صرف قابلِ فہم رہے بلکہ عوامی زبان کا حصہ بن گئے۔ ''ماتا شری''، ''پتا شری'' اور ''بھراتا شری'' جیسے استعمال اسی تہذیبی آمیزش کی مثالیں ہیں۔ اردو کے مانوس ''امی جان''، ''ابو جان'' اور ''بھائی جان'' جیسے محبت آمیز اسالیب کو ہندی کے سانچے میں ڈھالنے کا یہ عمل محض لفظوں کا کھیل نہیں تھا: اس کے پیچھے ہندستانی تہذیب کے مشترکہ مزاج کی گہری سمجھ موجود تھی۔

راہی کے ہاں زبان کبھی محض اظہار کا وسیلہ نہیں بنتی۔ زبان کردار کی شناخت بھی ہے اور معاشرے کی تاریخ بھی۔ ان کے ناول ہوں، فلمی مکالمے ہوں یا ٹیلی ویژن کے ڈرامے — وہ زبان کے ذریعے تہذیب کو زندہ رکھتے ہیں۔

یہاں ان کی شخصیت کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے: خودداری۔

وہ اپنے فن اور اپنی رائے کے بارے میں نہایت حساس تھے۔ انھیں غیر ضروری مداخلت پسند نہیں تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ فلمی دنیا کی چکاچوند میں رہتے ہوئے بھی ان کے اندر کا ادیب کبھی مرنے نہیں پایا۔ انھوں نے شہرت کو اپنی اصل شناخت پر غالب نہیں آنے دیا۔

اس کی گواہی ان کی شاعری دیتی ہے۔

ان کے اشعار میں ایک ایسی تنہائی اور ہجرت کا کرب محسوس ہوتا ہے جو بڑے شہر کی بھیڑ میں بھی انسان کو اپنے اندر سے آواز دیتا رہتا ہے۔

ہم تو ہیں پردیس میں، دیس میں نکلا ہوگا چاند
اپنی رات کی چھت پر کتنا تنہا ہوگا چاند

یہاں چاند صرف چاند نہیں رہتا۔ وہ وطن، گاؤں، گھر، یاد اور دور رہ جانے والے لوگوں کی علامت بن جاتا ہے۔ پردیس میں بیٹھا ہوا شاعر آسمان کے اسی چاند کو دیکھتا ہے جو شاید اس کے گاؤں کی چھت پر بھی چمک رہا ہے۔ فاصلے کے باوجود ایک ہی آسمان دونوں جگہ موجود ہے، مگر احساس کی دنیا میں مسافت بے حد طویل ہو چکی ہے۔

راہی کی شاعری میں شہر کی تنہائی بھی ہے اور اپنے اندر کے زخموں کی آگہی بھی۔ یہی وہ کیفیت ہے جس

نے ان کی شخصیت کو محض فلمی مصنف بننے سے بچائے رکھا۔ ممبئی نے انھیں مکالمہ نگار کے طور پر پہچانا، مگر ان کے اندر کا شاعر اپنی مٹی سے وابستہ رہا۔

اسی شاعری کی ایک خوب صورت جھلک فلم 'آلاپ' میں بھی ملتی ہے۔ اس فلم کے گیت راہی معصوم رضا نے لکھے تھے۔ ان گیتوں میں ان کی شاعرانہ فکر، سادگی، احساس اور موسیقیت نمایاں ہے۔ افسوس کہ فلم کو وہ کامیابی نہیں مل سکی جس کی اس کے فنکاروں کو توقع تھی، اور نغمہ نگاری کے میدان میں راہی کو زیادہ مواقع بھی حاصل نہ ہوئے۔

فلم 'آلاپ' کے حوالے سے میری معروف موسیقار ''جے دیو'' سے ہونے والی ملاقات بھی یاد آتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ فلم کی کامیابی یا ناکامی کا اثر پوری ٹیم پر پڑتا ہے، مگر موسیقار اور نغمہ نگار اکثر اس کا زیادہ بوجھ اٹھاتے ہیں۔ ان کے مطابق 'آلاپ' کی کہانی اور اسکرپٹ میں صلاحیت تھی اور فلم میں امیتابھ بچن، ریکھا اور اسرانی جیسے فنکار بھی موجود تھے، مگر مجموعی طور پر فلم وہ اثر پیدا نہ کر سکی جس کی توقع تھی۔

جے دیو صاحب راہی کے ساتھ گیتوں پر تفصیل سے گفتگو کرتے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ راہی کی شاعری اور ان کی موسیقی ایک خوب صورت امتزاج پیدا کرے گی۔ فلم کی ناکامی کے بعد وہ امکان پوری طرح سامنے نہ آ سکا۔

'آلاپ' کے لیے راہی کے لکھے ہوئے گیتوں میں 'چاند اکیلا جائے سکھی ری'، 'آئی رت ساون کی'، 'کاہے منوا ناچے'، 'زندگی کو سنوارنا ہوگا' اور دوسرے نغمے شامل تھے۔ ان گیتوں کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر راہی کو نغمہ نگاری میں مسلسل مواقع ملتے تو شاید ہندستانی فلمی شاعری میں ان کا ایک الگ مقام بنتا۔

قسمت کبھی کبھی کسی فنکار کی صلاحیت کو ایک خاص راستے تک محدود کر دیتی ہے۔ راہی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ نغمہ نگار ان کے اندر موجود تھا، مگر مکالمہ نگار راہی نے اتنی بڑی کامیابی حاصل کی کہ ان کی دوسری صلاحیتیں پس منظر میں چلی گئیں۔

ٹیلی ویژن کے میدان میں 'نیم کا پیڑ' بھی ان کے اہم کاموں میں شمار ہوتا ہے۔ اس میں دیہی ہندوستان، سماجی ناہمواری، سیاسی کشمکش، جاگیردارانہ ذہنیت اور عام آدمی کی زندگی کو موضوع بنایا گیا۔ پنکج کپور نے بدھئی رام کے کردار کو یادگار انداز میں ادا کیا۔ یہ سیریل اس ہندوستان کی تصویر پیش کرتا تھا جو بڑے شہروں کی چکا چوند سے دور گاؤں کی پگڈنڈیوں، کچے گھروں، غربت، سیاسی مفادات اور عام انسان کی چھوٹی چھوٹی امیدوں میں سانس لیتا تھا۔

'نیم کا پیڑ' میں بھی راہی کی زبان سب سے نمایاں قوت بن کر سامنے آتی ہے۔ ان کے مکالموں میں مٹی کی خوشبو، زندگی کا تجربہ اور سماجی شعور ایک ساتھ موجود ہے۔ اسی سیریل کا ٹائٹل گیت بھی اپنی جگہ یادگار رہا، جس کے بول ندا فاضلی نے لکھے اور جگجیت سنگھ نے آواز دی۔

من کی بات سنے ہر کوئی، دل کے درد کو جانے کون
آوازوں کے بازاروں میں خاموشی پہچانے کون

یہ اشعار بھی راہی کی تخلیقی دنیا سے ایک معنوی رشتہ قائم کرتے محسوس ہوتے ہیں — وہ دنیا جہاں انسان بولتا بہت ہے، مگر اس کے دل کی اصل آواز سننے والا کم ہوتا ہے۔

راہی معصوم رضا کی سب سے بڑی ادبی خصوصیت شاید یہی تھی کہ وہ بڑے موضوعات کو عام انسان کی زندگی سے جوڑ دیتے تھے۔ ان کے ہاں گاؤں صرف گاؤں نہیں، پورے ہندوستان کی علامت بن جاتا ہے؛ چاند صرف چاند نہیں رہتا، وطن کی یاد بن جاتا ہے؛ مکالمہ صرف فلمی جملہ نہیں رہتا، کردار کی داخلی آواز بن جاتا ہے؛ اور 'مہابھارت' صرف ایک رزمیہ نہیں رہتی، انسانی تقدیر اور اخلاقی کشمکش کی کائناتی داستان بن جاتی ہے۔ وہ ان ادیبوں میں سے تھے جنھوں نے اپنی شناخت کو کسی ایک خانے میں بند نہیں ہونے دیا۔ شاعر تھے تو ناول نگار بھی؛ ناول نگار تھے تو مکالمہ نگار بھی؛ مکالمہ نگار تھے تو نغمہ نگار بھی۔ مگر ان تمام شناختوں کے پیچھے ایک ہی بنیادی شخصیت تھی — ایک ایسا انسان جو اپنی مٹی، اپنی زبان اور اپنے عہد سے گہرا رشتہ رکھتا تھا۔ ان کے فن میں گنگا جمنی تہذیب کی روح موجود تھی۔ وہ تقسیم کے زخموں کو جانتے تھے مگر نفرت کے ترجمان نہیں بنے۔ انھوں نے اختلاف کے باوجود انسان کو مرکز میں رکھا۔ ان کا ادب ہمیں یہ احساس دلاتا ہے کہ تہذیبیں دیواروں سے نہیں بنتیں، میل جول سے بنتی ہیں: زبانیں ایک دوسرے سے لڑتی نہیں، ایک دوسرے کو مالا مال کرتی ہیں؛ اور فنکار کی اصل شناخت اس کی مذہبی یا سماجی شناخت سے کہیں وسیع ہوتی ہے۔ راہی معصوم رضا کا قلم اسی وسیع انسانی شناخت کا قلم تھا۔

آج جب ان کے ناول پڑھے جاتے ہیں، ان کے مکالمے سنے جاتے ہیں یا 'مہابھارت' کے کرداروں کی زبان میں ان کے الفاظ دوبارہ سنائی دیتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ راہی صرف اپنے زمانے کے آدمی نہیں تھے۔ انھوں نے اپنے عہد کی آواز کو اس طرح محفوظ کیا کہ وہ آنے والے زمانوں تک پہنچ گئی۔

ان کی عظمت کا اعتراف صرف اس بات میں نہیں کہ انھوں نے کتنی کتابیں لکھیں یا کتنی فلموں کے لیے مکالمے تحریر کیے۔ اصل عظمت یہ ہے کہ انھوں نے مختلف فنون کے درمیان ایک ایسا پل قائم کیا جس پر ادب، سنیما، ٹیلی ویژن، شاعری اور ہندستانی تہذیب ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔

راہی معصوم رضا نے ادب کو پردۂ سیمیں تک پہنچایا اور پردۂ سیمیں کو ادب کی گہرائی عطا کی۔ انھوں نے ثابت کیا کہ اچھا مکالمہ بھی شعر کی طرح دل میں اتر سکتا ہے، ایک ناول بھی تاریخ کی طرح کسی عہد کو محفوظ کر سکتا ہے اور ایک ٹیلی ویژن سیریل بھی پورے ملک کے اجتماعی حافظے کا حصہ بن سکتا ہے۔

وہ چلے گئے، مگر ان کے لفظ باقی ہیں۔

■

Sadre Alam Gauhar
At+Po-Pursaulia
Distt-Madhubani- 847226 (Bihar)
Mob.: 7715980144
Email: gauhersadre@gmail.com

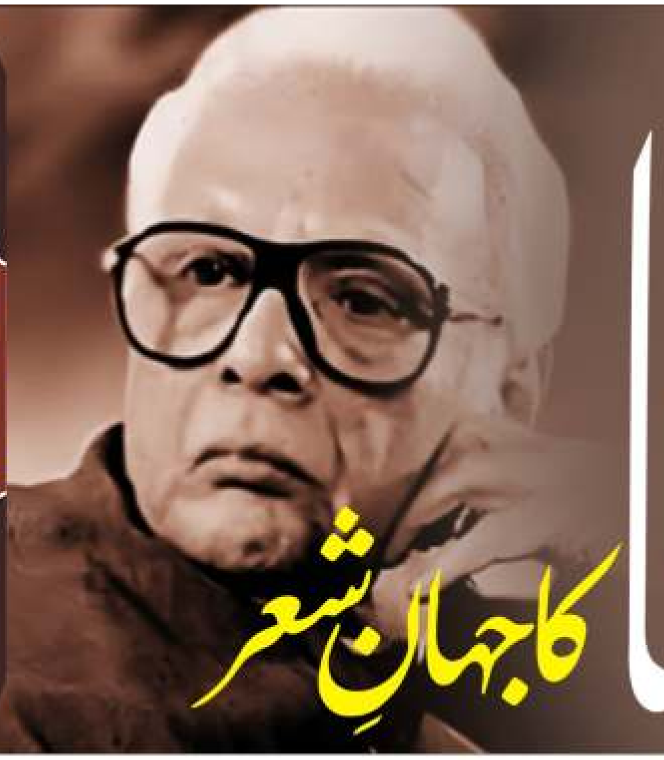

راہی معصوم رضا کا جہانِ شعر

مظفر حسین غزالی

اردو

ادب کی تاریخ میں بعض شخصیات ایسی گزری ہیں جنھیں کسی ایک صنف، زبان یا فکری دبستان کے حوالے سے بیان کرنا ان کے تخلیقی وجود کے ساتھ ناانصافی معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر راہی معصوم رضا ایسی ہی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ شاعر تھے، ناول نگار تھے، محقق اور استاد تھے، فلمی کہانی اور مکالمہ نگار تھے اور سب سے بڑھ کر ایسے حساس فنکار تھے جنھوں نے ہندوستانی معاشرے کی تہذیبی، سماجی، سیاسی اور تاریخی پیچیدگیوں کو نہایت گہرائی سے محسوس کیا۔

ان کے تخلیقی شعور کی تشکیل میں مشرقی اتر پردیس کا گنگا کنارے آباد دیہی معاشرہ، گنگا جمنی تہذیب، تقسیم ہند کا المیہ، ہندو مسلم تعلقات، جاگیردارانہ نظام، ذات پات، طبقاتی کشمکش، انسانی محبت، مذہبی رواداری، سیاسی جبر اور جدید انسان کی تنہائی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے ادب کے موضوعات الگ الگ جزیرے نہیں بلکہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تجربات ہیں۔ یہی ربط ان کے فن کو ادبی اظہار سے بلند کر کے ایک تہذیبی دستاویز بنا دیتا ہے۔

راہی معصوم رضا یکم ستمبر 1927 کو غازی پور کے گنگولی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ گنگولی کی مٹی، وہاں کی بول چال، ہندو مسلم معاشرت، لوک روایتیں، رسم و رواج، تہوار، خاندانوں کے باہمی رشتے اور عام لوگوں کی روزمرہ زندگی ان کی تخلیقی شخصیت کے بنیادی عناصر بنے۔ بعد میں جب وہ شہر اور پھر ممبئی پہنچے تو بھی ان کے اندر کا گنگولی ان کے ساتھ رہا۔

راہی معصوم رضا کے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے ہوا۔ شاعری ان کی تخلیقی شخصیت کی بنیاد تھی۔ بعد میں ناول نگاری نے انھیں وسیع ادبی شہرت دی اور فلم و ٹیلی ویژن نے ان کی آواز کو عام ناظرین تک پہنچایا، لیکن شاعر راہی ان کی تمام تخلیقی سرگرمیوں کے اندر کہیں نہ کہیں موجود رہا۔

ان کی شاعری میں محبت، تنہائی، ہجرت، یاد، سماجی اضطراب، سیاسی شعور، آزادی پسندی، خودداری اور انسان دوستی کے جذبات نمایاں ہیں۔ ان کا شعری مزاج کلاسیکی روایت سے رشتہ رکھتے ہوئے بھی اپنے عہد کے مسائل سے آنکھ نہیں چراتا۔ وہ روایت کو دہراتے نہیں بلکہ اسے نئے تجربے میں ڈھالتے ہیں۔

1952 میں ان کا پہلا شعری مجموعہ نیا سال شائع ہوا۔ اس کے بعد موجِ گل موجِ صبا، رقصِ مے، اٹھارہ سو ستاون، اجنبی شہر، اجنبی راستے اور غریب شہر جیسے مجموعوں نے ان کے مسلسل شعری سفر کی گواہی دی۔ ان کی ہندی شاعری کا مجموعہ ایک پھیری والا بھی ان کی لسانی اور تخلیقی وسعت کا اہم ثبوت ہے۔

راہی کی شاعری کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ذاتی تجربہ رفتہ رفتہ اجتماعی تجربے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ شاعر کی اپنی تنہائی صرف اس کی تنہائی نہیں رہتی، وہ جدید انسان کی تنہائی بن جاتی ہے۔ ہجرت صرف شاعر کا وطن چھوڑنا نہیں رہتی، وہ لاکھوں بچھڑے ہوئے لوگوں کا کرب بن جاتی ہے۔ یاد صرف کسی ایک شخص کی یاد نہیں رہتی، وہ پوری تہذیبی دنیا کی یاد بن جاتی ہے۔ راہی کی معروف غزل کا مطلع ہے۔

اجنبی شہر کے اجنبی راستے
میری تنہائی پر مسکراتے رہے
میں بہت دیر تک یونہی چلتا رہا
تم بہت دیر تک یاد آتے رہے

یہاں ''شہر'' اور ''راستے'' صرف خارجی منظرنامے نہیں بلکہ شاعر کی داخلی کیفیت کے استعارے ہیں۔ ''اجنبی شہر'' جدید شہری زندگی کا وہ ماحول ہے جہاں انسان لوگوں کے ہجوم میں رہ کر بھی اپنے آپ کو بے گھر محسوس کرتا ہے۔ اس کے مقابل ''یاد'' ایک ایسا داخلی گھر ہے جہاں شاعر بار بار واپس جاتا ہے۔

''میری تنہائی پر مسکراتے رہے'' میں راہی نے راستوں کو انسانی صفت عطا کر دی ہے۔ یہ محض تشخیص نہیں بلکہ ایک پورا نفسیاتی منظر ہے۔ گویا شہر شاعر کی تنہائی سے واقف ہے مگر اسے سہارا دینے کے بجائے اس کی اجنبیت پر مسکراتا ہے۔ یہ مسکراہٹ دراصل شہر کی بے حسی کی علامت بن جاتی ہے۔

دوسرے شعر میں جسمانی سفر اور ذہنی سفر ایک دوسرے میں گھل جاتے ہیں۔ شاعر چلتا رہتا ہے، مگر اس کی یاد ایک جگہ ٹھہری رہتی ہے۔ ''بہت دیر تک'' کی تکرار وقت کو صرف طول نہیں دیتی بلکہ انتظار اور یاد کی شدت بھی بڑھاتی ہے۔ یوں چند سادہ الفاظ ایک ایسے انسان کی تصویر بنا دیتے ہیں جو راستے میں آگے بڑھ رہا ہے لیکن اپنے باطن میں پیچھے رہ گیا ہے۔ اسی غزل کے یہ اشعار راہی کے مزاحمتی شعور کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

زہر ملتا رہا، زہر پیتے رہے
روز مرتے رہے، روز جیتے رہے
زندگی بھی ہمیں آزماتی رہی
اور ہم بھی اسے آزماتے رہے

''زہر'' یہاں زندگی کی تلخیوں، محرومیوں اور مسلسل آزمائشوں کی علامت ہے۔ مگر شاعر زہر پینے کے باوجود زندگی سے دست بردار نہیں ہوتا۔ ''روز مرتے رہے، روز جیتے رہے'' میں انسانی زندگی کی ایک بنیادی حقیقت پوشیدہ ہے۔ انسان ہر دن کسی نہ کسی دکھ، محرومی یا شکست سے گزرتا ہے، مگر ہر نئی صبح کے ساتھ دوبارہ اٹھنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔

''زندگی بھی ہمیں آزماتی رہی'' کے ساتھ ''ہم بھی اسے آزماتے رہے'' ایک نہایت معنی خیز فکری تصور ہے۔ شاعر زندگی کا محض مظلوم کردار نہیں، وہ اس کا مقابل بھی ہے۔ حالات انسان کو آزماتے ہیں، لیکن انسان بھی اپنے حوصلے، ارادے اور تخلیقی قوت سے حالات کو آزمانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

راہی کی شاعری میں ہجرت، وطن سے دوری اور اپنے گزرے ہوئے ماحول کی یاد نہایت گہری ہے۔ یہ احساس ان کی شاعری میں جذباتی نوحہ نہیں بنتا بلکہ تہذیبی یادداشت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ان کے یہاں چاند بار بار ایک ایسی علامت کے طور پر آتا ہے جو دوریوں کے باوجود انسانوں کو ایک آسمان کے نیچے جوڑے رکھتا ہے۔

ہم تو ہیں پردیس میں، دیس میں نکلا ہوگا چاند
اپنی رات کی چھت پر کتنا تنہا ہوگا چاند

یہ شعر اپنی سادگی کے باوجود غیر معمولی تاثیر رکھتا ہے۔ شاعر پردیس میں ہے اور اس کے تصور میں اپنا دیس ہے۔ لیکن وہ براہ راست وطن کو یاد کرنے کے بجائے اپنے اور وطن کے درمیان ایک خاموش رشتہ قائم کرتا ہے۔ چاند دونوں جگہ موجود ہے۔ یہی ایک چاند شاعر کو اپنے گھر، اپنے لوگوں اور اپنے ماضی سے جوڑتا ہے۔ لیکن شاعر کی تنہائی اس چاند کو بھی تنہا بنا دیتی ہے یہ دراصل انسان کی نفسیات ہے کہ جب وہ خود تنہا ہوتا ہے تو فطرت کی ہر شے میں اپنا عکس دیکھنے لگتا ہے۔

جن آنکھوں میں کاجل بن کر تیری کالی رات
ان آنکھوں میں آنسو کا اک قطرہ ہوگا چاند

> ان کی شاعری میں محبت، تنہائی، ہجرت، یاد، سماجی اضطراب، سیاسی شعور، آزادی پسندی، خودداری اور انسان دوستی کے جذبات نمایاں ہیں۔ ان کا شعری مزاج کلاسیکی روایت سے رشتہ رکھتے ہوئے بھی اپنے عہد کے مسائل سے آنکھ نہیں چراتا۔ وہ روایت کو دہراتے نہیں بلکہ اسے نئے تجربے میں ڈھالتے ہیں۔

رات نے ایسا پیچ لگایا ٹوٹی ہاتھ سے ڈور
آنگن والے نیم میں جا کر اٹکا ہوگا چاند
چاند بنا ہر دن یوں بیتا جیسے یگ بیتے
میرے بنا کس حال میں ہوگا کیسا ہوگا چاند

اسی طرح راہی کی معروف غزل کا یہ مطلع دیکھئے۔

جن سے ہم چھوٹ گئے اب وہ جہاں کیسے ہیں
شاخِ گل کیسی ہے، خوشبو کے مکاں کیسے ہیں

یہاں ''جہاں'' کسی ایک جگہ کا نام نہیں بلکہ ایک مکمل تہذیبی دنیا ہے۔ ''شاخِ گل'' اور ''خوشبو کے مکاں'' ماضی کی جمالیاتی یاد کو مجسم کرتے ہیں۔ شاعر صرف لوگوں کو نہیں پوچھتا، وہ ان کے ماحول، ان کی خوشبو، ان کے موسم اور ان کے گھر تک کو یاد کرتا ہے۔

کہیں شبنم کے شگوفے، کہیں انگاروں کے پھول
آ کے دیکھو مری یادوں کے جہاں کیسے ہیں

اس شعر میں یاد کا پورا تضاد موجود ہے۔ شبنم اور انگارے، نرمی اور تپش، خوشی اور کرب——سب ایک ہی دنیا میں جمع ہو گئے ہیں۔ ماضی صرف خوشیوں کی تصویر نہیں، اس میں بچھڑنے کی آگ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راہی کی یاد محض جذباتی نوستالجیا نہیں بلکہ ایک پیچیدہ تہذیبی تجربہ بن جاتی ہے۔

راہی کی شاعری میں ''چراغ'' ایک بار بار آنے والی اور کثیر المعانی علامت ہے۔

دل میں یادوں کے چراغ جلتے ہیں
یا بہاروں میں باغ جلتے ہیں

چراغ یہاں روشنی سے زیادہ یاد کا استعارہ ہے۔ رات کی تاریکی میں ماضی زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔ جو لوگ یا لمحے دن کی مصروفیت میں پس منظر میں چلے جاتے ہیں، تنہائی کی رات میں وہ پوری شدت سے سامنے آجاتے ہیں۔

جگمگاتا ہے اور وہ چہرہ
رات میں جب چراغ جلتے ہیں

یہاں چراغ یاد کو روشن کرنے والی شے بن جاتا ہے۔ ایک خارجی روشنی باطن میں چھپی ہوئی ایک پرانی تصویر کو جگا دیتی ہے۔

لیکن راہی کا چراغ صرف یاد کا چراغ نہیں۔ وہ زندگی کا بھی چراغ ہے۔

موت کی روشنی بڑھانے کو
زندگی کے چراغ جلتے ہیں

یہاں زندگی اور موت کو ایک دوسرے کے مقابل نہیں بلکہ ایک ہی تسلسل کے دو مرحلوں کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ ایک چراغ بجھتا ہے، دوسرا جل اٹھتا ہے۔

ایک بجھتا ہے، اک سلگتا ہے
زیست کے یوں چراغ جلتے ہیں

یہ تصور راہی کی شاعری کو مایوسی سے بچاتا ہے۔ فرد فنا ہو سکتا ہے، لیکن زندگی کا سلسلہ باقی رہتا ہے۔

اور پھر۔

شعلہ شعلہ ہو دل اگر راہی
آندھیوں میں چراغ جلتے ہیں

یہ شعر ان کے پورے شعری فلسفے کا استعارہ معلوم ہوتا ہے۔ آندھی حالات کی سختی، جبر، ناامیدی اور شکست کی علامت ہے، جب کہ چراغ انسان کے اندر موجود حوصلے کی۔ شاعر کہتا ہے کہ روشنی کے لیے آندھی کا رکنا ضروری نہیں، اگر دل میں شعلہ موجود ہو تو آندھیوں میں بھی چراغ جل سکتے ہیں۔

راہی جب شہر کی زندگی کو دیکھتے ہیں تو انھیں اس کی ظاہری رونق کے پیچھے چھپی ہوئی روحانی اور ذہنی ویرانی بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے نزدیک شہر صرف عمارتوں اور سڑکوں کا نام نہیں، وہ ایسا معاشرہ ہے جہاں انسان لوگوں کے ہجوم میں بھی تنہا ہے۔ یہ کیفیت ان اشعار میں دکھائی دیتی ہے۔

ہم کیا جانیں قصہ کیا ہے، ہم ٹھہرے دیوانے لوگ
اس بستی کے بازاروں میں روز کہیں افسانے لوگ

یہاں ''دیوانے لوگ'' صرف عاشق نہیں بلکہ وہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو معاشرے کے ظاہری اصولوں سے مطمئن نہیں۔ بازار میں ہر روز افسانے بنتے ہیں، لیکن شاعر ان افسانوں کے پیچھے موجود اصل انسانی کہانی کو دیکھنا چاہتا ہے۔

یادوں سے بچنا مشکل ہے، ان کو کیسے سمجھائیں
ہجر کے اس صحرا تک ہم کو آتے ہیں سمجھانے لوگ

یہاں ''ہجر کا صحرا'' ایک وسیع داخلی تنہائی کا استعارہ ہے۔ دوسروں کی نصیحت اس درد کا علاج نہیں ہو سکتی جسے خود جھیلا نہ گیا ہو۔

اسی غزل میں۔

ہم تو دل کی ویرانی بھی دکھلاتے شرماتے ہیں
ہم کو دکھلانے آتے ہیں ذہنوں کے ویرانے لوگ

یہ شعر جدید معاشرتی زندگی پر ایک گہرا طنز ہے۔ دوسروں کی اصلاح، رہنمائی اور نصیحت کا دعویٰ کرنے والے لوگ خود اندر سے کتنے ویران ہیں، شاعر اس تضاد کو نہایت سادگی سے بے نقاب کرتا ہے۔ راہی کے طنز کی خوبی یہ ہے کہ وہ شور نہیں مچاتا، ایک خاموش مسکراہٹ کے ساتھ معاشرے کے اندر چھپے ہوئے تضاد کو نمایاں کر دیتا ہے۔

اس محفل میں پیاس کی عزت کرنے والا ہوگا کون
جس محفل میں توڑ رہے ہوں آنکھوں سے پیمانے لوگ

یہ شعر راہی کے شعری مزاج کی ایک اچھی مثال ہیں۔ ان کی شاعری میں مایوسی کے باوجود امید کا چراغ بجھنے نہیں پاتا۔ وہ بہتر مستقبل کے لیے مسلسل جدوجہد اور جستجو کو ضروری تصور کرتے ہیں۔

کہا ہے کس نے جہاں میں خدا نہیں ملتا
خلوص شرط ہے ڈھونڈو تو کیا نہیں ملتا
ہر ایک جسم کی تخلیق ایک جیسی ہے
ہر ایک چہرے سے کیوں دوسرا نہیں ملتا
کچھ ایسے موڑ بھی آئے وفا کی راہوں میں
جہاں سے آگے خود اپنا پتا نہیں ملتا
تمھارا عکس ہے محفوظ جس میں صدیوں سے
نہ جانے کیوں وہی اک آئنہ نہیں ملتا
ہم آ کے گاؤں سے پچھتائے شہر میں راہی
یہاں کسی کا بھی اصلی پتہ نہیں ملتا

راہی کی شاعری کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ گہرے دکھ اور سماجی اضطراب کے باوجود وہ زندگی سے بھاگنے کے بجائے اسے پوری شدت کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ وہ انسان کو بے عملی اور شکست خوردگی کی طرف لے جانے کے بجائے مسلسل سفر اور جدوجہد کا حوصلہ دیتے ہیں۔

منزل نہیں ہے پاس تو کیا رہ گزر تو ہے
اس دشت زندگی میں غبار سفر تو ہے

یہاں منزل کا نہ ملنا زندگی کی ناکامی نہیں۔ اصل بات سفر کا جاری رہنا ہے۔ ''غبار سفر'' اس بات کی علامت ہے کہ انسان نے کوشش کی، راستہ طے کیا اور زندگی کو جمود کے بجائے حرکت کے طور پر قبول کیا۔

دنیا اگر نظر بھی پھرا لے تو غم نہیں
میری نظر کے ساتھ تمہاری نظر تو ہے

یہاں ایک محبت بھری نظر پوری دنیا کی بے اعتنائی کا مقابل بن جاتی ہے۔ انسان کو ہمیشہ پوری دنیا کی تائید درکار نہیں؛ کبھی ایک مخلص نگاہ بھی زندگی کے لیے کافی ہوتی ہے۔

جینا ہی جب ہے ہم کو تو ہنس کے جئیں گے ہم
دولت نہیں ہے ہاتھ میں لیکن ہنر تو ہے

یہاں راہی کی خودداری اور زندگی سے مثبت وابستگی نمایاں ہے۔ دولت کی کمی کو شکست نہیں بنایا گیا؛ انسان کے پاس اگر صلاحیت، ہنر اور اپنی ذات پر اعتماد موجود ہے تو محرومی کے باوجود زندگی باوقار طریقے سے گزاری جا سکتی ہے۔

راہی مجھے سیاہی شب کیا ڈرائے گی
پہلو میں قلب بن کے نقیب سحر تو ہے

یہاں رات کے مقابل صبح کی امید ہے۔ ''نقیب سحر'' ایک نہایت خوب صورت استعارہ ہے۔ رات کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو، صبح کا امکان انسان کے باطن میں زندہ رہتا ہے۔

راہی کے یہاں عشق محض رومانی کیفیت نہیں بلکہ انسانی وقار اور آزادی سے وابستہ ایک تجربہ بھی ہے۔

اتنی سی بات کا اتنا بڑا افسانہ بنا
کوئی دیوانہ ہوا ہے، کوئی دیوانہ بنا

اس شعر میں محبت کے ساتھ انسانی رویوں کی طنزیہ تصویر موجود ہے۔ معمولی واقعات کس طرح معاشرتی گفتگو اور افسانہ سازی میں غیر معمولی شکل اختیار کر لیتے ہیں، شاعر اسے نہایت برجستگی سے بیان کرتا ہے۔

اجرت ہجر نہ مانگ اپنا گریبان نہ بیچ
عشق کرنا ہو تو کر عشق کو پیشہ نہ بنا

یہ شعر راہی کے تصور عشق کی اخلاقی بنیاد واضح کرتا ہے۔ عشق اگر سودا بن جائے تو اس کی روح باقی نہیں رہتی۔ شاعر محبت کو کسی صلے، معاوضے یا فائدے سے وابستہ نہیں دیکھنا چاہتا۔

اور غزل کا یہ شعر خودداری کی انتہائی بلند سطح کو پیش کرتا ہے۔

مکتب عشق کا یہ پہلا سبق ہے راہی
ہاتھ کٹوا لے مگر ہاتھ کو پیالہ نہ بنا

یہاں عشق زندگی کے وسیع تر اخلاقی تصور میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ شاعر انسان کو یہ درس دیتا ہے کہ حالات چاہے کتنے ہی سخت کیوں نہ ہوں، اپنی عزت اور خودداری کا سودا نہ کیا جائے۔ ''ہاتھ کٹوا لے'' ایک انتہائی شدت آمیز اظہار ہے، لیکن اس کے ذریعے شاعر خودداری کی اس حد کو بیان کرتا ہے جہاں انسان محرومی قبول کر سکتا ہے مگر ذلت نہیں۔

یوں راہی کی شاعری میں چار بنیادی دھارے مسلسل بہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، یاد اور ہجرت، تنہائی اور اجنبیت، مزاحمت اور خودداری، اور اندھیروں کے باوجود بہتر مستقبل کی امید۔ یہی عناصر ان کی نثر میں زیادہ وسیع سماجی اور تاریخی صورت اختیار کرتے ہیں۔

■

Dr. Muzaffar Husain Ghazali
F-18/14 A, Abul Fazal Enclave, Part-II
Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla
New Delhi- 110025
Mob.: 9810371907
Email: drmhghazali@gmail.com

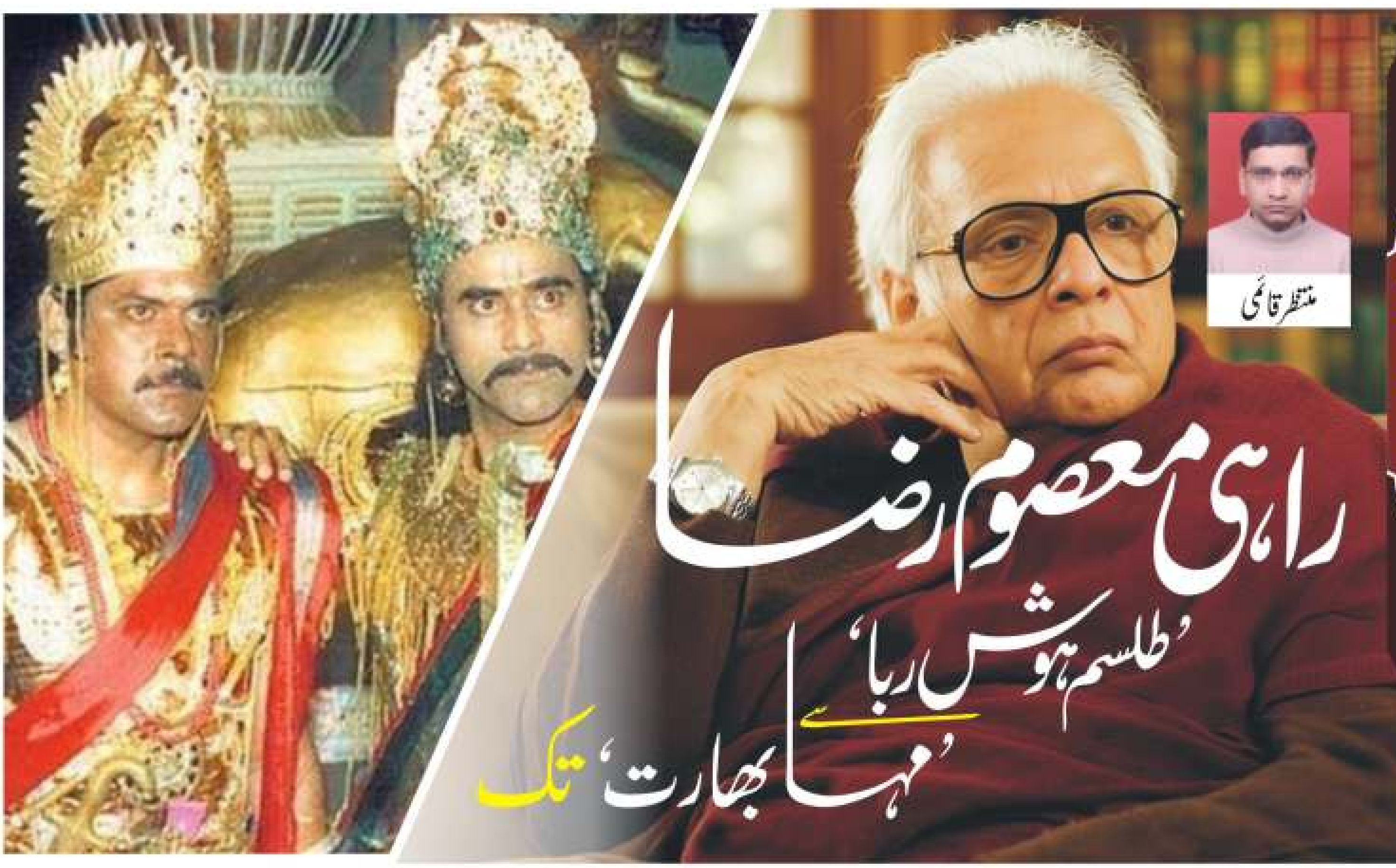

منتظر قاسمی

راہی معصوم رضا

'طلسم ہوش ربا' سے 'مہابھارت' تک

معروف مکالمہ نگار، اسکرپٹ رائٹر، شاعر اور ادیب ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے اپنی خودنوشت میں ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ میں تین ماؤں کا بیٹا ہوں نفیسہ بیگم، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور گنگا۔ راہی کی شخصیت، فکر، فن اور نظریے کی تعمیر و تشکیل میں ان تینوں ماؤں کا بہت اہم رول رہا ہے۔ نفیسہ بیگم کی آغوش میں راہی نے آنکھیں کھولیں تو گنگا کی لہروں کی انگلیاں پکڑ کر ریت پر چلنا اور فکر و فن کے دریا کو عبور کرنا سیکھا۔ گنگا کے ساحل کی مٹی کو اپنے جسم پر ایسا ملا کہ اس کی خوشبو تاعمر ان کے بدن سے لپٹی رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تمام تر تخلیقات میں گنگا کے پانی کی روانی، وسعت اور پاکیزگی نظر آتی ہے۔ علی گڑھ کی علمی و ادبی فضاؤں نے راہی کو نئی زمین اور نئے آسمان کا پتہ دیا۔

ڈاکٹر سید معصوم رضا عابدی المعروف بہ راہی معصوم رضا نے مشرقی اتر پردیش کے ایک مردم خیز ضلع غازی پور کے ایک بڑے ہی باوقار علمی، ادبی اور زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید بشیر حسن عابدی اپنے وقت کے نامی گرامی وکلاء میں سے ایک تھے۔ بچپن میں راہی بڑے ہی مذہبی اور دیندار تھے مگر جب ہوش سنبھالا تو غازی پور اور گنگولی میں پھیلی ہوئی غربت و افلاس، کسانوں اور مزدوروں کی بے بسی، لاچاری اور بدحالی نے راہی کو چین سے بیٹھنے نہیں دیا پھر انھوں نے استحصال شدہ طبقے کی آواز بن کر ان کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنا شروع کر دیا۔ راہی اوائل عمری میں مارکسزم پر جو ایمان لے آئے تو تاعمر اسی مسلک پر قائم رہے۔ آغاز جوانی میں مساوات کا ایسا بھوت چڑھا کہ راہی نے اپنی اشرافیہ شناخت کی فخریہ پُڑکی میں سے سید اور عابدی کا سابقہ اور لاحقہ ہی کتر ڈالا تاکہ وہ ایک عام آدمی جیسے لگ سکیں۔ راہی مزاجاً تھوڑا ضدی اور اپنی بات پر اڑ جانے والے انسان تھے اور ایک بار جو ٹھان لیتے تھے اس کو منزل تکمیل تک پہنچا کر ہی دم لیتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ غازی پور نگر پالیکا کے انتخاب کے دوران راہی کے والد کے مقابلے میں ایک مقامی کمیونسٹ لیڈر ربّر رام امیدوار ہوگیا ایسے نازک وقت میں جب راہی کے سامنے اپنے باپ اور کمیونسٹ لیڈر میں سے کسی ایک کا انتخاب اور اس کی حمایت کا سوال پیدا ہوا تو راہی نے اس کمیونسٹ لیڈر کو نہ صرف یہ کہ ووٹ دیا بلکہ اس کی بھرپور حمایت کی اور وہ لیڈر الیکشن میں کامیاب بھی ہوا۔ ڈاکٹر راہی معصوم رضا کے بہت قریبی دوست کنور پال سنگھ ان کی شخصیت، ادبی اور نظریاتی میلان پر یوں تبصرہ کرتے ہیں۔

''راہی کی زندگی جن مشکلات میں گزری، انھوں نے سماج میں جو تضادات دیکھے، ان سبھی کو انھوں نے ایک عام آدمی کی طرح نظرانداز نہیں کیا بلکہ یہ سبھی برائیاں ان کے دل میں چبھتی رہیں۔ راہی غلط کام کو دیکھ کر خاموش بیٹھنے والوں میں سے نہیں تھے۔ ممبئی جا کر انھوں نے عوام الناس میں پھیلے ان تنازعات کو فلم کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی، انھوں نے سماج میں جو برائی دیکھی اسے وہیں تحریری شکل دے کر اس پر طنز کیا۔ ان کی ذاتی زندگی میں جن لوگوں کی وجہ سے مشکلات پیدا ہوئیں ان مشکلات کو کھلے ذہن سے اپنی تحریروں سے ذریعہ اظہار عطا کیا۔''

راہی انسانیت کو مذہب، نسل، ذات، فرقہ اور طبقات میں منقسم نہیں دیکھنا چاہتے کیونکہ انھوں نے اپنی فکر اور شعور کے ذریعہ انسانیت کی وہ معرفت حاصل کر لی تھی جہاں سب کے دکھ سکھ، خوشی غم اور درد مشترک ہوتے ہیں جن کا کوئی مذہب، فرقہ، نسل اور کوئی ذات نہیں ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ اپنی بیشتر تخلیقات میں ہمیشہ ہی فرقہ پرستی کے مکر و فریب، چال بازی اور زہرافشانی کو اجاگر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ 'آدھا گاؤں'، 'ٹوپی شکلا'، 'کٹرہ بی آرزو'، 'اوس کی بوند'، 'سین 75' اور 'ہمت جونپوری' جیسے ناولوں میں راہی ہندوستانیت، قومیت، وطنیت، سیکولرزم کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔ وہ تمام قسم کی سیاسی مصلحت کوشی اور خودغرضی کی سخت مخالفت کرتے ہیں جو سماج کو مذہب، فرقہ، زبان اور علاقائیت کے نام سے استحصال کرتے ہیں۔ راہی تاعمر سیکولرزم، مساوات،

امن، رواداری، بھائی چارہ اور انسان دوستی کے پیروکار رہے اور فرقہ پرستی کو وہ ایک سانپ سے تعبیر کرتے ہیں جو کہ سیاست کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔ ان کے تمام ناول خواہ وہ 'آدھا گاؤں'، 'ٹوپی شکلا'، 'ہمت جونپوری'، 'اوس کی بوند'، 'کٹرہ بی آرزو'، 'دل ایک سادہ کاغذ'، 'محبت کے سوا' اور 'نیم کا پیڑ' تک میں جگہ جگہ فرقہ پرستی پر زور دار حملہ کیا ہے۔ ملک میں پھیلی ہوئی فرقہ پرستی کے لیے وہ انگریزوں کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ انگریزوں کا پھوٹ ڈالو اور راج کرو والا نسخہ اتنا کیمیا ثابت ہوا ہے کہ انگریزوں کے ہندوستان چھوڑ کے چلے جانے کے بعد بھی جہاں ان کی اور تمام چیزوں کو اپنایا گیا وہیں اس نسخہ کیمیا کو سیاسی پارٹیوں نے خوب استعمال کیا۔ راہی کا کہنا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے بٹوارے کی بنیاد اسی دن پڑ گئی جب فورٹ ولیم کالج میں اردو اور ہندی زبان کے لیے علاحدہ علاحدہ شعبہ قائم کیا گیا۔

راہی نے اپنی تخلیقات میں یہاں کی مٹی، رنگ، موسم، ادب، تہذیب اور ثقافت سب میں ایک ایسی دنیا کا خواب دیکھا جہاں انسان کو اس کے مذہب، ذات، رنگ، نسل میں تقسیم کر کے نہ دیکھا جائے بلکہ اسے ایک ہندوستانی کے بطور دیکھا جائے۔ 'دل ایک سادہ کاغذ' میں راہی معصوم رضا نے سوانحی انداز اختیار کیا ہے جہاں اپنی زندگی سے وابستہ کہانیوں کو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری سے لے کر ناول تک کے غالب موضوعات تقسیم وطن، ہندو مسلم فساد، فرقہ پرستی، تنگ نظری کی سیاست، طبقاتی کشمکش، دنگے فساد اور بلوے وغیرہ رہے ہیں۔ انھوں نے ایک ادیب کے طور پر نہ صرف یہ کہ ان کے مضر اور منفی اثرات کو قاری پر عیاں کیا ہے بلکہ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھ کر قارئین کو ان سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں حب الوطنی رواداری، بھائی چارا اور امن و امان کے قصیدے اور گیت گائے گئے ہیں۔ '1857' کے رزمیہ میں وہ ہندوستان کی اول جنگ آزادی کے گیت گاتے ہوئے غدر کے ہنگاموں کو ایک نئے تناظر میں ایک نظم 'طوفان سے پہلے' میں ایک ایسی جنگ کا نقشہ کھینچتے ہیں جس میں ہر مذہب، ذات، نسل، عقیدے اور مسلک کے لوگ باہم مل کر اور اپنے تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اس جنگ میں شریک ہوئے۔ اس کی منظر کشی کچھ اس ڈھنگ سے کرتے ہیں۔

کہیں ابرو پہ ہیں محراب عبادت کے شکن
کہیں منبر کی زباں پر ہیں بغاوت کے سخن
کہیں آوازِ اذاں میں ہے وہ پیغامِ دہل
سُن کے جن کو صفِ اعدا میں پڑی ہے ہلچل
کہیں میناروں پہ دشمن کے لیے واریں ہیں
کہیں تکبیر میں تلوار کی جھنکاریں ہیں

غدر کے ہنگاموں کو یاد کرنا کہیں بے وقت کی راگنی تو نہیں ہے اس سوال کا جواب راہی بہت ہی مدلل انداز میں دیتے ہیں۔ انھوں نے اس کا جواب یوں دیا ہے کہ ہم اگرچہ غدر کی لڑائی ہار گئے تھے مگر اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ ہم جنگ ہار گئے۔

ہر چند کہ شاعری یا تخلیق کو انسان کے وجدان یا جذبات کی ترنگ یا شعور کی رو کا نام دیا جاتا ہے جسے وہ ایک مخصوص ذہنی اور جذباتی کیفیت کے زیر اثر تحریر کرتا ہے۔ راہی کا کہنا ہے کہ شاعر یا ادیب جو کچھ بھی تحریر یا تخلیق کرتا ہے وہ شعور کے عالم میں اور بہت سوچ سمجھ کر تخلیقی اظہار کرتا ہے وہ لاشعوری، بیہوشی یا نیم ہوشی کی کیفیت میں کچھ بھی تحریر نہیں کرتا ہے۔ وہ اپنی ایک شعری تخلیق کے مجموعے '1857' کے دیباچے میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

''شاعری کی بنیاد شعور پر ہے لاشعور پر نہیں۔ وجدان، شاعرانہ لہر اور اس قسم کی دوسری اصطلاحیں گمراہ کن ہیں اور انھیں وہی شعرا استعمال کرتے ہیں جو اپنے محرکات سے واقف نہیں ہوتے۔ یا جو اپنے محرکات کی نشاندہی سے گھبراتے ہیں''۔

معروف ناقد اور دانشور پروفیسر احتشام حسین کہتے ہیں کہ شاعر یا ادیب کبھی بھی غیر جانبدار نہیں ہو سکتا ہے وہ ہمیشہ جانبدار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے جب تک وہ جانبدار نہیں ہوگا اس وقت تک کسی مجبور، مظلوم، محصور، مقہور، ستم رسیدہ کی یا استحصال ہونے والے کے حق میں یا حمایت میں آواز کیسے اٹھا سکتا ہے۔ راہی کے خیالات بھی اسی نوعیت کے ہیں وہ جانبداری کے سوال پر کہتے ہیں کہ 'میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ شاعر کو غیر جانبدار ہونا چاہیے۔ غیر جانبداری کا مطالبہ اصل میں فرار کی ایک شکل ہے کوئی زندگی کے معاملات میں غیر جانب دار کیسے ہو سکتا ہے اور کوئی گرد و پیش کے معاملات میں بے نیاز کیسے ہو سکتا ہے۔ بے حس، احمق اور پاگل ضرور غیر جانبدار بھی ہو سکتے ہیں اور بے نیاز بھی۔ لیکن شاعر نہ تو بے حس ہوتا ہے نہ پاگل اور نہ ہی احمق۔ وہ تو ایک قسم کا دیوانہ بھی نہیں ہوتا ہے۔'

راهی نے اپنی تخلیقات میں یہاں کی مٹی، رنگ، موسم، ادب، تہذیب اور ثقافت سب میں ایک ایسی دنیا کا خواب دیکھا جہاں انسان کو اس کے مذہب، ذات، رنگ، نسل میں تقسیم کر کے نہ دیکھا جائے بلکہ اسے ایک ہندوستانی کے بطور دیکھا جائے۔ 'دل ایک سادہ کاغذ' میں راہی معصوم رضا نے سوانحی انداز اختیار کیا ہے جہاں اپنی زندگی سے وابستہ کہانیوں کو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری سے لے کر ناول تک کے غالب موضوعات تقسیم وطن، ہندو مسلم فساد، فرقہ پرستی، تنگ نظری کی سیاست، طبقاتی کشمکش، دنگے فساد اور بلوے وغیرہ رہے ہیں۔

ہماری قدیم تہذیب و ثقافت اور تاریخ پر راہی معصوم رضا کی نگاہ بہت گہری ہے وہ ہماری تاریخ و تہذیب سے فقط فیضان اور سبق ہی حاصل نہیں کرتے ہیں بلکہ وہ ہماری قدیم تاریخ اور تہذیب کو ہم عصر موضوع اور مسائل میں تلاش کرتے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زمانے میں تحقیق کے لیے جس موضوع کا راہی نے انتخاب کیا اس سے بھی

راہی کی تاریخی اور ثقافتی سمجھ کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ 'طلسم ہوش ربا: ایک مطالعہ' جیسے بہت ہی آزمائشی موضوع پر انھوں نے اپنا تحقیقی مقالہ لکھا۔ داستان سرائی، داستان گوئی اور داستان نویسی کی روایت بہت قدیم ہے جس کی ایک کڑی 'طلسم ہوش ربا' بھی ہے۔ الف لیلیٰ، قصۂ چہار درویش، داستانِ امیر حمزہ اور طلسم ہوش ربا جیسی داستانوں کو وہ ہماری ادبی اور تہذیبی میراث قرار دیتے ہیں خواہ وہ نظم میں لکھی گئی ہو یا نثر میں۔ ان تمام داستانوں میں ہندوستان کی قدیم تہذیب و ثقافت اور قدیم تاریخ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ راہی کا کہنا ہے کہ گیان چند جین سے لے کر وقار عظیم تک کے داستانی شناوروں نے اس کے ماخذ اور منبع، اصل نقل یا عربی فارسی پر ہی اپنی تحقیق و جستجو مرکوز رکھی ہے جب کہ راہی معصوم رضا کا اس داستان کی ہندوستانیت پر زور ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو زبان کے اوپر جو ایک قسم کی غیر ملکی زبان ہونے کا بہتان لگایا جاتا ہے اس کا سدِ باب انہی داستانوں کے ذریعہ ممکن ہے۔ اردو زبان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ زبان عربی اور فارسی کی طرف دیکھتی ہے جب کہ اس زبان کے قواعد ہندی اور سنسکرت قواعد سے ماخوذ ہیں۔ اس زبان کے حروف میں کچھ ایسے صوتی حروف شامل کیے گئے ہیں جو عربی اور فارسی میں نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر جھ، چھ، پھ بھ جیسے صوت۔ اس لیے جب وہ ان داستانوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی توجہ کہانی کے ماخذ، اصل، نقل، فارسی، عربی، دیومالائی، اساطیری، افسانوی غیر افسانوی جیسے نقطوں کی طرف نہیں رہتی ہے بلکہ وہ اس کی ہندوستانیت پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ اس مطالعہ اور ادبی مشاہدے میں وہ اپنے سے پیشتر کئی ادیبوں اور ناقدوں کے نظریات اور خیالات سے انحراف اور اجتناب کرتے ہیں جس کے متعلق وہ 'طلسم ہوش ربا' کے دیباچہ میں ایک مقام پر کہتے ہیں کہ:

''اس مطالعہ میں جس ہندوستان کا مطالعہ کیا جارہا ہے یہ وہی ہندوستان ہے جس کے بادشاہ واجد علی شاہ تھے۔ اور واجد علی شاہ کا 'ہندوستان' ایسا گیا گزرا نہیں تھا جیسا کہ حسن عسکری اور عزیز احمد نے سمجھ لیا ہے۔ یہ کوشل دیش بہت پرانا ہے۔ شراوستی اور ایودھیا کی کہانیاں صدیوں سے آنکھیں ملاتی ہیں۔ رام چند سے واجد علی شاہ تک زندگی کی ایک طویل داستان پھیلی ہوئی ہے اور تہذیب کی کوئی اتنی بڑی عمارت صرف منفی قدروں کی بنیاد پر تعمیر نہیں ہو سکتی۔ حسن عسکری اور عزیز احمد لکھنؤ کو طوائفوں کی بستی سمجھتے ہیں اس لیے انھوں نے طلسم کی شہزادیوں کو بھی طوائف کہا ہے اور اس بات کو نظر انداز کردیا ہے کہ اودھ کے حافظے میں سیتا سے لے کر بیگم حضرت محل تک کی کہانیاں محفوظ ہیں۔''

> اردو زبان کے اوپر جو ایک قسم کی غیر ملکی زبان ہونے کا بہتان لگایا جاتا ہے اس کا سدِ باب انہی داستانوں کے ذریعہ ممکن ہے۔ اردو زبان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ زبان عربی اور فارسی کی طرف دیکھتی ہے جب کہ اس زبان کے قواعد ہندی اور سنسکرت قواعد سے ماخوذ ہیں۔ اس زبان کے حروف میں کچھ ایسے صوتی حروف شامل کیے گئے ہیں جو عربی اور فارسی میں نہیں ہیں۔

داستان میں وہ اس بات پر اپنا زور صرف کرتے ہیں کہ ان کی جائے وقوع کیا ہے جس سے ان داستانوں کا افسانوی محلِ وقوع دریافت کیا جاسکے اور یہ بتایا جا سکے کہ ہماری ادبی اور تہذیبی جڑیں کہاں کہاں پیوست ہیں۔ راہی انہی داستانوں کے محلِ وقوع کے ذریعہ اس قدیم ہندوستان کو دریافت کرتے ہیں جس کی تاریخ ہزاروں سال کی ہے۔ جس طرح مرثیہ لکھنؤ کے زوال کے دنوں میں اپنے عروج پر تھا اسی طرح 'طلسم ہوش ربا' بھی لکھنوی تہذیب کے زوال کے ایام کی تخلیق ہے۔ وہ جس تاریخ اور تہذیب کی بات کرتے ہیں اس میں جہاں ایک طرف کاشی، شراوستی اور ایودھیا بستے ہیں وہیں دہلی، لکھنؤ، آگرہ بھی موجود ہیں۔ اس کی آبیاری بدھ مذہب کے عہد میں ہوئی جب یہ کوشل دیس کے نام سے دنیا میں مشہور تھا۔ انھوں نے اس نقطہ کی بھی وضاحت کی ہے کہ قدیم عہد میں شہر کو ہی ملک تصور کیا جاتا تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان داستانوں میں نیشنلزم کا تصور آج کے نیشنلزم کے تصور سے میل نہیں کھاتا ہے اور نہ ان سے یہ تقاضہ ہی کیا جاسکتا ہے۔ طلسم ہوش ربا میں ہندوستان خطہ اودھ تک محدود تھا باقی گجرات، مالوہ، دکن، کشمیر اور بنگال ملک کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ہم داستان گویوں کی زبانی سنتے ہیں کہ افراسیاب 60,000 ملکوں کا بادشاہ تھا۔ انھوں نے اپنے تحقیقی مطالعہ میں اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ طلسم ہوش ربا میں مقامات، دریا، پہاڑ، باغ، جھیل، تالاب اور نہروں کو دیکھ کر یہی لگتا ہے کہ داستان گویوں یا داستان نویسوں نے ایسی بہت سی جگہوں اور مقامات کا نقشہ کھینچا ہے جس کے سہارے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ اپنی فطرت، ماحول اور موسم کے لحاظ سے ہندوستان اور اس کے قریب کے ممالک ہو سکتے ہیں۔ اس میں چین، عرب، شام، ایران، عراق، مصر اور روم جیسے ممالک کا ذکر ملتا ہے اور اسی کے ساتھ سنگل دیپ اور سرن دیپ بھی مل جاتے ہیں جو کہ سری لنکا سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ راہی یہ بات کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ایسی تمام بحثیں اور بہتان بے بنیاد ہو جاتے ہیں کہ ان تخلیقات کے ماخذ کیا ہیں، تراجم کیا ہیں، اصل ہیں یا نقل اور فارسی ہیں یا عربی بلکہ اس کو داستان گویوں نے جس ہندوستان کے روایتی، ثقافتی، اساطیری اور تاریخی قالب میں ڈھال کر پیش کیا ہے وہ میرے نزدیک زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ راہی کہتے ہیں کہ 'یہ دنیا کافی بڑی ہے لیکن یہ بات صاف طور سے نظر آتی ہے کہ داستان گویوں نے صرف انہی علاقوں یا شہروں کے نام لیے ہیں جن سے ہندوستان کا تعلق رہا ہے۔'

اس بات کا بھی جواب یہیں پر مل جاتا ہے کہ آخر راہی معصوم رضا کیسے 'مہابھارت' جیسے شہرۂ آفاق سیریل کے مکالمے اور اسکرین پلے اتنی کامیابی اور اعتماد کے ساتھ تحریر کر لے گئے۔ اس کے پس پردہ ان کی تحقیق 'طلسم ہوش ربا: ایک مطالعہ' نے ہندوستانی اساطیری

اور دیو مالائی قصوں، کہانیوں اور داستانوں کو بہت قریب سے دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے کا راہی کو ایک نایاب موقع عنایت فرمایا۔ مہابھارت میں حفظ مراتب، آداب والقاب، زبان و بیان، کرداروں کی باہمی گفتگو غرض کہ ہر ایک پہلو پر راہی کی گرفت بڑی مضبوط ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے ہندی یا سنسکرت کے نامانوس اور بھونڈے الفاظ اور جملوں کا استعمال کیا ہے بلکہ خوش ذائقہ، شیریں اور مترنم الفاظ سے مہابھارت کو سجایا ہے۔ مہابھارت میں ہندی، سنسکرت اور اودھی زبان کی چاشنی سے ایک ایسا مکالمہ تیار کیا گیا جس کا جادو عوام کے سر چڑھ کر بولا۔ مغل اعظم کے مکالمے آج بھی لوگوں کی زبان پر ہیں اسی طرح مہابھارت کے بعض مکالمے آج بھی لوگوں زبان پر ہیں۔ مہابھارت جیسے رزمیہ کو دوبارہ تحریر کرتے ہوئے اس کے متعلق راہی کا خیال تھا کہ ''چار ہزار برس پرانی اس داستان کو اگر ہم آج کے دور سے نہیں جوڑ پاتے تو اس سیریل کو بنانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اس کو لکھنا اس لیے قبول کیا کہ میں جانتا تھا کہ میں اس کو کانٹمپوری (ہم عصر) بنا سکتا ہوں اور میں ہندوستان کے گزرے ہوئے کل کو آج کے ہندوستان سے جوڑ سکتا ہوں۔''

جیسے فلم 'مغل اعظم' میں راوی ہندوستان ہے اور فلم کی ابتدا میں کہتا ہے 'میں ہندوستان ہوں، ہمالیہ میری سرحدوں کا نگہبان اور گنگا میری پوترتا کی سوگندھ، تاریخ کی ابتدا سے میں اندھیرے اور اجالوں کا ساتھی رہا ہوں اور میری خاک پر سنگ مرمر میں لپٹی ہوئی چادریں دنیا سے یہ کہہ رہی ہیں کہ ظالموں نے مجھے لوٹا، مہربانوں نے مجھے سجایا اور نادانوں نے مجھے زنجیریں پہنا دیں اور میرے چاہنے والوں نے انھیں کاٹ پھینکا۔ میرے چاہنے والوں میں ایک انسان کا نام جلال الدین محمد اکبر تھا۔'

اسی انداز، تیور اور تمکنت کے ساتھ مہابھارت میں بھی راوی جب یہ کہتا ہے کہ 'میں سمے ہوں اور آج مہابھارت کی امر کتھا سنانے جا رہا ہوں۔ یہ مہابھارت کیول بھرت ونش کی کوئی سیدھی سادی یدھ کتھا نہیں ہے۔ یہ کتھا ہے بھارتیہ سنسکرتی کے اتار چڑھاؤ کی اور ستیہ استیہ کے یدھ کی، یہ کتھا ہے اندھیرے سے جوجھنے والے اجالے کی اور یہ کتھا میرے سوا کوئی دوسرا سنا بھی نہیں سکتا۔'

راہی کی تخلیقی زندگی کا سب سے عظیم کارنامہ 'مہابھارت' کے مکالمے اور اسکرین پلے ہے جو دراصل ایک قدیم رزمیہ سے ماخوذ ہے جو اپنے اندر مذہبی، دیومالائی، تاریخی اور فلسفیانہ افکار کو سمیٹے ہوئے ایک لاکھ سے زیادہ اشلوکوں میں پھیلا ہوا ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ ہندو مذہب اور تہذیب میں اس قدر مقبول ہے کہ اس کو پانچویں وید کا مرتبہ اور مقام حاصل ہے۔ اس رزمیے کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ بھی موجود ہے وہ اس رزمیے میں ہے اور جو نہیں ہے وہ بھی اس میں کہیں نہ کہیں مل جائے گا۔ جیسے پچھلے زمانوں میں لوگ دیوانِ حافظ کے کسی ورق کو کھول کر اپنے دل کا حال معلوم کر لیتے تھے ویسے ہی مہابھارت کے اشلوک بھی انسان کی ہر قدم پر رہنمائی کرتے ہیں۔ مشہور ٹی وی چینل 'اسٹار پلس' نے بھی 2013 میں 'مہابھارت' سیریل بنایا اس کا بھی بجٹ تقریباً سو کروڑ روپئے تھا جو کہ ٹی وی شوز کی تاریخ میں ابھی تک کا یہ سب سے بڑا بجٹ ہے۔ مگر جو مقبولیت اور محبوبیت بی آر چوپڑہ کے 'مہابھارت' کو نصیب ہوئی وہ آج تک کسی دوسرے سیریل کو نہیں ملی۔

یہ سیریل آج بھی اتنا ہی مقبول اور پسند کیا جاتا ہے جتنا کہ دوردرشن پر اپنے ٹیلی کاسٹ کے زمانے میں مقبول تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جس دن یہ سیریل دوردرشن پر ٹیلی کاسٹ ہوتا تھا اس وقت ہندوستان تھم جاتا تھا بازار میں رونق کم ہو جاتی تھی دفتروں میں چہل پہل نہیں رہتی تھی، سڑکیں اور گلیاں سنسان ہو جاتی تھیں اور گھروں میں ہر کوئی ٹیلی ویژن کے سامنے ہی دیکھا جاتا تھا۔ 'مہابھارت' کے پروڈیوسر بلدیوراج چوپڑہ المعروف بی آر چوپڑہ نے اس سیریل کے فارسی اور عربی زبان کے سب ٹائٹل کے حقوق سے ہی اربوں کی کمائی کی۔ اس سیریل کے سب ٹائٹل کے کاپی رائٹ ہندوستان سمیت دنیا کی ہر بڑی زبان میں فروخت ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس سیریل کے سب ٹائٹل کا سب سے پہلا خریدار ایران تھا جس نے بی آر فلمز کو بہت بڑی رقم ادا کر کے حاصل کیا تھا۔ اس کے علاوہ انڈونیشیا اور دیگر عرب ممالک اور یورپی ممالک نے بھی سب ٹائٹل اور حقوق خرید کر اپنے یہاں نشر کیا۔ اس عظیم رزمیے کو راہی نے اپنے قلم کے ذریعہ ٹیلی ویژن کے چھوٹے پردے پر ایسا تحریر کیا کہ راہی کو دنیا اس دور کا دوسرا وید ویاس کہتی ہے جس نے 'مہابھارت' کو ہندوستان کے گھر گھر پہنچا دیا جس کی وجہ سے راہی ادب کی مہابھارت سے فاتح بن کر نکلے۔

راہی کی تخلیقی زندگی کا سب سے عظیم کارنامہ 'مہابھارت' کے مکالمے اور اسکرین پلے ہے جو دراصل ایک قدیم رزمیہ سے ماخوذ ہے جو اپنے اندر مذہبی، دیومالائی، تاریخی اور فلسفیانہ افکار کو سمیٹے ہوئے ایک لاکھ سے زیادہ اشلوکوں میں پھیلا ہوا ہے۔

■

Dr. Muntazir Qaimi
Department(Urdu)
FAA Govt. PG College
Mahmudabad (Awadh), Sitapur
Mob:08127934734
Email: muntazirqaimi@gmail.com

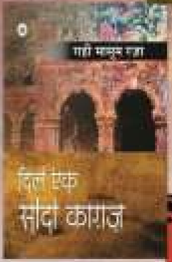

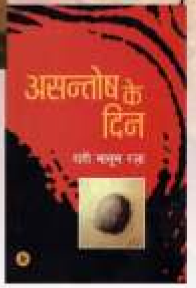

ابوہریرہ

راہی معصوم رضا کے ناولوں کا اجمالی جائزہ

یکم اگست 1927 کو ضلع غازی پور کے گنگولی میں پیدا ہونے والے راہی معصوم رضا (1927) ایک بہتر شاعر، اہم ناول نگار، نقاد، فلم اور ٹی وی کے معروف اسکرپٹ رائٹر، مکالمہ نویس، سیاسی وسماجی مسائل پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ ثقافتی کارکن کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ راہی معصوم رضا کی اہم شناخت ایک اچھے ناول نگار کے طور پر ہے۔ ان کے ناول تقسیم کا کرب، سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت، گنگا جمنی تہذیب کی پاس داری، ہندو مسلم اتحاد کی وکالت، نسلی امتیازات اور ذات پات پر چوٹ، فرقہ وارانہ فسادات کا رنج والم، آزاد ہندستان کی سیاسی، سماجی اور معاشی صورت حال کو پیش کرتے ہیں۔ راہی معصوم رضا کی ناول نگاری کی ابتدا عباس حسینی کے نکہت پبلی کیشنز، الہ آباد کے لیے شاہد اختر اور آفاق حیدر جیسے ناموں سے جاسوسی اور رومانی ناول لکھنے سے ہوئی۔ [1] اس خالص پیشہ ورانہ وابستگی کے باوجود راہی معصوم رضا نے اپنے اندر کے فن کار کو زندہ رکھا اور اپنے اصل نام سے بھی اردو رسم الخط میں کئی ناول لکھے جن میں محبت کے سوا (1950) دستیاب ہے، وہیں ان کے دوسرے اردو ناولوں جیسے سڑک، [2] ڈوب چلا میخانہ [3] اور سحر کے انتظار میں [4] کے اشتہارات ان کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ راہی معصوم رضا کے دستیاب ناولوں کی تفصیل مع اولین اشاعت درج ذیل ہے:

1 محبت کے سوا: 1950، حلقۂ ادب، بشیر منزل غازی پور
2 آدھا گاؤں: ستمبر 1966، اکشر پرکاشن، نئی دہلی
3 ٹوپی شکلا: 1967، راج کمل پرکاشن، نئی دہلی
4 ہمت جون پوری: 1969، راج کمل پرکاشن، نئی دہلی
5 اوس کی بوند: 1970، راج کمل پرکاشن، نئی دہلی
6 دل ایک سادہ کاغذ: 1973، راج کمل پرکاشن، نئی دہلی
7 سین 75: 1977، راج کمل پرکاشن، نئی دہلی
8 کٹرابی آرزو: 1978، راج کمل پرکاشن، نئی دہلی
9 اسنتوش کے دن: 1986، راج کمل پرکاشن، نئی دہلی
10 نیم کا پیڑ: 2003، راج کمل پرکاشن، نئی دہلی

مذکورہ ناولوں میں 'محبت کے سوا' اردو رسم خط میں شائع ہوا جب کہ آدھا گاؤں بعض ناگزیر حالات کی بنا پر دیوناگری رسم خط میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ آدھا گاؤں کو راہی معصوم رضا نے صدیوں پرانی ماہ محرم کی روایات، مشرقی اتر پردیش کی مقامی تہذیب، بھوجپوری زبان (جسے راہی خود بھوجپوری اردو کا نام دیتے ہیں) [5] اور اردو مرثیے کی چاشنی میں گھول کر تخلیق کیا تھا، آدھا گاؤں کے ابواب کے نام راہی نے میر انیس کے مرثیوں کے مصرعوں پر رکھے تھے اور ان کی بندش ایسی تھی کہ جب تک قاری کو داستانِ کربلا درست زمانی ترتیب کے ساتھ یاد نہ ہو، وہ پوری کہانی کو سمجھ نہیں سکتا۔ کم وبیش یہی قصہ راہی کے دوسرے ناول 'کٹرابی آرزو' کا بھی ہے۔ ان دونوں ناولوں کے اصل نسخے (جو کہ اردو رسم خط میں ہیں اور خود راہی معصوم رضا کی تحریر میں ہیں) انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی میں محفوظ ہیں۔ ذیل میں راہی کے ناولوں پر اجمالی روشنی ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

محبت کے سوا

محبت کے سوا راہی معصوم رضا کا پہلا ناول ہے۔ یہ ایک لڑکی ملک تاج کی داستان ہے جو اپنے اُس شوہر ساحر کے انتظار میں اپنی زندگی کے بیس سال گزار دیتی ہے جو دیش بھگتی کے الزام میں حوالۂ زندان کر دیا جاتا ہے۔ اُس کا شوہر اپنے اصولوں سے سمجھوتا نہ کرنے اور اپنے نظریات پر قائم رہنے کی بنا پر قید و بند کا سزاوار ٹھہرتا ہے لیکن بالآخر قید کی صعوبتوں سے تنگ آکر سرکار سے معافی مانگ لیتا ہے تاکہ اپنی محبت بھری دنیا میں واپس لوٹ سکے، مگر معافی مانگنے میں اسے بیس سال کا عرصہ گزر جاتا ہے۔ اُدھر ان بیس سالوں میں اُس کی بیوی اشتراکی کارکن بن چکی ہوتی ہے جسے اپنے شوہر کی جواں مردی اور اصول پسندی پر ناز ہوتا ہے۔ شوہر کے جیل سے باہر آتے ہی دونوں میں اختلافات بڑھتے ہیں، بیوی کا سوال ہوتا ہے کہ اگر معافی ہی مانگنی تھی تو ابتدا میں ہی مانگ لینی چاہیے تھی، زندگی کے قیمتی بیس سال ضائع کرنے کا حاصل کیا ہے۔ یہیں دونوں کے رشتوں میں دراڑ پڑتی ہے اور محبت کی کڑیاں بکھر جاتی ہیں۔

طویل ترین تقاریر ناول کے حسن کو خراب کرتی ہیں۔ راہی کا یہ ناول نظریے کا منشور بن گیا ہے، حقیقی زندگی سے اس کا رشتہ کم کم ہی محسوس ہوتا ہے۔ چونکہ اب تک کی تحقیق کے مطابق یہ راہی کا پہلا ناول ہے

اوراس کی اشاعت (1950) کے وقت راہی کی عمر کل 23 برس تھی، اس لحاظ سے ناول اپنے پلاٹ، کردار نگاری اور منظرنگاری جیسی صفات سے متصف ہے جسے راہی نے بہتر طور پر برتنے کی کوشش کی ہے۔

آدھا گاؤں

ادب میں راہی معصوم رضا اسی آدھا گاؤں کی وجہ سے جانے اور پہچانے گئے اور انھیں اردو اور ہندی میں ممتاز مقام ملا۔ آدھا گاؤں کی کہانی مشرقی اتر پردیش کے ضلع غازی پور کے ایک چھوٹے سے گاؤں گنگولی کی کہانی ہے۔ نیم سوانحی طرز پر لکھے گئے اس ناول کا زمانہ 1940 سے 1952 کے آس پاس کا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم، تقسیم ہند اور زمیں داری کا خاتمہ اس ناول کی مرکزی بنیادیں ہیں، جن کے سہارے ناول کی تعمیر کی گئی ہے۔ ناول کی کہانی گنگولی کے سیّدواڑے کی ہے جو دو پٹیوں—اتر پٹی اور دکھن پٹی- پر مشتمل ہے۔ پوری کہانی انھیں پٹیوں کے چند گھروں میں رہنے والے سیّد صاحبان کے ارد گرد گھومتی ہے۔ ان کے علاوہ گاؤں کی دیگر برادریوں کی نمائندگی بھی معاون کرداروں کے ذریعے ہوتی ہے۔

دس ابواب پر مشتمل اس ناول میں راہی نے ابتدائیہ (ہندی میں اوگھتا شہر) کے عنوان سے مقدمہ لکھا ہے جس میں غازی پور کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے اور پھر اس ناول کی وجہ تصنیف بتاتے ہوئے ناول کا خاکہ پیش کیا ہے۔ ناول کی ابتدائی چار ابواب سیّد صاحبان کی خوش حالی اور امن کا زمانہ ہے جن میں محرم ہے، مجلسیں ہیں، تبرک کی تقسیم کا ہنگامہ ہے، مرثیہ خوانی، سوز خوانی، تحت خوانی، حدیث خوانی کی روایات کی عکاسی ہے۔ دونوں پٹیوں کی آپسی رقابت داری اور ایک دوسرے کو زیر کرنے کے قصے، جھگڑے اور خوش گپیاں شامل ہیں، انھیں کہانیوں کے بیچ تقسیم ہند کے مباحث بھی داخل ہوتے نظر آتے ہیں۔

اگلے ابواب میں دوسری جنگِ عظیم کی ہنگامہ خیزی بڑے ہی ڈرامائی انداز میں بیان ہوئی ہے۔ شکر کی خرید وفروخت پر انگریزی سرکار کی لگائی گئی پابندی سیّدانیوں کے نذر و نیاز میں رخنہ انداز ہوتی ہے تو سوتی کپڑوں کی قلت سے بے چاری عورتوں کے کندھے ٹاٹ کا دوپٹہ اوڑھنے کی وجہ سے چھل جاتے ہیں۔ گاؤں گاؤں گھوم کر انگریزی سرکار کی پولیس لڑائی کے لیے چندہ وصولتی ہے اور فوج کے لیے جوان لڑکے اٹھا لیے جاتے ہیں، سرکار لڑائی کا خرچ نکالنے کے لیے ڈیڑھ گنا لگان وصول کرتی ہے۔ بالآخر عام عوام کا غصہ تھانہ قاسم آباد پر پھوٹ پڑتا ہے، سرکار کے خلاف بغاوت ہو جاتی ہے۔ یہاں راہی نے بڑی ہی چابک دستی سے قصے کو بوجھل بنائے بغیر 1942 کے بھارت چھوڑو تحریک کا منظر نامہ پیش کر دیا ہے۔

ان ابواب میں ملک کا ماحول خراب ہونے، محرم کی مجلسوں کے پھیکی پڑنے، چوبی تعزیوں کی تعداد گھٹنے جیسے عوامل کے ساتھ تقسیم کے المیے کا بھی بیان ہے۔

ادب میں راہی معصوم رضا اسی آدھا گاؤں کی وجہ سے جانے اور پہچانے گئے اور انھیں اردو اور ہندی میں ممتاز مقام ملا۔ آدھا گاؤں کی کہانی مشرقی اتر پردیش کے ضلع غازی پور کے ایک چھوٹے سے گاؤں گنگولی کی کہانی ہے۔

اسی موڑ پر راہی معصوم رضا نے 'درمیانیہ' (ہندی میں بھومیکا) کے عنوان سے ایک اور مقدمہ لکھا ہے جس میں انھوں نے کچھ ایسے سوالات اٹھائے ہیں جو تقسیم ہند کا کرب جھیلنے والے، ہندستان نہ چھوڑنے والے ہر آدمی کے سوالات ہیں۔ اسی میں راہی نے غازی پور اور گنگولی سے اپنی لازوال محبت کا اعلان بھی کیا ہے اور اپنے اعظم گڑھ کے ہونے (جیسا کہ بعض حضرات راہی کے اعظم گڑھ کا ہونے کا دعوا کرتے ہیں) کی کھلےلفظوں تردید کی ہے۔

ناول کا آخری باب سیّد صاحبان کی زبوں حالی، ان کی صدیوں پرانی اقدار اور شان و شوکت کے شکست و ریخت کی کہانی بیان کرتا ہے۔ سیّد زادے جوتے کی دکان کھولنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور سیّدانیوں کے نکاح کے لیے اب کھری ہڈّی اور اعلا حسب ونسب کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور سیّد صاحبان کے گھر بوسیدہ ہو کر زمیں دوز ہو رہے ہوتے ہیں۔

'آدھا گاؤں' بنیادی طور پر چند گھروں کی کہانی ہے مگر اس کا دائرہ پورے ہندستان پر محیط ہے۔ یہ ناول ذات پات پر مبنی تفریق اور اونچ نیچ کے خلاف دستاویز بھی کہا جا سکتا ہے۔ راہی معصوم رضا نے اس ناول میں ذات برادری کی سطح پر آ رہی تبدیلی کو بھی بڑے فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

راہی معصوم رضا کا آدھا گاؤں ایک ایسے خطے کی کہانی ہے جو سرحد سے ہزاروں کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور یہ بیان کرتا ہے کہ تقسیم کا نقصان اُس خطے کو کس قدر اور کیسے ہوا۔

ٹوپی شکلا

ٹوپی شکلا تقسیمِ ہند کے بعد پیدا ہونے والے حالات کا بیان ہے۔ یہ ایک ایسے ہندستان کی کہانی ہے جس نے مسلم لیگ کے دو قومی نظریے کی پرزور مخالفت کی اور اپنی صدیوں پرانی ہندستانی تہذیب سے وفاداری کا ثبوت دیا۔ ناول دو مرکزی کرداروں بلبھدر نرائن شکلا عرف ٹوپی شکلا اور سیّد ضرغام حسین زیدی عرف عِفّن کے ارد گرد گھومتی ہے۔ اٹھارہ ابواب پر مشتمل یہ ناول اُس دور کی کہانی ہے جب تقسیمِ ہند کے زخم بالکل تازہ تھے، جب ملک میں نئے فرقہ وارانہ موضوعات سر اٹھا رہے تھے، آدمی کی قابلیت وصلاحیت اس کا مذہب اور اس کی زبان طے کرنے لگی تھی۔

ناول بنارس، غازی پور اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے ماحول میں پروان چڑھتا ہے۔ ٹوپی کے والد اور دادی اردو اور فارسی بولنے، سمجھنے، لکھنے اور روزمرہ کی زندگی میں برتنے والے ہوتے ہیں۔ ٹوپی اسی ماحول میں بڑا ہوتا ہے دوسرا مرکزی کردار عفن سرکاری افسر کا بیٹا ہوتا ہے جس کے اکثر وبیشتر عزیز واقارب پاکستان جا چکے ہوتے ہیں اور وہاں سے اسے پاکستان آنے کے لیے خط لکھتے ہیں۔

راہی کے دونوں مرکزی کردار اپنے ارد گرد کی شدت پسندی سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ یہ ناول حالات سے سمجھوتا نہ کرنے اور اپنے اصولوں پر قائم رہنے کی روداد پیش کرتا ہے۔ حقیقتاً یہ ناول صدیوں پرانی گنگا جمنی تہذیب کے شکست و ریخت کی داستان ہے۔

ہمّت جونپوری

ہمّت جونپوری آدھا گاؤں اور ٹوپی شکلا سے قدرے مختلف ناول ہے۔ تین ابواب پر مشتمل یہ ناول اس ہمت جونپوری نامی کردار کی کہانی ہے جو اپنی

پیدائش سے لے کر موت تک معاشرے میں اپنے جائز حقوق، نیک نامی اور اپنے خوابوں کو مکمل کرنے کی لڑائی لڑتا ہے۔ راہی معصوم رضا نے اس ناول کو سوانحی انداز میں لکھا ہے۔ پہلا باب – جو کہ پورے ناول کا تقریباً ستر فی صد حصہ ہے- ہمت جونپوری کے آبا و اجداد کی تفصیلات پر مشتمل ہے جو جونپور سے غازی پور ہجرت کر کے آئے ہوتے ہیں مگر اپنے نام سے جونپوری کا لاحقہ لگانا فراموش نہیں کرتے۔ ہمت کے خاندان میں شعر و شاعری کا خوب چرچا ہے، مثنوی نگاری پر خصوصی توجہ ہے۔ واقعتاً اس ناول کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے قاری کا مثنوی کی تعریف، اجزائے ترکیبی اور اس کی روایت سے واقف ہونا ضروری ہے، اور کہیں کہیں تو مثنوی کی فنی خوبیوں اور خامیوں، ابواب بندی کی باریکیوں اور مثنوی میں تاریخ نگاری جیسے باریک نکات سے آگاہی بھی لازمی ہوجاتی ہے۔

ناول کے دوسرے باب میں ہمت جونپوری فلمی دنیا میں اپنی قسمت آزمانے ممبئی (ناول میں بمبئی) چلا جاتا ہے۔ اس باب میں راہی نے خود اپنے آپ کو ناول کے ایک کردار کے روپ میں پیش کیا ہے جس سے ہمت جونپوری کی ملاقات ہوتی ہے اور ہمت راہی سے اپنی فلم میں گانے لکھوانے کا وعدہ لیتا ہے اور اپنے دوستوں میں اس بات پر فخر کرتا ہے کہ مشہور شاعر راہی معصوم رضا اُسے پہچانتا ہے، لیکن راہی اُسے دھوکہ دے کر نکل جاتے ہیں۔

ناول کے تیسرے اور آخری باب میں ہمت کی اس مفلسی کا بیان ہے جو اسے ممبئی میں کام نہ ملنے کی وجہ سے پیش آئی۔ ساتھ ہی اس میں ممبئی کی داداگری، شرپسند عناصر کی سیاسی جماعتوں کے ذریعے پشت پناہی، غریبی، جرائم اور جسم فروشی جیسے مسائل کو راہی نے کہانی کی صورت میں پیش کر کے خوابوں کی نگری ممبئی کی قلعی کھولی ہے۔ یہ ناول ہمت جونپوری کے ناکام و نامراد ہو کر غازی پور واپس لوٹتے وقت بس سے کچل کر مرجانے پر ختم ہوتا ہے۔

ناول غازی پور اور ممبئی جیسے شہروں کے ماحول مقامی تہذیب وثقافت کا بیان کرتا ہے۔ ہمت جونپوری کی ماں چوں کہ درزی برادری سے تعلق رکھتی ہے، اس لیے راہی نے یہاں بھی ذات پات اور اونچ نیچ کو موضوع بنایا ہے۔ ناول میں اردو، ہندی اور بھوجپوری کے حوالے سے بھی دل چسپ باتیں سامنے آتی ہیں۔

اوس کی بوند

اوس کی بوند تقسیم ہند کے بعد تیزی سے پنپتی ہندو مسلم منافرت اور اس سے نبرد آزما ہونے والے کرداروں کی کہانی ہے۔ ناول کے دو مرکزی کردار شہلا اور وقار اللہ عرف وحشت انصاری ہیں۔ شہلا کے دادا کنور وزیر حسن خاں زمیں دار اور مسلم لیگ کے بڑے حامی ہوتے ہیں لیکن پاکستان بن جانے کے بعد یہ کہہ کر پاکستان جانے سے انکار کر دیتے ہیں کہ بزرگوں کی دہلیز نہیں چھوڑی جاتی، لیکن ان کا اکلوتا بیٹا علی باقر – جو کہ تحریک پاکستان کا سخت مخالف ہوتا ہے- اپنے باپ کی اس نصیحت کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنی بیوی عابدہ کو طلاق دے کر اپنی بیٹی شہلا کو چھوڑ کر پاکستان چلا جاتا ہے جس کے غم میں شہلا کی دادی ہاجرہ پاگل ہوجاتی ہے۔

دوسرے مرکزی کردار وقار اللہ عرف وحشت انصاری حیات اللہ انصاری کا بیٹا ہے۔ حیات اللہ انصاری بھی مسلم لیگ کے حامی اور زوردار مقرر ہوتے ہیں لیکن پاکستان جانے سے انکار کر دیتے ہیں اور کانگریس کی رکنیت اختیار کر کے اپنا سیاسی وجود قائم رکھنے کی جدو جہد جاری رکھتے ہیں۔ ان کا بیٹا وحشت، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے وکالت کی ڈگری لے کر غازی پور کی دیوانی عدالت میں پریکٹس کرتا ہے، شعر کہتا ہے اور ڈائری لکھتا ہے۔

کنور وزیر حسن خاں کا گھر تین چار ہزار سال قدیم ہوتا ہے جس میں ایک قدیم مندر اسی طرح موجود ہوتا ہے۔

ناول میں شہلا اپنے دادا کی موت اور اس کی ذاتی ملکیت پر شرپسند عناصر کے قبضے کے خلاف قانونی لڑائی لڑتی ہے، جس کے لیے وہ وحشت انصاری ایڈوکیٹ کے پاس جاتی ہے، جس سے وہ محبت بھی کرتی ہے مگر وحشت انصاری مندر کا کیس لینے سے انکار کر دیتا ہے اور شہلا کو ہندو وکیل کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ راہی معصوم رضا نے یہاں بھی غیر ضروری تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے شہر میں فساد کا منظر دکھایا ہے جس میں شہلا کی عصمت دری کے بعد اس کا قتل کر دیا جاتا ہے۔

ناول کا انتساب راہی نے اپنی بیوی نیّرہ رضا اور اپنی بیٹی مریم رضا کے نام کیا ہے، ساتھ ہی ڈیڑھ صفحے کے مقدمے میں راہی نے اپنے ناولوں میں گالیوں کی موجودگی کے حوالے سے لکھا ہے کہ میرے کردار اپنے اپنے گھروں میں اور سڑکوں پر گالیاں ہی بکتے ہیں، اس لیے میں گالیاں ہی لکھوں گا، اگر وہ گیتا کے شلوک بکیں گے تو میں گیتا کے شلوک ہی لکھوں گا۔ راہی کہتے ہیں کہ میں کوئی ناجی جرمن ادیب نہیں ہوں کہ اپنے کرداروں پر اپنا حکم چلاؤں اور انھیں گالیاں بکنے پر توپ سے اُڑا دوں۔

یہ ناول بھی ٹوپی شکلا کی طرح صدیوں پرانی گنگا جمنی تہذیب کی شکست کا بیانیہ ہے۔

دل ایک سادہ کاغذ

دل ایک سادہ کاغذ کو راہی معصوم رضا کی خود نوشت بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس ناول کے مختصر سے مقدمے میں انھوں نے پہلے تو اسے اپنی خودنوشت ہونے کا امکان ظاہر کیا ہے مگر فوراً ہی اس کی تردید بھی کردی ہے۔ ہر چند راہی معصوم رضا نے یہ تردید کردی ہے لیکن اس کی کہانی راہی کی اصل زندگی کے واقعات سے کڑی در کڑی میل کھاتی ہے اور راہی نے اس ناول میں جگہ جگہ اپنے مرکزی کردار کی زبانی جو اشعار اور نظمیں لکھوائی ہیں، وہ راہی کی اپنی نظمیں ہیں اور ان کے شعری مجموعوں میں موجود ہیں۔ راہی کا اسے اپنی خودنوشت ہونے کا امکان ظاہر کرنا ہی اس شک کو جنم دیتا ہے۔

کہانی غازی پور کے زیدی ولا سے شروع ہوتی ہے بمبئی کی تاریک فلمی دنیا میں ختم ہوجاتی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار سید رفعت علی زیدی عرف رفّن ہے جو شاعر ہو کر باغی اعظمی تخلص اختیار کرتا ہے۔ ناول کے ابتدائی دو ابواب غازی پور کی مقامی تہذیب، بھوجپوری اردو، تقسیم ہند کے سانحے اور زمیں دار گھرانوں کے ٹھاٹھ باٹ کے بیان میں ہے۔

باغی اعظمی تاریخ کا استاد ہو کر جگہ جگہ اسکولوں میں تقرری کے لیے مارا مارا پھرتا ہے بالآخر اسے نرائن گنج نامی قصبے کے ایک اسکول میں تاریخ پڑھانے کی جگہ مل جاتی ہے۔ ناول کا خاصا بڑا حصہ نرائن گنج کے حصے پر محیط ہے۔ یہ ایک نیم قصباتی علاقہ ہوتا ہے جہاں راہی معصوم رضا نے آزاد ہندستان کے اُتار چڑھاؤ کی کامیاب تصویر کھینچی ہے۔

اس ناول میں اردو کی زبوں حالی، اسکولوں، اخباروں، مقبولِ عام تجارتی اداروں سے اردو کی جگہ ہندی کے رواج پانے کو بھی جگہ جگہ اس طرح بیان کیا ہے کہ

ناول بوجھل نہیں ہوا اور مطلب کی بات بھی کہہ دی گئی۔

دل ایک کاغذ میں بھی تقسیم کا کرب ہے۔ صدیوں کی رچی بسی گنگا جمنی تہذیب کا مرثیہ ہے۔ کہیں کہیں ڈھاکہ کی سیاسی صورت حال کا ذکر بھی آتا ہے کہ کیسے وہاں اردو اور بنگالی بولنے والے مسلمان ہی باہم گتھم گتھا ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا ذکر اس میں بھی خوب خوب ہے۔

سین 75

راہی معصوم رضا کا یہ ناول پوری طرح سے ممبئی کی فلمی دنیا کا بیان ہے۔ اسی ناول کے انتساب میں راہی نے خود کو تین ماؤں یعنی نفیسہ بیگم، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اور گنگا کا بیٹا کہا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار علی امجد بنارس سے فلمی دنیا میں اپنا مستقبل بنانے ممبئی آتا ہے جہاں اس کا سامنا ایسے سماج سے ہوتا ہے جو حد درجہ رذالت پسند ہے، جو اپنے فائدے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے اور جس کے پاس سماجی اقدار کے نام پر جھوٹ، مکر، فریب، فحاشی اور بغض و حسد کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ ناول بنیادی طور پر فلمی دنیا میں اپنے ستارے کے بلند ہونے کا خواب دیکھنے والے اداکاروں، قلم کاروں، شاعروں، ہدایت کاروں کے جد و جہد اور اتار چڑھاؤ کی کہانی ہے۔ راہی کا یہ ناول اس لیے بھی اہم ہو جاتا ہے کہ ہندستانی فلم انڈسٹری نے سنیما کے نام جو کچھ سماج کے سامنے پیش کیا ہے، اس کا حقیقی زندگی سے کیا تعلق، یہ ناول بہت باریک بینی سے اس پر روشنی ڈالتا ہے۔

کٹرا بی آرزو

راہی معصوم رضا کے اہم ترین ناولوں میں کٹرا بی آرزو کا بھی شمار ہے۔ یہ ناول بنیادی طور پر 26 جون 1975 سے 21 مارچ 1977 تک اندرا گاندھی سرکار کے ذریعے نافذ کی گئی ایمرجنسی کو بنیاد بنا کر لکھا گیا ہے۔ ناول کا انتساب راہی معصوم رضا نے اپنے دو دوستوں -عزیز قیسی اور بمل دت- کے نام کیا ہے جنھوں نے فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کی میٹنگ میں اُس تجویز کی مخالفت میں راہی کا ساتھ دیا تھا جس میں کہا جا رہا تھا کہ سارے قلم کار اندرا گاندھی کی حمایت کریں۔

ناول کی کہانی الٰہ آباد شہر کے ایک چھوٹے سے محلے کٹرا میر بلاقی کی ہے جہاں سیدھے سادھے اور ان پڑھ لوگ اپنی روزمرہ کی زندگیوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ تقسیم ہند کا کرب اس ناول میں بھی کہیں کہیں در آیا ہے۔

ناول کے کئی ایک مرکزی کردار ہیں جن میں دیش راج عرف دیش جو ایک موٹر میکینک ہوتا ہے اور ابتدا میں کمیونسٹ خیالات کا حامی ہوتا ہے مگر بعد میں اندرا گاندھی کی پالیسی اسے اچھی لگنے لگتی ہے کیوں کہ سرکار نے اسے گیرج کھولنے کے لیے قرض جاری کیا ہوتا ہے۔ دیش کی محبوبہ بلّو ہوتی ہے جو جنتا لانڈری چلاتی ہے، زبان کی تیز کنجوس لڑکی ہوتی ہے جس کا خواب ہوتا ہے کہ وہ ایک ایک پیسہ جوڑ کر اپنا گھر بنائے گی اور پھر دیش سے بیاہ رچالے گی۔ آشارام نامی نوجوان جو کمیونسٹ خیالات کا مبلغ اور سرکار کی پالیسیوں کا ناقد ہوتا ہے جس پر سی آئی ڈی کو شک ہوتا ہے کہ یہ شخص سرکار کا تختہ اُلٹنے کی سازش کا سرغنہ ہے اور کٹرا میر بلاقی میں یہ سازش رچی جا رہی ہے۔ شمّو میاں میکینکوں کے استاد ہوتے ہیں جن کی ایک بیوہ منہاز اور ایک کنواری شہناز بیٹیاں ہوتی ہیں جن کے نکاح کی فکر انھیں دن رات کھائے جاتی ہے جب کہ ان کا اکلوتا بیٹا عبد الرحمٰن پاکستان جا چکا ہوتا ہے۔ اتواری بابا ایک بھکاری کا دلچسپ کردار ہے جو بھیک مانگتا ہے اور انکم ٹیکس چکاتا ہے۔ بھولو پہلوان، ماسٹر بدر الحسن نایاب مچھلی شہری، پریما، بابو رام آزاد وغیرہ بھی اہم کردار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

راہی معصوم رضا کا یہ ناول ایمرجنسی کے خاتمے کے فوراً بعد شائع ہوا یعنی جس وقت یہ لکھا جا رہا تھا جب اندرا گاندھی سرکار کی تاناشاہی اپنے عروج پر تھی اور راہی اسے دیکھ اور سن رہے تھے۔ یہ ناول ان ہزاروں لوگوں کی داستان ہے جو ایمرجنسی کے زمانے میں قید اور نظر بند کیے گئے، اس ناول میں راہی نے طنز کے تیز نشتروں سے خاصا کام لیا ہے، چناں چہ جب ناول کا کردار دیش آشارام کا پتا نہ بتانے کے الزام میں سی آئی ڈی کے ذریعے مشقِ ستم بنایا جاتا ہے اور اس کے ہاتھ پاؤں توڑ دیے جاتے ہیں، وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے اور بکّیاں چلنے لگتا ہے تو وہ دن رات تھوڑی تھوڑی دیر میں اندرا گاندھی زندہ باد مسز گاندھی زندہ باد کا نعرہ بلند کرتا ہے اور جس آشارام پر سرکار کا تختہ پلٹنے کی سازش کا الزام ہوتا ہے، وہی آشارام کانگریس کے ٹکٹ پر انتخاب میں حصہ لیتا ہے۔

یہ ناول بھی بنیادی طور پر اردو میں سوچا اور اردو میں لکھا گیا ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) میں اس ناول کا اصل اردو نسخہ بھی موجود ہے۔ اس ناول میں بھی اردو فارسی کے الفاظ کی جگہ سنسکرت آمیز الفاظ کو جگہ دی گئی ہے۔ اردو اور ہندی ناول نگاری میں کٹرا بی آرزو جیسا ناول بہ مشکل ہی نظر آتا ہے جس میں اتنی بے باکی سے سیاسی حالات پر تبصرہ ہو۔ یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ اکثر ایسے موضوعات پر لکھتے وقت اکثر ناول نگار لمبی لمبی تقریریں کرنے لگتے ہیں لیکن راہی نے قصے کو ذرا بھی بوجھل نہیں ہونے دیا ہے۔

اسنتوش کے دن

راہی معصوم رضا کا یہ ناول 1984 کے ممبئی فسادات کو بنیاد بنا کر لکھا گیا ہے۔ ناول کا انتساب راج کمل پرکاشن کی مالک شیلا سندھو کے نام کیا گیا ہے۔ اس ناول میں بھی ایک مختصر سا بیان درج ہے جس میں راہی نے لکھا ہے کہ اس ناول کے سارے کردار میرے تخلیق کردہ ہیں، اللہ میاں کے نہیں، لہٰذا اللہ میاں کے تخلیق کردہ کسی شخص سے میرے کردار مماثلت پا جائیں تو میں معافی چاہتا ہوں۔ ناول کے مقدمے کے طور پر راہی نے اپنی ایک بے عنوان نظم لکھی ہے۔ راہی کی اس نظم کا عنوان 17 مئی 1984 ہے اور یہ نظم ان کے آخری شعری مجموعے غریبِ شہر میں شامل ہے جس کے اختتام پر 1 جون 1984 کی تاریخ بھی درج ہے۔(6)

ناول کی کہانی ممبئی شہر کی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار عباس رضا موسوی ہے جو ایک ہفتہ وار نئی آواز اور ماہنامہ ادب کا مدیر ہے۔ عباس سیکولر مزاج کا آدمی ہے اور اپنی جڑیں ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب میں تلاش کر کے خوش ہو جاتا ہے۔

یہ ناول ممبئی فسادات کی دل دوز کہانی بیان کرتا ہے کہ کیسے زبان، مذہب اور علاقائی شناخت کے نام پر ہزاروں لوگ قتل کر دیے گئے اور نیتاؤں نے کس طرح اپنے مفاد کی خاطر اس فساد کو جاری رہنے دیا۔ راہی نے اس ناول میں بڑے فن کارانہ انداز میں قصہ در قصہ کے پیرائے میں ممبئی کی جھگی بستیوں میں پنپنے والے جرائم، غنڈوں کی سرپرستی میں نشہ بیچنے والے نوجوانوں کی حالت زار اور جھوپڑیوں میں رہنے والی لاکھوں لاکھ آبادی کی زبوں حالی کا بیان کیا ہے۔ اسی زمانے میں مسلم نوجوانوں اور خلیجی ممالک میں کام کی غرض سے جانے اور اس پیسے سے آنے والی خوش حالی اور مسلم معاشرے پر

ہونے والے اثرات کو بھی راہی نے بیان کیا ہے۔ جرائم کی سیاسی سرپرستی اور مندر بنام مسجد، مراٹھا بنام غیر مراٹھا، اردو/ ہندی بنام مراٹھی جیسے تنازعوں کو بھی راہی نے ناول کے کینوس پر ابھارا ہے۔ یہ پورا ناول دراصل راہی کے اس سب سے چھوٹی اقلیت یعنی ہندستانیت کی تلاش میں لکھا گیا ہے جس اقلیت کا خاکہ انھوں نے اپنی نظم سب سے چھوٹی اقلیت میں پیش کیا ہے۔

نیم کا پیڑ

نیم کا پیڑ راہی معصوم رضا کا آخری ناول ہے۔ بنیادی طور پر یہ ولایت جعفری کا افسانہ تھا، جعفری صاحب ڈی ڈی لکھنؤ کے ڈائریکٹر تھے، انھوں نے یہ افسانہ راہی معصوم رضا کو سیریل اسکرپٹ کے روپ میں تبدیل کرنے کے لیے پیش کیا۔ نیم کا پیڑ سیریل کے کل 58 اپی سوڈس جاری ہوئے جس میں راہی معصوم رضا بطور اسکرپٹ رائٹر 26 اپی سوڈس میں ہی شامل رہ سکے، بعد ازاں ان کا انتقال ہو گیا، آگے کی کہانی ولایت جعفری نے ہی مکمل کی۔ یہ ناول راہی معصوم رضا کے نام سے ہی راج کمل پرکاشن سے شائع ہوتا ہے، پربھات رنجن نے اس ناول کو ٹی وی اسکرپٹ سے ناول کی شکل میں منتقل کیا۔

نیم کا پیڑ زمین دارانہ نظام سے شروع ہو کر جمہوری نظام حکومت پر ختم ہوتا ہے۔ علی ضامن میاں اور مسلم میاں جو بالترتیب مدرسا کُرد اور لکشمن پور کلاں کے زمیں دار اور خالہ زاد بھائی ہوتے ہیں، یہ دونوں باغات اور زمینات کے لیے باہم دست و گریباں ہوتے ہیں اور بات مقدمے بازی تک پہنچ جاتی ہے۔ علی ضامن میاں کا اسامی بدھئی اس ناول کا اہم کردار ہے، بدھئی اپنے بیٹے سکھی رام کی ولادت پر اس یقین کے ساتھ نیم کا درخت لگاتا ہے کہ اس کا بیٹا بھی نیم کے درخت کی طرح پھلے گا پھولے گا اور اُس کی طرح بے گاری کرنے کے بجائے پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے گا۔ سکھی رام بدھئی کے خوابوں کے برعکس سیاست کے چنگل میں گرفتار ہو کر ممبر پارلیمنٹ بن تو جاتا ہے لیکن اس حصول یابی کے لیے وہ جرائم کا بھی سہارا لیتا ہے اور عام سیاست دانوں کی طرح بدعنوانی بھی کرتا ہے، یہ صورت حال دیکھ کر بدھئی کا سارا یقین مایوسی میں بدل جاتا ہے۔

راہی معصوم رضا نے اس ناول میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ملک آزاد ہونے کے بعد

> **مجموعی طور پر دیکھا جانے تو راہی معصوم رضا کے ناول خالص ہندستانی تانے بانے میں بُنے نظر آتے ہیں۔ ان کے کردار گاؤں دیہات اور قصبوں میں جنم لیتے ہیں۔ راہی اپنے استعارے اور تلمیحات بھی ہندستانی دیومالا سے خلق کرتے ہیں۔ اردو زبان اور اردو شاعری کے حوالے جس طرح راہی کے ناولوں میں پیش آئے ہیں، انھیں دیکھ کر پورے یقین کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو کی شعری روایت راہی کا دامن نہیں چھوڑتی۔**

بھی خود مختار ریاست اور ترقی کے سارے دعوے دم توڑ رہے ہیں۔ ناول میں نیم کا پیڑ راوی کے کردار میں ہے اور ایک عہد کے اُتار چڑھاؤ کی کہانی سناتا ہے۔ راہی معصوم رضا کے مہابھارت اور دیگر ناولوں کی طرح یہ بھی وقت کی کہانی ہے۔ ناول میں فیض کے مصرع 'وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں' کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ راہی کے دوسرے ناولوں کی طرح اس میں بھی بھوجپوری اور اودھی کا خوب استعمال کیا گیا ہے جس سے ناول کی دل چسپی میں اضافہ ہوا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو راہی معصوم رضا کے ناول خالص ہندستانی تانے بانے میں بُنے نظر آتے ہیں۔ ان کے کردار گاؤں دیہات اور قصبوں میں جنم لیتے ہیں۔ راہی اپنے استعارے اور تلمیحات بھی ہندستانی دیومالا سے خلق کرتے ہیں۔ اردو زبان اور اردو شاعری کے حوالے جس طرح راہی کے ناولوں میں پیش آئے ہیں، انھیں دیکھ کر پورے یقین کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو کی شعری روایت راہی کا دامن نہیں چھوڑتی۔ چنانچہ ہندی کے معروف ناول نگار اور راہی کے دوست کملیشور لکھتے ہیں:

اُس زمانے میں راہی کے جو کالم آیا کرتے تھے، وہ فارسی لپی میں آیا کرتے تھے، اُس پر بڑا خوب صورت پرنٹ ہوا کرتا تھا-فرام دی ڈیسک آف راہی معصوم رضا - وہ ایک چوڑا سا پیلے کاغذ کا ہوتا تھا اور اُس پر یہ چیزیں ہوتی تھیں۔ (7)

قابلِ غور بات یہ ہے کہ راہی کے یہ کالم کملیشور کے رسائل ساریکا (1978-1967) اور گنگا (1984-1988) کے لیے آیا کرتے تھے۔ کملیشور کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ راہی آخر عمر تک اردو رسمِ خط میں ہی لکھتے رہے۔ کملیشور کے ذکر کردہ کاغذات انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی کے آرکائیوز میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ چناں چہ غالب گمان ہے کہ آدھا گاؤں اور کٹرا بی آرزو ہی کی طرح ان کے دیگر ناول بھی (جن کی زبان اردو ہی ہے) فارسی رسمِ خط میں ہی لکھے گئے ہوں گے۔ حالاں کہ یہ تحقیق طلب امر ہے اور بنا کسی ثبوت کے حتمی بات نہیں کہی جا سکتی۔

حوالہ جات:

1 राही मासूम रज़ा के साथ सुदीप अंतरंग बातचीत (इंटरव्यू), वागमय पत्रिका राही मासूम रज़ा विशेषांक, संपादक एम फ़ीरोज़ अहमद, अप्रैल-सितंबर 2008

2 موج گل موج صبا، راہی معصوم رضا، عوامی کتاب گھر، بشیر منزل، غازی پور، مئی 1953، ص 26-25

3 نیا سال، راہی معصوم رضا، عوامی کتاب گھر، بشیر منزل، غازی پور، مارچ 1952، ص 64

4 ایضاً

5 آدھا گاؤں، (ہندی) راہی معصوم رضا، راج کمل پرکاشن، نئی دہلی، پچیسواں ایڈیشن 2022، ص 21

6 غریب شہر، راہی معصوم رضا، ساحر پبلشنگ ہاؤس، بمبئی، اکتوبر 1992، ص 67

7 راہی کے پرکھے، کملیشور، ابھیو کدم (راہی معصوم رضا نمبر)، مدیر جے پرکاش دھوم کیتو، جلد 5، شمارہ 6-7، نومبر 2001 تا اکتوبر 2002)

■

Abu Horairah
Research Scholar
Dept. of Urdu
University of Delhi, Delhi 110007
Mob. 9936474486
Email. rafiwaseem382@gmail.com

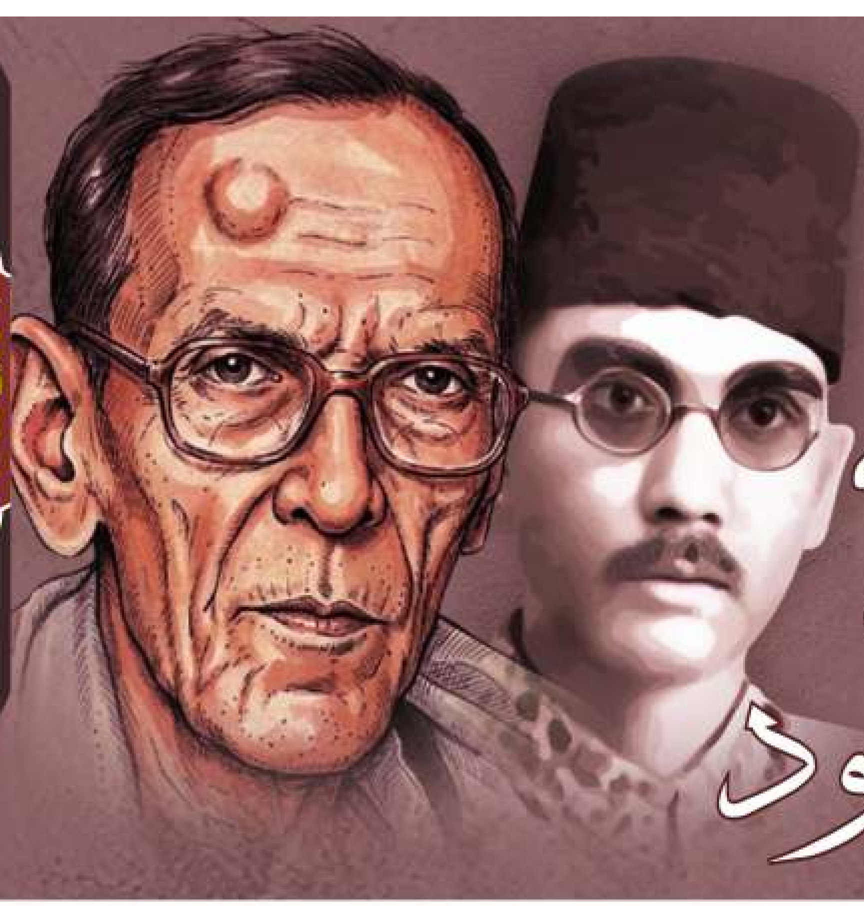

معید الرحمن

یگانہ بحوالہ نیرّ مسعود

اردو شاعری اور تنقید کی تاریخ میں مرزا یگانہ چنگیزی (1884-1956) شعری اور لسانی استناد کو عظمت کا معیار سمجھنے کے خلاف سرگرم عمل رہنے کے سبب موضوعِ بحث بنے رہے۔ انھوں نے غزل کے روایتی موضوعات کے برعکس اپنے تجربے اور مشاہدے کو غزلیہ پیکر میں پیش کرنے کو ترجیح دی۔ شکستِ ذات، المیاتی انجام، کرب، تنہائی جیسے موضوعات نے انھیں جدید غزل کے پیش رووں میں ممتاز و منفرد مقام عطا کیا۔ یگانہ کی متنازع فیہ شخصیت اور ان کی تحریروں کے پس منظر سے واقف ہونے کے لیے نیر مسعود (1936-2017) کی کتاب ''یگانہ: احوال و آثار'' (1991) معتبر و مستند حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔

یگانہ کے متنازع فیہ شخصیت ہونے اور غیر روایتی فکر کے حامل ہونے کے سبب ان کے متعلق معروضی رائے قائم کرنے میں اربابِ نقد کو مختلف دشواریاں پیش آتی رہی ہیں۔ ایک طرف لکھنؤ کے لسانی مقتدرہ کا یگانہ کے ادبی وجود کو قبول کرنے میں تذبذب کا رویہ تھا، دوسری طرف یگانہ کا کسی لسانی Canon کو معتبر نہ سمجھنے کا معاملہ تھا اور اپنی ادبی عظمت پر اصرار کا معاملہ بھی شدید تھا۔ اس کے ساتھ ہی یگانہ کے مذہبی تصورات بھی اہلِ لکھنؤ کو برگشتہ کرنے کے اہم محرک تھے۔

زیرِ مطالعہ کتاب ایک ایسے مصنف کے موئے قلم کا نتیجہ ہے جن کے پاس یگانہ کے متعلق معلومات کا کچھ حصہ براہ راست ان کے دیکھے ہوئے اور بیشتر حصہ ان کے اپنے والد اور یگانہ کے قریبی دوست مسعود حسن رضوی ادیب سے سنے ہوئے ہیں۔

کتاب کا پہلا مضمون ''یگانہ: بحوالہ ادیب'' ہے، یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یگانہ کے دوستوں میں مسعود حسن رضوی ادیب ہی وہ شخص ہیں جو ملاقات سے لے کر آخیر وقت تک سلسلۂ رفاقت میں قائم رہے۔ حتیٰ کہ دونوں لکھنؤ کے ایک ہی قبرستان کربلائے منشی فضل حسین خاں میں مدفون ہیں، اس سلسلے کا آغاز اس وقت ہوا جب کہ ادیب نے اپنی پہلی کتاب امتحانِ وفا جو لارڈ ٹینیسن کے منظوم المیہ افسانہ کا ترجمہ ہے، اس میں یگانہ کا ایک شعر نقل کیا۔ شعر ہے۔

نیرنگ حسن و عشق کی وہ آخری بہار
تربت تھی میری اور کوئی اشک بار تھا

لکھنؤ میں یگانہ کی دوستی ادیب کے علاوہ مولوی احمد بیخود موہانی سے بھی تھی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ بیخود کے وسیلے سے یگانہ کا ادیب سے مراسم کا آغاز ہوا۔ لکھنؤ میں صفی، ثاقب اور عزیز کے ذریعہ قائم شدہ انجمن معیارِ ادب کے ردِعمل میں جب بیخود اور یگانہ نے انجمن خاصانِ ادب قائم کیا تو ادیب بھی اس میں شامل تھے۔ یگانہ نے لکھنؤ میں جب اپنی مالی پریشانی کو دور کرنے کے لیے کتابوں کی فروخت کا ماہنامہ ''نظارہ'' میرٹھ میں اشتہار دیا تو ادیب نے ان کتابوں کو خریدنے سے اس لیے منع کر دیا تھا کہ وہ ایسی حالت میں اپنے دوست کا سامان نہیں خرید سکتے۔ ادیب نے یگانہ کی قدر شناسی کا ایک نمونہ یوں پیش کیا کہ انھوں نے اپنی کتاب ''ہماری شاعری'' (1926) میں تڑپ کے نمونے کے طور پر اپنے معاصر شاعر یگانہ کا یہ شعر نقل کیا۔

دھواں سا جب نظر آیا سوادِ منزل کا
نگاہِ شوق سے آگے تھا قافلہ دل کا

اور بلندیِ خیال کی مثال میں یگانہ کا یہ شعر نقل کیا۔

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ بدنصیب جسے بختِ نارسا نہ ملا

ادیب سے کسی نے شکایت کی کہ یگانہ کا یہ شعر سمجھ میں نہیں آیا تو ادیب نے یگانہ کے اس شعر کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ:

''اب ذرا شعر کے اندازِ بیان پر نظر کیجیے، خوش نصیبی اور بدنصیبی کا معیار بنانا شاعر کا مقصود نہیں ہے۔ اس کے نزدیک تو مذکورہ معیار بنانا بالکل مسلم ہے۔ اس لیے اپنے بختِ نارسائی پر پست خیال لوگوں کی طرح واویلا نہیں مچاتا بلکہ خوش ہوتا ہے اور فخر کے لہجے میں کہتا ہے کہ جس بدنصیب کو بختِ نارسا نہیں ملا وہ خدا کو کیا جانے، وہ اپنے ارادوں کا بندہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ خدا

شناسی اور خدا پرستی کی اگر تلاش ہے تو مجھ سے خوش نصیبوں کو دیکھو جنھیں بخت نارسا کی بدولت یہ فضیلتیں حاصل ہوئی ہیں۔ شاعر اپنے اس خیال کی بنا پر ظاہری بدنصیبی کو حقیقی خوش نصیبی سمجھتا ہے اور اس طرح غم میں خوشی، مصیبت میں تسکین اور مایوسی میں امید کا ایک زبردست پہلو نکال کر اپنے دل کو افسردہ اور طبیعت کو مردہ نہیں ہونے دیتا اور مردانہ وار تمام تکلیفوں کا مقابلہ کرنے کو تیار رہتا ہے۔''

(بحوالہ یگانہ: احوال و آثار،ص:15)

نیر مسعود کے مطابق یگانہ کی کتاب ''غالب شکن'' بھی ادیب کی تحریک کا نتیجہ ہے۔ نیر مسعود لکھتے ہیں:

''کہ 1933 میں یگانہ کی رباعیوں کا مجموعہ 'ترانہ' شائع ہوا...... تو ادیب نے ترانے کی رسید میں یگانہ کو خط لکھا، اس میں یہ بھی لکھا گیا کہ اگر یہ رباعیاں کتاب میں شامل نہ ہوتیں تو بہتر تھا۔ اس کے جواب میں 25 دسمبر 1933 کو یگانہ نے ادیب کو ایک لمبا خط لکھا جس میں غالب اور غالب پرستوں پر مختلف اعتراضات کے علاوہ غالب کے سلسلے میں اپنے موقف کی وضاحت بھی کی۔ ادیب کو یہ خط اس قابل معلوم ہوا کہ اس کو چھپوا دیا جائے۔ انھوں نے یگانہ کو خط لکھ کر یہی خیال ظاہر کیا۔

(یگانہ: احوال و آثار،ص:16)

یگانہ کا یہ مکتوب 1934 میں کتابی شکل میں غالب شکن کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔

یگانہ کی شخصیت اور ان کی صلاحیت کا اصل جوہر وہاں کھلتا ہے جہاں وہ کسی شاعر سے ادیب سے علمی

مباحثہ میں مصروف ہوتے ہیں۔ نیر مسعود نے یگانہ کے اس پہلو پر زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ انھوں نے یگانہ کے علمی معرکوں کے پس منظر کی وضاحت کی ہے۔ جب یگانہ 1905 میں لکھنؤ آئے۔ اس وقت وہاں کے ادبی منظرنامے پر صفی، ثاقب اور عزیز وغیرہ شعرا مقبول تھے۔ ان شعرا پر نیر مسعود نے یوں تبصرہ کیا ہے:

''جنھوں نے لکھنؤ کی روایتی غزلیہ شاعری سے کسی قدر انحراف کر کے غالب کی تقلید اختیار کی تھی۔ ان مقبول عام مشاعروں کی خوشنودی حاصل کیے بغیر کسی بیرونی شاعر کا لکھنؤ کے ادبی میدان میں قدم جمانا دشوار تھا۔ لیکن یاس عظیم آبادی کے تیوروں سے بہت جلد ظاہر ہونے لگا کہ انھیں ان شاعروں کی کوئی خاص پروا نہیں اور ان کے مقابلے میں شہر کے پرانے استادوں کو زیادہ مستند سمجھتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے شاد عظیم آبادی کا شاگرد ہونے کے باوجود لکھنؤ میں میرانیس کے نواسے پیارے صاحب رشید سے اپنی چند غزلوں پر بھی اصلاح لی، اس سے لکھنؤ کی فضا میں ایک کشیدگی سی پیدا ہوئی اور یاس پر اعتراضات ہونے لگے کہ ان کی زبان ٹکسالی اور مستند نہیں ہے۔ (یگانہ: احوال و آثار،ص:30)

نیر مسعود نے اقتباس بالا میں اس معرکہ کی بنیادی وجہ کی نشاندہی کی ہے۔ انھوں نے زبان کے Canonisation کے مسئلہ کو اختلاف کا سبب قرار دیا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اہل لکھنؤ خود کو اہل زبان اور مستند تصور کرتے تھے۔ اپنے علاوہ دوسری جگہ کے ادبا کو غیر مستند گردانتے تھے۔ یہ تنازع اور غیر فصیح ہونے،

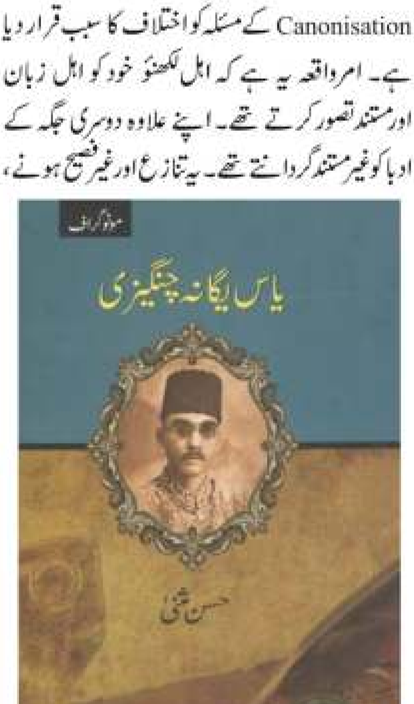

محاوروں کے درست اور نادرست ہونے پر مبنی تھا۔ اہل زبان اور غیر اہل زبان کے درمیان امتیاز برتنے پر قائم تھا۔ اگر غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس طرح کے مناقشات کی تہہ میں مرکز اور حاشیے کے مابین کشمکش کا تصور محرک معلوم ہوتا ہے۔ زبان میں مستند سمجھے جانے کے پس پردہ مقتدرہ کے حاوی ہونے کا نقطۂ نظر کارفرما ہوتا ہے۔ یگانہ کو اس بات کا گہرا ادراک تھا۔ یگانہ نے عروض کے موضوع پر چراغ سخن (1914) کے عنوان سے ایک کتاب تحریر کی ہے۔ کتاب کے آخر میں اہل زبان اور زبان داں کے عنوان سے ایک مضمون شامل ہے، جس میں اہل زبان اور زبان داں کے امتیازات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اہل زبان کی پہچان کیا ہے۔ اہل زبان وہ شخص ہے، جس کو اپنی زبان کے متعلق یہ یاد نہ ہو کہ کب سیکھی، کیونکر سیکھی اور کس سے سیکھی یعنی بغیر صرف ونحو حاصل کیے بچپنے سے اس زبان میں گفتگو کرتا رہا ہو۔ دوسری پہچان یہ ہے کہ ہر بات ہر مضمون کو اپنی زبان میں سوچے، اپنی زبان کے الفاظ میں ذہن نشین کرے......

اور زبان داں وہ ہے جو اہل زبان ہونے کے علاوہ زبان اردو کی صرف ونحو و ماہیت و ماخذ الفاظ سے بھی واقف ہو۔ زبان داں ہونے کے لیے تحقیق و تدقیق شرط ہے۔ اکثر اہل لکھنؤ کو یہ کہتے سنا ہے کہ لکھنؤ کا رہنے والا اہل زبان ہے اور باہر کا ایک متنفس بھی اہل زبان نہیں اور بڑی تعریف کی تو یہ کہہ دیا کہ ہاں باہر کا فلاں شخص زبان داں ہے مگر اہل زبان نہیں ہے۔ عجیب الٹی بات ہے۔ زبان داں ہونا تو اکتساب و تحقیق پر منحصر ہے مگر اہل زبان ہونا داخل فطرت ہے۔ لکھنؤ والا اہل زبان تو ضرور مانا جائے گا مگر اس سے یہ نہیں لازم آتا کہ وہ زبان داں بھی ہو۔ اہل لکھنؤ کے علاوہ باہر کے رہنے والے جن کی زبان مادری اردو ہے، وہ سب اہل زبان ہیں مگر ہر شخص زبان داں نہیں۔ صوبہ اودھ کے بیشتر شہر مثلاً میرٹھ، آگرہ، کانپور، الہ آباد، بنارس، جونپور، فیض آباد، بریلی، رامپور، مرادآباد وغیرہ، صوبہ پنجاب میں دہلی، صوبہ بہار میں عظیم آباد، گیا، مظفرپور اور صوبہ بنگال میں مرشدآباد، مٹیابرج یہ سب مقامات ایسے ہیں جہاں مسلمانوں کے معزز خاندان امرا و شرفا کی زبان مادری اردو ہے۔ یہ سب اہل زبان ہیں مگر

یگانہ کے غالب شکن تصورات کے پس پردہ بھی وہ رویہ کارفرما ہے جو ہر نوع کی عقیدت پسندی کو چیلنج کرتا ہے۔ یگانہ بنیادی طور پر غالب کی شعری عظمت کے منکر نہیں تھے بلکہ وہ غالب کی اندھی تقلید کے خلاف تھے۔ نیر مسعود نے غالب کی شاعری پر یگانہ کی تنقید کا خلاصہ یگانہ ہی کے الفاظ میں درج کیا ہے۔

زیادہ تر وہی لوگ جو خاص شہر کے باشندے ہیں اور مضافات شہر میں بھی اکثر فصحا پائے جاتے ہیں، ان سب امرا و شرفا کے روزمرے اور محاورے زبان اردو میں داخل ہیں اور مستند ہیں۔'' (چراغ سخن، ص:92)

اقتباس بالا میں یگانہ نے اہل زبان اور زبان داں کی جو تعریف بیان کی ہے اس سے اتفاق کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اکیسویں صدی کے ربع اول میں جب کہ ان علاقوں میں معزز شرفا کا تصور بدل چکا ہے۔ گلوبلائزیشن کے زیر اثر وہاں کی زبان اور تہذیب نے مختلف اثرات کو قبول کرلیا ہے۔ روزمرہ اور محاورے تبدیل ہو چکے ہیں۔ ایسی صورت حال میں ان علاقوں کے لسانی اظہار کے معیاری ہونے کے مسائل پر غور وخوض کے لیے نئے طرز فکر کی ضرورت ہے۔ اس مضمون میں یگانہ نے زبان کے سلسلے میں ایک نکتے کی بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''لکھنؤ کے چند خاندانوں کے وہ مخصوص محاورات جو مستورات کی زبانوں کے سوا اور کہیں نہیں پائے جاتے ہیں وہ Local tongue یعنی مقامی زبان میں شمار کیے جائیں گے۔ ہندوستان کی عام زبان میں داخل نہیں ہیں۔ کیوں کہ ان مخصوص و محفوظ محاورات سے علمی زبان کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے نہ شعرا ان محاورات کو قید نظم میں لاتے ہیں۔ اسی طرح اور شہروں کے وہ محاورات جو کسی خاص مقام سے تعلق رکھتے ہیں، وہ بھی لوکل سمجھے جائیں گے۔ مگر لغات میں سب درج کرنے کے قابل ہیں۔''

(ایضاً، ص:92)

یگانہ نے اہل زبان کی جن خصوصیات کی نشاندہی کی ہے ان سے اہل زبان کے تصور کا ایک نیا زاویہ فراہم ہوتا ہے۔ نتیجے میں دبستان کی مرکزیت کا نظریہ معدوم ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

یگانہ کے غالب شکن تصورات کے پس پردہ بھی وہ رویہ کارفرما ہے جو ہر نوع کی عقیدت پسندی کو چیلنج کرتا ہے۔ یگانہ بنیادی طور پر غالب کی شعری عظمت کے منکر نہیں تھے بلکہ وہ غالب کی اندھی تقلید کے خلاف تھے۔ نیر مسعود نے غالب کی شاعری پر یگانہ کی تنقید کا خلاصہ یگانہ ہی کے الفاظ میں درج کیا ہے۔ وہ ملاحظہ کیجیے:

''غالب کیا ہے؟ زیادہ سے زیادہ ہندوستان کا ایک بلند خیال دقت پسند شاعر جو بسا اوقات اپنے اوٹ پٹانگ تخیلات کی بھول بھلیاں میں گم ہوجایا کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ پرلے سرے کا بے سُرا بھی ہے۔ پرانا چور اور چور کے ساتھ گونگا بھی ہے۔ مضمون چرانے کو چراتا ہے مگر ہضم نہیں کرسکتا۔ تصرف کی قدرت نہیں رکھتا، چوری کھل جاتی ہے۔ زبان ایسی گونگی کہ نفس مطلب کو شاعرانہ زبان میں ادا نہیں کرسکتا۔ ٹھونس ٹھانس کے تک بندی کرلیتا ہے۔''

(بحوالہ یگانہ: احوال وآثار، ص:40)

اقتباس بالا سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ نیر مسعود یگانہ کو کلام غالب میں صرف خامیاں ہی خامیاں تلاش کرنے والے شخص کی حیثیت سے باور کرانا چاہتے ہیں۔ امر واقعہ اس کے برعکس ہے۔ یگانہ کلام غالب کے محاسن کے قائل بھی ہیں ان کی شعری عظمت کو تسلیم کرتے ہیں۔ یگانہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اس کا مطلب یہ نہیں کہ غالب اپنے صحیح مرتبے سے گھٹ جائیں گے۔ ہاں ناجائز طور پر جو آسمانِ خلعت خواہ مخواہ یاروں نے پہنا دیا ہے، وہ اتر جائے گا۔''

(غالب شکن، ص:11)

غالب شکن ہی میں دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں:

''مجھے کیا ضرورت تھی کہ غالب کے ان عیوب ونقائص کی تشہیر کرتا۔ مگر غالب پرستوں کی کورانہ عقیدت نے تمام شعرائے ماضی وحال کے حقوق چھین کر سب غالب کو دے دیے ہیں۔ سب کے کارناموں کو فراموش کرکے غالب کو اردو کا واحد نمائندہ بنا کر پیش کیا ہے۔''

(غالب شکن، ص:2)

یگانہ کے اس رویے کی تحسین کی جانی چاہیے کہ وہ ہر طرح کے Dogma کے خلاف تھے۔ ہر اس طرز فکر کے منکر تھے جو عقیدت کے منصب پر فائز ہوجائے۔ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ یگانہ مرکز گریز (Centrifugal) رویے کے حامل تھے۔

یگانہ کے مرکز گریز رویے کی تحسین کے باوجود یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ غالب کے متعلق ان کے خیالات کو وقت نے غلط ثابت کردیا۔ امتداد زمانے کے ساتھ غالب کی عظمت کے اعتراف کا سلسلہ دراز تر ہوتا جارہا ہے۔

نیر مسعود نے یگانہ کے ان تنقیدی اعتراضات کا بھی ذکر کیا ہے جو انھوں نے اپنے معاصر شعرا پر کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نیر مسعود یگانہ کے ان اعتراضات کو ان کی احساس کمتری کا زائیدہ قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''ابھی وہ اپنے لکھنوی حریفوں کے زوال سے پوری طرح آسودہ بھی نہ ہوئے تھے کہ اردو کی شعری فضا میں کچھ اور نام گونجنے لگے۔ یہ تھے اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی اور جوش ملیح آبادی اور یگانہ کو محسوس ہوا کہ ان کا نام ان ناموں کے پیچھے پڑگیا ہے، وہ غصے سے بے قابو ہوگئے......

نیر مسعود آگے یگانہ کی تنقیدی حیثیت پر مزید تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

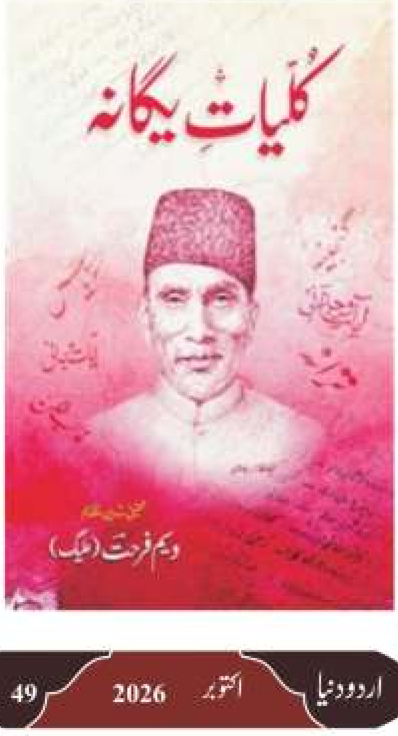

’’ان معاصروں کی شاعری پر ان کے اعتراضات خالص تنقیدی نقطۂ نظر سے قابلِ غور ہو سکتے تھے لیکن ان کے لہجے کی برافروختگی اور ناشائستگی نے ان کی تنقید کی سنجیدگی اور وزن کو ختم کر دیا۔‘‘

(یگانہ: احوال و آثار، ص: 41)

یہ بات بلاخوف تردید تسلیم کی جا سکتی ہے کہ یگانہ میں تنقیدی صلاحیت بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ انھوں نے اپنے معاصرین کے کلام کے جن معائب پر روشنی ڈالی ہے انھیں لوگوں نے تسلیم کیا ہے۔ انھوں نے کلام جوش پر جو رائے دی ہے، وہ ملاحظہ کیجیے:

’’وہ زیادہ سے زیادہ جوشیلے، رنگیلے، چٹکیلے، بھڑکیلے الفاظ نظم کر کے سمجھ لیتے ہیں کہ شعر بن گیا۔ مگر کم سے کم الفاظ، سادہ سہل و برجستہ الفاظ سے زیادہ سے زیادہ معنی پیدا کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔‘‘

(بحوالہ یگانہ: احوال و آثار، ص: 41)

نیر مسعود نے یگانہ کی ان غیر معروف تحریروں کو بھی شامل کیا ہے، جو ماہنامہ نظارہ میرٹھ کے دسمبر 1915 سے ستمبر اکتوبر 1916 تک کے شماروں میں شائع ہوئی تھیں۔ یگانہ کی یہ تحریریں اس سے قبل حوالے میں نظر نہیں آتی ہیں۔ یگانہ کی عادت تھی کہ وہ مطالعہ کے وقت اس صفحے پر اپنے تبصرے درج کر دیا کرتے تھے، حسب عادت انھوں نے نظارہ میں شائع شدہ محمد یوسف جعفری رنجور عظیم آبادی کی نظم ’’حالت زار‘‘ کا فارسی ترجمہ کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ مذکورہ رسالے سے نیر صاحب نے یگانہ کے آٹھ مضامین کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے تین مضامین کی معنویت ابھی تک قائم ہے۔ ایک کا عنوان بعض شعرائے عظیم آباد (فروری 1916) ہے، جس میں عظیم آباد کے فارسی گو شعرا کا تذکرہ ہے، دوسرا قابل ذکر مضمون الفاظ مہند بہ عطف و اضافت (اپریل مئی 1916) ہے، اس بحث کی معنویت ابھی تک محسوس کی جا سکتی ہے۔ اس کی تلخیص یگانہ کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے:

’’ماحصل اس بحث کا یہ ہے کہ جن الفاظ کو بہ اعتبار معنی وصورت عربی یا فارسی الفاظ سے کچھ بھی مشابہت یا مناسبت یا کوئی تعلق ہو وہ مہند کہے جائیں گے اور ان میں عطف و اضافت مخل فصاحت یا غلط نہ ہوگی۔ ہاں محض ہندی الفاظ جیسے ہاتھ پاؤں آنکھ ناک وغیرہ قابل عطف و اضافت نہیں ہیں۔ بہ اعتبار معنی و بہ اعتبار قالب جن الفاظ کو عربی یا فارسی سے تعلق و مناسبت ہے ان میں عطف و اضافت ہرگز ہرگز غلط یا غیر مستحسن نہیں ہو سکتی۔ اسی کلیے پر زبان اردو کی اصلاح کا دارومدار ہے۔ باقی ہر شخص اپنے فعل کا مختار ہے۔‘‘

(بحوالہ یگانہ: احوال و آثار، ص: 65)

نیر مسعود نے یگانہ کے اعتراضات کو بڑی حد تک درست قرار دیا ہے۔ کتاب میں تصنیفات مرزا یگانہ کی فہرست، سن اشاعت اور مقام اشاعت بیان کرنے کا التزام کیا گیا ہے، جو تحقیقی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ کتاب کے آخر میں یگانہ کے کلام کا مختصر انتخاب شامل ہے، جو نیر مسعود کے شعری ذوق کا عمدہ نمونہ ہے۔

یگانہ آتش کے معتقدین میں سے تھے۔ ان میں ایک دلچسپ مضمون کلام آتش بہ رنگ صائب (ستمبر اکتوبر 1916) ہے۔ مضمون کے عنوان سے بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اس میں کلام آتش کے اس پہلو کی نشاندہی کی گئی ہے جو صائب کے مماثل ہو لیکن ایسا نہیں کیا گیا ہے۔ بقول نیر مسعود آتش کے ایک شعر کی تشریح کے ضمن میں انھوں نے مختصراً صائب کے رنگ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ باقی مضمون میں آتش کے چند اشعار درج کیے گئے ہیں اور ان کی شرح کے ساتھ فنی محاسن بیان کیے گئے ہیں۔

صفی، ثاقب اور عزیز سے معرکہ کے دوران یگانہ نے عزیز کو خاص طور سے نشانہ بنایا تھا۔ ان کے خلاف ایک مکمل کتاب شہرت کاذبہ المعروف بہ خرافات عزیز کے عنوان سے لکھی تھی۔ اس کتاب میں عزیز کے کلام کی خامیوں کو نشان زد کیا گیا ہے۔ عزیز کے کلام کی لسانی اور فنی اعتبار سے غلطیاں اجاگر کی گئی ہیں۔ اس سے یگانہ کی تنقیدی صلاحیت اور فنی دسترس کا اندازہ ہوتا ہے۔ یگانہ کے تنقیدی درک سے واقف ہونے کے لیے عزیز کے ایک شعر پر یگانہ کا تبصرہ دیکھیے۔ عزیز کا شعر ہے:

جماہی آئی پھولوں کو ادھر ذکر صراحی سے
ادھر غنچوں نے شاخوں پر ہر اک پور اپنی چٹکائی

نیر مسعود لکھتے ہیں:

’’یگانہ کو اس شعر پر دو اعتراض ہیں: ایک یہ کہ جماہی آنے سے مراد کلی کا کھل کر پھول بن جانا تو ہو سکتا ہے لیکن پھول جس کا منہ پہلے ہی کھل چکا ہوتا ہے اس کے لیے جماہی آنے کا ذکر مناسب اظہار نہیں ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ’’ہر اک پور اپنی چٹکائی‘‘ کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ غنچے میں کئی پوریں ہوتی ہیں اور وہ کئی بار چٹکتا ہے۔ یہ خلاف واقعہ ہے اس لیے کہ ایک غنچہ ایک ہی بار چٹکتا ہے۔‘‘ (ص: 75)

نیر مسعود نے یگانہ کے اعتراضات کو بڑی حد تک درست قرار دیا ہے۔ کتاب میں تصنیفات مرزا یگانہ کی فہرست، سن اشاعت اور مقام اشاعت بیان کرنے کا التزام کیا گیا ہے، جو تحقیقی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ کتاب کے آخر میں یگانہ کے کلام کا مختصر انتخاب شامل ہے، جو نیر مسعود کے شعری ذوق کا عمدہ نمونہ ہے۔

نیر مسعود نے زیر مطالعہ کتاب میں یگانہ کی شخصیت، اس کے مزاج اور ان کے علمی نقوش کو تحقیقی و تنقیدی اعتبار سے بیان کیا ہے۔ اس میں لکھنؤ کے قیام سے لے کر ان کے انتقال تک کے واقعات اس طرح ترتیب دیے گئے ہیں کہ ان کی پوری شخصیت کے ارتعاشات اور زندگی کے نشیب و فراز متشکل ہو گئے ہیں۔ اس کتاب کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں مصنف نے معروضیت اور غیر جانب داری کا حد درجہ لحاظ رکھا ہے۔ واقعات کے بیان میں جذبات کی شمولیت سے حتی الامکان گریز کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مصنف کا اسلوب قابل تحسین ہے جو تشبیہات و استعارات سے معرّیٰ ہوتا ہے۔ ان کی تنقیدی و تحقیقی نثر کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ قطعیت سے مزین ہوتی ہے۔ نیر مسعود نے اپنے دعوؤں کو مدلل کرنے کے لیے چھوٹے سے چھوٹے حوالوں کو درج کرنے کا جس طرح التزام کیا ہے وہ انھیں تحقیق کے اعلیٰ مرتبے پر فائز کرتا ہے۔

■

Dr. Moidur Rahman
Associate Professor
Departmentof Urdu A.M.U
Aligarh-202002
Mob.: 8126410482
Email: moidjamia@gmail.com

مکتوبِ غالب میں شعرا کے کلام کی تصحیح

محمد شارب

غالب فطرتاً انفرادیت پسند اور جدت پسند تھے۔ وہ شاعری میں بھی پرانی اور پامال روشوں سے ہٹ کر چلے اور خطوط میں بھی انھوں نے اپنی ایک علیحدہ راہ نکالی۔ حالی نے ان کی اردو خطوط نگاری کی بڑی وجہ ضعف اور مصروفیات بیان کی ہیں۔ لیکن اس میں بڑا دخل ان کی انانیت اور جدت پسندی کا بھی ہے۔ انھوں نے خطوط نگاری کو مشغلے کے طور پر اپنایا اور بڑے اہتمام سے خطوط لکھے۔ ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا جس میں ہر سطح، رتبے اور حیثیت کے افراد شامل تھے جن میں بے تکلف دوست، شاگرد، اہل علم و قلم، ثقہ افراد اور والیانِ ریاست و نوابین کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے جن سے غالب کی کبھی بالمشافہ ملاقات نہ ہوئی تھی لیکن ان کے نام خطوط میں غالب نے ایسی اپنائیت اور خلوص کا اظہار کیا ہے گویا وہ ہمیشہ سے انھیں جانتے ہوں۔

غالب نے خطوط نگاری میں القاب و آداب کا رائج الوقت، پر تصنع اور آرائشی انداز بالکل ترک کر دیا اور اس کی جگہ بے تکلف اور سلیس اسلوب اختیار کیا۔ پنج آہنگ میں انھوں نے لکھا ہے کہ مکتوب الیہ کو اس کی حالت کے موافق کسی ایک لفظ سے پکارنا اور پھر فوراً اپنے مطلب کی بات شروع کر دینا چاہیے۔ القاب و آداب میں بے تکلفی کے ساتھ غالب نے خطوط میں ہمیشہ مدعا نگاری اور مطلب براری کو مرکزی اہمیت دی۔ وہ مطلب کی بات بغیر تمہید اور لفاظی کے براہ راست بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں اور جہاں بات یا مدعا ختم ہوتا ہے خط بھی ختم کر دیتے ہیں۔ ان کے خطوط کے موضوعات میں زندگی کی ہمہ رنگی موجود ہے۔ وہ اپنوں کی پریشانیوں اور رنج و ملال پر ان کی دلجوئی کرتے ہیں، خوشیوں اور مسرتوں پر دل سے خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اپنے خطوط میں کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور لکھتے ہیں جس سے مکتوب الیہ خوش ہو جاتا ہے یا اس کا تردد اور پریشانی رفع ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے شاگردوں کو اصلاح دینے میں بھی تہذیب و وضع داری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ خط کا جواب جلد از جلد دینا ان کی ترجیحات میں شامل تھا اور وہ خط میں تاریخ، دن بلکہ وقت تک لکھ دیتے تھے۔

ان کے خطوط کی سب سے اہم صفت شوخی و ظرافت اور تازگی و شگفتگی ہے۔ انھیں زندگی میں بہت سی تکالیف و مشکلات کا سامنا رہا لیکن انھوں نے ہر غم کو ہنسی میں اڑا دیا۔ اپنے کلام میں ہم ایک خوددار خود پسند اور خود بین غالب سے ملتے ہیں۔ خطوط میں ہم اُس غالب سے ملتے ہیں جو خوددار ہوتے ہوئے حالات کے سامنے بے دست و پا ہو گیا ہے۔ جو مادی ضرورتوں کے لیے امرا کے در پر جبیں سائی کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ یہ خطوط سوانحی اور تاریخی اعتبار سے بھی اہم ماخذ و مصادر کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں اُن کی نجی زندگی کے حالات و واقعات کے ساتھ اجتماعی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کے بھی بعض پہلو روشن ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔

غالب نے اپنے خطوط کے ذریعے نہ صرف اپنی ذاتی زندگی، دوست احباب، اعزا و اقربا، حالات کی ستم ظریفی اور اپنی شاعری کے سلسلہ میں گفتگو کی بلکہ دوسرے

شعرا کے کلام کی اصلاحات کر کے ان کے معائب و محاسن کی نشاندہی بھی کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خطوط اردو تنقید اور اصلاحِ شعر کا اہم ماخذ ہیں۔ غالب نے اپنے خطوط کے ذریعہ شعرا کے کلام کی علمی، فنی اور لسانیاتی و عروضی بنیاد پر اصلاح کی۔ غالب دوسروں کے کلام پر اصلاح محض ذوق کی بنیاد پر نہیں بلکہ علم عروض، بیان اور زبان کی صحت کی بنیاد پر کرتے تھے۔ وہ شعر کے اوزان، قوافی، ردیف، محاورہ، تذکیروتانیث، واحد جمع اور معانی پر توجہ دیتے تھے۔ اگر کسی شعر میں لفظ غیر موزوں ہوتا تو وہ اس کے بدلے بہتر لفظ تجویز کرتے۔ انھوں نے اپنے خطوط کے ذریعہ شعرا کے کلام کی تنقید و رہنمائی کا کام بھی انجام دیا۔ غالب نے اپنے عہد کے دیگر شعرا کے کلام پر کئی طرح کی اصلاحیں کیں جن میں لفظوں کے انتخاب، محاورات کا درست استعمال اور معانی و بیان میں خوبصورتی اور دلکشی شامل تھی۔ انھوں نے خاص طور پر اس بات پر زور دیا کہ کلام میں سادگی، فطری پن اور معنی کی گہرائی ہونی چاہیے، جیسا کہ ان کی اپنی شاعری میں نظر آتی ہے۔ اس سلسلہ میں غالب نے لفظوں کے چست درست انتخاب پر زور دیا۔ مشکل اور ناپسندیدہ الفاظ کے بجائے سادے اور بامعنی الفاظ کو ترجیح دی۔ محاورات کا برمحل استعمال کیا اور ان کے غلط استعمال کو سختی سے منع کیا۔ کلام میں خوبصورتی اور دلکشی پیدا کرنے کے لیے انھوں نے نئے انداز اور منفرد تراکیب کا استعمال کیا۔ ان کا خیال تھا کہ شاعری میں سادگی اور فطری پن ہونا چاہیے، تاکہ بات آسانی سے دلوں میں اتر جائے۔ غالب نے کلام میں معنی کی گہرائی پر بھی زور دیا تاکہ سننے والے اور پڑھنے والے کو سوچنے کا موقع ملے۔ غالب کے خطوط میں جگہ جگہ دوسرے شعرا کے اشعار پر تبصرے اور اصلاحات ملتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے اپنے شاگردوں جیسے عارف، مومن، ذوق وغیرہ کے اشعار پر اپنی مفصل رائے پیش کی۔ وہ خط کے توسط سے بتاتے تھے کہ شعر میں کہاں لغزش ہے اور کس طرح اسے درست کیا جاسکتا ہے۔

غالب کی یہ اصلاحات شعرا کی تربیت کی غرض سے ہوتی تھیں۔ ان کا مقصد صرف تنقید نہیں بلکہ شعری تربیت تھا۔ وہ اصلاح اس نیت سے کرتے تھے کہ شاعر اپنے فن میں پختگی پیدا کرے۔ ان کے خطوط میں اصلاح کے ساتھ ساتھ ادبی اصول بھی بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک

غالب نے خطوط نگاری میں القاب و آداب کا رائج الوقت، پر تصنع اور آرائشی انداز بالکل ترک کر دیا اور اس کی جگہ بے تکلف اور سلیس اسلوب اختیار کیا۔ پنج آہنگ میں انھوں نے لکھا ہے کہ مکتوب الیہ کو اس کی حالت کے موافق کسی ایک لفظ سے پکارنا اور پھر فوراً اپنے مطلب کی بات شروع کر دینا چاہیے۔ القاب و آداب میں بے تکلفی کے ساتھ غالب نے خطوط میں ہمیشہ مدعا نگاری اور مطلب براری کو مرکزی اہمیت دی۔ وہ مطلب کی بات بغیر تمہید اور لفاظی کے براہ راست بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں اور جہاں بات یا مدعا ختم ہوتا ہے خط بھی ختم کر دیتے ہیں۔

خط بنام ہرگوپال تفتہ میں غالب لکھتے ہیں:

''تمھارے شعر میں تردد تھا، اس کا جواب میں نے یہ لکھا ہے۔ تم کو بھی معلوم رہے۔

رفت آنچہ بہ منصور، شنیدی تو و من ہم
اے دل سخنے ہست، نگہ دار زباں را

تردد یہ کہ ''آنچہ بہ منصور رفت'' نہیں دیکھا 'آنچہ برمنصور رفت' درست ہے، جواب، ہائے موحدہ 'علی' کے معنی بھی دیتی ہے، پس جو کچھ 'بر' سے مراد تھی وہ ہائے موحدہ سے حاصل ہوگئی اور اگر ہائے موحدہ کے معنی معیت کے لیں تو بھی درست ہے۔''[1]

غالب کے خطوط میں کی گئی یہ اصلاحات اردو میں ادبی تنقید اور اصلاح زبان کی بنیاد قرار دی جاسکتی ہیں۔ ان کی نثر میں جو سادگی، سوجھ بوجھ اور فکری گہرائی ہے، وہ اصلاح کو موثر اور دلنشین بنا دیتی ہے۔ غالب نے خطوط کے ذریعے شعرا کے کلام کی تصحیح ذوق وشوق اور محبت کے ساتھ کی۔ انھوں نے شاعری کے فنی اصولوں کو آسان زبان میں سمجھایا اور اصلاح کو ادب کی خدمت بنا دیا۔ اس سلسلہ میں غالب نے اپنے شاگرد حالی یا ذوق کے شاگردوں جیسے شعرا کے اشعار کی اصلاح کی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنی باریکی سے کلام کی درستگی کرتے تھے۔ غالب کی اصلاح سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ محض مطلب نہیں دیکھتے تھے، بلکہ زبان کی صفائی، محاورے کی درستی اور روانی پر بھی زور دیتے تھے۔

ایک اور خط میں غالب اپنے شاگرد کو لکھتے ہیں:

''لفظوں کی کمی یا زیادتی سے شعر کا لطف جاتا ہے۔ شعر وہی بہتر ہے جس میں خیال صاف اور زبان شستہ ہو۔''[2]

غالب کا درج بالا انداز ظاہر کرتا ہے کہ غالب صرف استادِ شعر نہیں بلکہ اصلاح زبان و ذوق کے معمار تھے۔ انھوں نے اردو شاعری کو علمی، لسانی اور فکری بنیاد عطا کی۔

تذکیر وتانیث کے سلسلہ میں خود غالب نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ تذکیر وتانیث کی بحث متفق علیہ جمہور نہیں ہے خواہ وہ حروف تہجی کے متعلق ہو یا دوسرے الفاظ کے بارے میں اور یہ بحث ہے بھی اتنی پرانی کہ اس پر نہ جانے کتنے قرن بیت گئے لیکن ہنوز روز اول ہی ہے۔ اپنے ایک خط بنام انورالدولہ شفق میں لکھتے ہیں:

''تذکیر وتانیث کا دائرہ بہت وسیع ہے، 'دہی': بعض کہتے ہیں 'دہی اچھا' بعض کہتے ہیں 'دہی اچھی'، 'قلم': کوئی کہتا ہے 'قلم ٹوٹ گیا'، کوئی کہتا ہے 'قلم ٹوٹ گئی'، فقیر 'دہی' کو مذکر بولتا ہے اور قلم کو بھی مذکر جانتا ہے، علیٰ ہٰذا القیاس، 'شنگرف' بھی مذبذب ہے کوئی مذکر اور کوئی مونث کہتا ہے۔ میں تو 'شنگرف' کو مونث کہوں گا، خلاصہ یہ کہ اس ہیچمداں کے نزدیک 'کردن' کا متعدی 'کنانیدن' ہے اور 'شنگرف' مونث۔''[3]

ایک دیگر خط میں مزید لکھتے ہیں:

''تذکیر وتانیث ہرگز متفق علیہ جمہور نہیں، اے لو 'لفظ' اس ملک کے لوگوں کے نزدیک مذکر ہے، اہل یورپ اس کو مونث بولتے ہیں، خیر جو میری زبان پر ہے

وہ میں لکھ دیتا ہوں۔ اس باب میں کسی کا کلام حجت اور برہان نہیں ہے۔......اس کا قاعدہ منضبط نہیں، الف مذکر، ب ت ث مونث، جیم مذکر، ح خ مونث، دال ذال مونث، رے زے مونث، سین شین مذکر، ص ض ط ظ مونث، عین غین مذکر، ف مونث، قاف، کاف، لام، میم، نون مذکر، واو، ہے، یے مونث، ہمزہ مذکر، لام الف حروف مفردہ میں نہیں، مگر بولنے میں مذکر بولا جائے گا، مثلاً 'لام الف کیا خوب لکھا ہے' کہیں گے 'کیا خوب لکھی ہے' نہیں کہیں گے۔"[4]

درج بالا خط میں غالب' جس صلح جویانہ اور منصفانہ رنگ میں نظر آتے ہیں اس میں نہ کوئی 'اجتہاد' ہے نہ تفاخر علمی کی جھلک بلکہ انھوں نے ایک طرح سے اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے کی سعی کی ہے۔ غالب کے اس خط کی سب سے بڑی اہمیت یہی ہے کہ یہ خط حروف تہجی کی تذکیروتانیث پر مشتمل ہے۔

منشی شیونرائن آرام کے نام ان کے ایک قطعہ پر اپنی رائے دیتے ہوئے غالب لکھتے ہیں:

"قصۂ خاصان شاہی' میں نے دیکھا، اصلاح کے باب میں سونچا کہ اگر سب فقروں کو مقفی اور عبارت کو رنگین بنانے کا قصد کروں تو کتاب کی صورت بدل جائے گی اور شاید تم کو بھی یہ منظور نہ ہو، ناچار اس پر قناعت کی کہ جو الفاظ ٹکسال باہر تھے وہ بدل ڈالے، مثلاً 'وے' کہ یہ گنوار بولی ہے، 'وہ' یہ ٹھیٹ اردو ہے، 'کرانا' یہ بیرونجات کی بولی ہے، 'کروانا' یہ فصیح ہے، 'راجے' یہ غلط ہے، 'راجہ' صحیح ہے، کہیں کہیں روابط وضمائر نامربوط تھے، اون کو مربوط کر دیا ہے اور ایک جگہ 'گھنے بنے' یہ لفظ میری سمجھ میں نہ آیا: اس کو تم سمجھ لینا، باقی اور سب مربوط اور خوب اور صاف ہے، حاجت اصلاح کی نہیں۔"[5]

درج بالا خط میں غالب بلاغت اور معنوی توازن کی اصلاح کرتے ہیں یعنی مفہوم میں تضاد نہ ہو بلکہ زور پیدا ہو۔ غالب کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شعرا کو وزن، قافیہ اور ردیف کی درستی، محاورے اور زبان کی صفائی، خیال اور معنی کی گہرائی پر توجہ دینے کی ہدایت دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خطوط اردو تنقید، زبان اور فنِ اصلاحِ شعر کا بنیادی سرمایہ مانے جاتے ہیں۔ غالب کے یہ خطوط اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ شاگردوں کو محبت سے سمجھاتے تھے، لفظ، محاورہ، اور خیال — تینوں پہلوؤں کی اصلاح کرتے تھے، اور اصلاح کو ادبی تربیت کا حصہ سمجھتے تھے۔

مرزا غالب اردو ادب میں نہ صرف ایک عظیم شاعر تھے بلکہ اصلاحِ شعر کے ماہر اور باریک بین نقاد بھی تھے۔ انھوں نے اپنے خطوط کے ذریعے کئی شعرا کے کلام کی اصلاح کی۔ ان کے خطوط میں شاگردوں کے اشعار پر علمی، فنی اور لسانی بنیادوں پر تبصرے ملتے ہیں۔ غالب اصلاح دیتے وقت شعر کے وزن، قافیہ، ردیف، محاورے اور معنی سب پہلوؤں کو دیکھتے تھے۔ ان اصلاحات سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی نظر نہ صرف فنِ شاعری پر گہری تھی بلکہ وہ زبان کی صفائی، خیال کی وضاحت اور معنی کی صحت پر بھی زور دیتے تھے۔ شاعری میں زبان اور ادبیت کے وہ حددرجہ قائل تھے اور اس کی خلاف ورزی پر نیز معیار شاعری کے خلاف تخلیق کیے گئے اشعار پر وہ چیں بہ جبیں ہو جاتے تھے۔ اس سلسلے میں منشی شیونراین آرام کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"بھائی!

حاشا ثم حاشا، اگر یہ غزل میری ہو، 'اسد اور لینے کے دینے پڑے' اوس غریب کو میں کچھ کیوں کہوں؟ لیکن اگر یہ غزل میری ہو تو مجھ پر ہزار لعنت، اس سے

آگے ایک شخص نے یہ مطلع میرے سامنے پڑھا اور کہا کہ قبلہ آپ نے کیا خوب مطلع کہا ہے۔

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر، شاباش، رحمت خدا کی

میں نے یہی اون سے کہا کہ اگر یہ مقطع میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔"[6]

غالب کے خطوط اردو شاعری کی تنقید، زبان کی درستی اور ادبی تربیت کے لیے قیمتی سرمایہ ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اپنے خطوط میں تمام لوازماتِ خطوط نگاری کا اہتمام کیا بلکہ اپنے عہد کے شعرا کے کلام کی ادبی، لسانی اور عروضی اصلاحات بھی کیں۔

حواشی

1 خطوط غالب، مرتبہ مالک رام، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ 1962، ص:13

2 ایضاً، ص:32

3 ایضاً، ص:204

4 ایضاً، ص:228

5 ایضاً، ص:427

6 ایضاً، ص:437

■

Dr. Mohammad Sharib
Assistant Professor in Urdu
P.G. Department of Language & Literature
Fakir Mohan University, Balasore,756089-Odisha
Mob. 7032775100
Email: mohdsharibkhan54@gmail.com

غالب کے خطوط اردو شاعری کی تنقید، زبان کی درستی اور ادبی تربیت کے لیے قیمتی سرمایہ ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اپنے خطوط میں تمام لوازماتِ خطوط نگاری کا اہتمام کیا بلکہ اپنے عہد کے شعرا کے کلام کی ادبی، لسانی اور عروضی اصلاحات بھی کیں۔

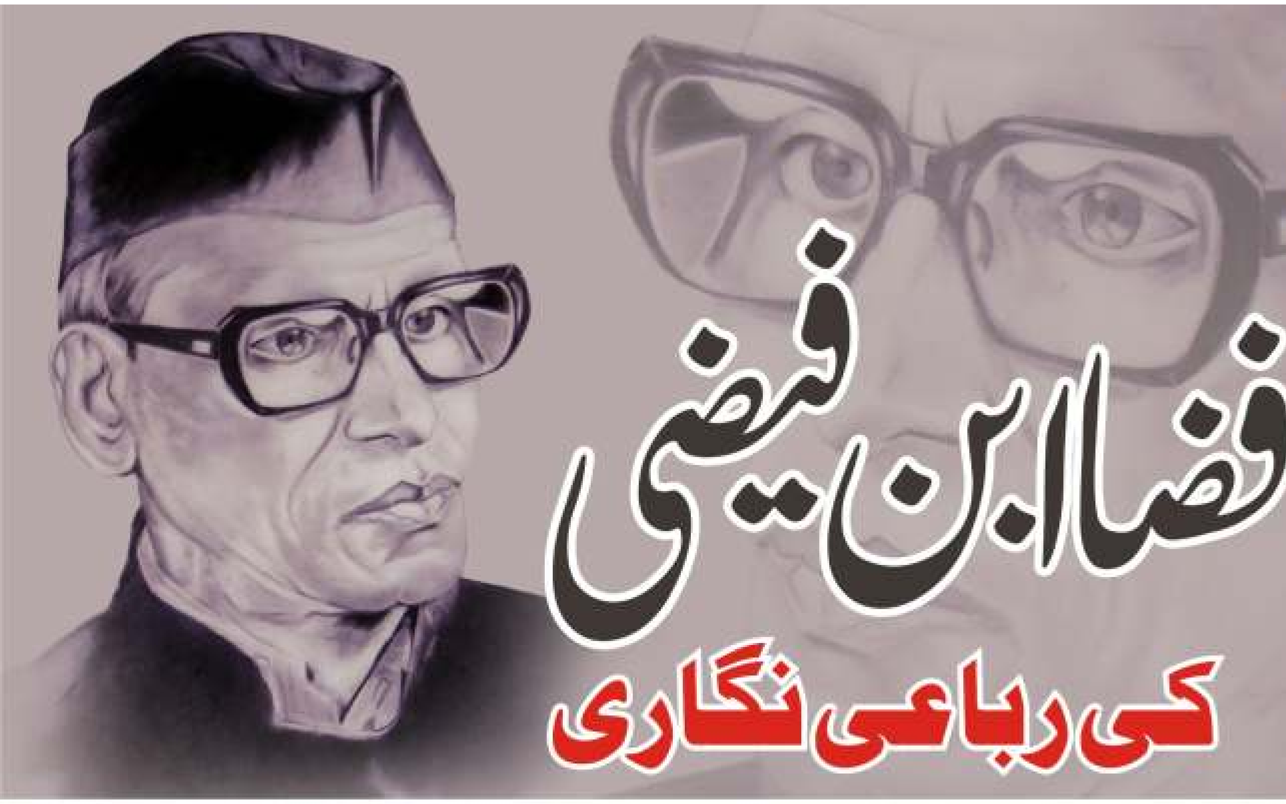

امتیاز ندیم

فضا ابن فیضی کی رباعی نگاری

فیض الحسن فضا ابن فیضی 1923 میں قصبہ مئو ناتھ بھنجن میں پیدا ہوئے۔ یہ قصبہ شاہجہاں کی بیٹی بیگم جہاں آرا کو جاگیر میں ملا تھا۔ قدیم زمانے سے مئو ناتھ بھنجن پارچہ بافی کے لیے مشہور ہے۔ تعلیم و تعلم سے بھی اس قصبہ کا گہرا رشتہ رہا ہے۔ یہاں کے جامعہ عالیہ عربیہ کو مشرقی یوپی کا اولین ادارہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ مولانا سخاوت علی جونپوری کے خلیفہ اور مولانا شبلی نعمانی کے استاد مولانا فیض اللہ مئوی نے اس ادارے کو 1868 میں قائم کیا تھا۔ فضا ابن فیضی کی ابتدائی تعلیم اسی ادارے میں ہوئی۔

فضا ابن فیضی کے والد مولانا منظور حسن فارغ التحصیل عالم تھے۔ ان کا ذریعۂ معاش تجارت تھا۔ تکمیل تعلیم کے بعد فضا صاحب نے بھی اسی تجارت کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا۔ فضا صاحب کے دادا مولانا ابوالمعالی محمد علی فیضی اپنے دور کے مشہور عالم دین تھے۔ حدیث و تفسیر اور تحقیق و تصنیف ان کا خاص علمی میدان تھا۔ اسی کے ساتھ شعر و ادب کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ اردو، عربی، فارسی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فضا صاحب کو شعری وراثت یہیں سے ملی اور عرب شعرا کی طرح اپنی نسبت دادا کی طرف منسوب کرتے ہوئے خود کو فضا ابن فیضی لکھتے رہے۔

فضا ابن فیضی کا تعلیمی سلسلہ جامعہ عالیہ عربیہ سے شروع ہوا۔ دینی تعلیم کے ساتھ عربی و فارسی علوم بھی حاصل کیے اور جامعہ اسلامیہ فیض عام مئو سے سند فراغت حاصل کی، ان کے اساتذہ میں مولانا محمد سلیمان، مولانا عبداللہ شائق، مولانا محمد احمد، مولانا عبدالرحمٰن جیسے جید علما تھے۔ دوران طالب علمی سے ہی فضا صاحب کو شاعری کا ذوق ہوا جس میں روز بروز پختگی آتی گئی۔ انھوں نے مئو کے مشہور فارسی عالم فیض الحسن فیض سے مشورۂ سخن لیا اور مولانا فیض صاحب جب تک باحیات رہے، شاگردی کا یہ سلسلہ برقرار رہا۔

فضا ابن فیضی عربی و فارسی کے جید عالم تھے جس کا ثبوت ان کے اشعار سے ملتا ہے انھوں نے طویل مدت تک شاعری کی۔ ان کی شعری توانائی اور رعنائی کا معترف برصغیر کا ہر صاحب نظر نقاد ہے انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا ان کی پہلی تخلیق ان ہی کے قول کے مطابق غزل کے فارم میں تھی لیکن جلد ہی نظم کی طرف مائل ہوگئے۔ کیونکہ طبیعت کا رجحان زیادہ دور تک غزل کا ساتھ نہیں دے سکا، طویل مدت تک نظم گوئی کے بعد غزل کی طرف مراجعت ہوئی۔ دونوں ادوار میں دونوں صنف کے ساتھ ان کا تعلق برقرار رہا، نظم گوئی کے دور میں غزل سے رشتہ یکسر ختم نہیں ہوا۔ گاہے گاہے غزلیں کہتے رہے۔ اسی طرح جب غزل کی طرف مائل ہوئے تو اس دور میں بھی نظم کہتے رہے۔ یہ الگ بات کہ غزلوں کی تعداد نظموں سے کہیں زیادہ ہے۔

فضا ابن فیضی نے تشبیہات و استعارات کے نئے نئے پیکر تراشے ہیں۔ انھوں نے جن ترکیبوں کو اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے، اسے پوری طرح اردو کا مزاج عطا کیا ہے۔ فنی آگہی، زبان دانی اور شعری تجربوں نے ان کے اسلوب بیاں کو نیا آہنگ شاعری عطا کیا ہے۔

ان کے یہاں لب و لہجے کے ساتھ ساتھ فکر و خیال کی جدت اور تنوع کا ایک نیا جہان ملتا ہے جو ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کو سند اعتبار بخشتا ہے۔ ان کے تجربے اور خیال کی عکاسی کے ساتھ عصری حسیت اور بصیرت کا رشتہ کہیں کمزور نظر نہیں آتا ہے۔ زندگی کے مسائل، سماجی اور تہذیبی عوامل کو اپنے پختہ شعور کی بھٹی میں تپاکر جب فن پارے کا پیکر ڈھالتے ہیں تو اس فن کو ابدیت حاصل ہوجاتی ہے انھوں نے بہت سی نظمیں ہنگامی حالات اور وقتی ضرورت کے تحت تخلیق کی ہیں۔ مگر اس انداز میں کہ وہ جزو زندگی بن گئیں۔

غزلوں اور نظموں کے علاوہ فضا ابن فیضی نے رباعیات بھی تخلیق کی ہیں اور رباعی کے تمام لوازمات کو برتا ہے۔ یقیناً رباعی کا فن ارتکاز کا مطالبہ کرتا ہے رباعی میں ایک ایک لفظ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ مخصوص بحر کے ساتھ ساتھ مصرعوں کی ترتیب اور موزونیت اس فن کے لیے لازمی ہیں۔ خیال کی اہمیت اور فکر کی ندرت تجربہ و ادراک کے بغیر ممکن نہیں اور ان خصوصیات کے ساتھ ہی رباعی کی مکمل تخلیق ہوتی ہے۔ فضا صاحب کے یہاں یہ مواد پوری فراوانی کے ساتھ موجود ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ان کی غزلوں اور نظموں میں نظر آتا ہے۔

فضا ابن فیضی کا اسلوب بیان، بلندی افکار اور مضامین کے تنوع کا جو انداز ان کی غزلوں اور نظموں میں پایا جاتا ہے، وہ سب ان کی رباعیوں میں بھی موجود ہے۔ ان کے کلام کی پختگی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر اسلوب و آہنگ میں ان کا رنگ یکساں ہے۔ مواد کی فراوانی اور فکر کی توانائی ان کی رباعیوں کا خاص وصف ہے۔ فضا صاحب کے یہاں جس طرح رمزیت، ایمائیت، محرومیت، محزونیت، سوز و گداز، ناز و انداز جیسے غزل کے موضوعات پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتے ہیں، اسی طرح یہ تمام لوازمات ان کی رباعیوں میں بھی موجود ہیں۔ ان کا آہنگ و اسلوب اور لب و لہجہ خاص ان کا اپنا ہے جو ان کی پہچان ہے۔ انھوں نے غزل اور غزل سے متعلق اپنے خیالات کی ترجمانی اپنی رباعی میں ''کربِ تخلیقِ فن'' کے عنوان سے کچھ اس طرح کی ہے۔

دل خون ہو، تب شعر کنول بنتا ہے
افکار کا اک تاج محل بنتا ہے
آساں نہیں تربیت وجدان و شعور
مشکل سے کوئی جذبہ غزل بنتا ہے

غزل افکار کا اک تاج محل ہوتا ہے اور یہ ہنر وجدان و شعور کی خاص تربیت کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ غزل محض لفظوں کی جادوگری اور شعبدہ بازی نہیں ہے، بلکہ اس میں نکتہ سنجی اور دروں بینی کی ضرورت ہوتی ہے۔ فضا ابن فیضی نے ''شعبدہ گر'' کے عنوان سے اپنی اس فکر کا اظہار ایک رباعی میں کیا ہے۔

وہ کام کرو نکتہ نگر کہلاؤ
روحِ ادب و جانِ ہنر کہلاؤ
برتو نہ وہ اسلوب سخن دیدہ ورو!
لفظوں کے فقط شعبدہ گر کہلاؤ

فضا کے یہاں عصری حسیات کے ساتھ ساتھ وقت اور زمانے کے حالات کا گہرا مطالعہ ملتا ہے۔ ان کی فکر انگیزی پر مشتمل دو رباعیات ''خبر نامہ'' اور ''مسیحا'' کے عنوان سے ملاحظہ فرمائیں۔

کڑوی ہے مگر بات ہے سچی دراصل
کٹتی ہے یہاں روز نئی لاشوں کی فصل
اک فاختۂ امن نے کل مجھ سے کہا
زندہ ہے ابھی خونی عقابوں کی وہ نسل

پھولوں کو مہکنے کی سزا دیتے ہیں
مرہم کو جراحت کا صلہ دیتے ہیں
اس دور کے ٹھہرے ہیں مسیحا وہ لوگ
جو روح کو زخموں کی قبا دیتے ہیں

مندرجہ بالا رباعیات میں حالات پر تیکھا طنز بھی ہے اور تشویش کا اظہار بھی یہ رباعیات فضا صاحب کی صالح فکر و نظر کی عکاس ہیں۔ فضا صاحب وقت اور حالات سے مرعوب نہیں ہوتے بلکہ ان پر شدید تنقید کرتے ہیں اور یہ ایک باصلاحیت شاعر کی فکری و ذہنی عظمت کی علامت ہے۔ حالات و واقعات کی غیر متوازی روش پر ان کا نظریہ واضح اور حقیقت پسندانہ ہے۔ کچھ ایسا ہی انداز ان کی ایک رباعی میں ملتا ہے

فضا ابن فیضی کا اسلوب بیان، بلندی افکار اور مضامین کے تنوع کا جو انداز ان کی غزلوں اور نظموں میں پایا جاتا ہے، وہ سب ان کی رباعیوں میں بھی موجود ہے۔ ان کے کلام کی پختگی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر اسلوب و آہنگ میں ان کا رنگ یکساں ہے۔ مواد کی فراوانی اور فکر کی توانائی ان کی رباعیوں کا خاص وصف ہے۔ فضا صاحب کے یہاں جس طرح رمزیت، ایمائیت، محرومیت، محزونیت، سوز و گداز، ناز و انداز جیسے غزل کے موضوعات پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتے ہیں، اسی طرح یہ تمام لوازمات ان کی رباعیوں میں بھی موجود ہیں۔

جس کا عنوان ''جرم بے گناہی'' ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

حق بات کی تائید کروں تو مجرم
حالات پہ تنقید کروں تو مجرم
تم جرم کی تخلیق کرو تو معصوم
میں جرم کی تردید کروں تو مجرم

فضا ابن فیضی خود بینی اور خود شناسی کی حقیقت سے آشنا تھے۔ ان کا یقین تھا کہ خود شناسی خدا شناسی کا ذریعہ ہے۔ انھیں اپنی ذات کا عرفان تھا۔ وہ اپنے کمال فن کو اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے۔ اپنے اسی کمال فن کے ذریعہ شعر و ادب کی سنگ تراشی جس خوبصورت انداز میں انھوں نے کی ہے اس سے فن آزر بھی شرمندہ ہے۔ ان کی تحریروں نے رگِ گل میں بہارِ نو کا لہو جاری کر دیا۔ ''ذہن تازہ کار'' میں ان کی اس فنکاری کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

تخئیل میں فن کا چم و خم رکھتا ہوں
پوجیں جسے آزر وہ صنم رکھتا ہوں
تحریر میں ہیں میری خط و خال بہار
ہاتھوں میں رگ گل کا قلم رکھتا ہوں

اپنی ذات کے عرفان کی وضاحت ان کی رباعی ''خود شناسی'' میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔

ہم شیوۂ گل بادِ صبا کو پایا
ہم رشتۂ لب حرف دعا کو پایا
کہتے ہیں اسے ذات کا عرفاں شاید
ہم خود میں جو ڈوبے تو خدا کو پایا

فضا صاحب منکسر المزاج، کم گو، تہذیب پسند اور وضع دار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے نزدیک ایک اچھے بشر کی پہچان یہی اوصاف ہیں اور یہ اندازیوں ہی کسی انسان میں پیدا نہیں ہو جاتے بلکہ میر تقی میر کے قول کے مطابق۔

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

وہ ہمیشہ ان صحت مند اقدار کے حامی رہے ہیں اور ان کا جا بجا اظہار ان کی شاعری میں ہوتا رہا ہے۔ ان کی ایک رباعی ''تعمیر شخصیت'' میں اس وصف کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

گلگونۂ رخسار بشر بنتا ہے
سرچشمۂ ادراک نظر بنتا ہے
ڈھلتا نہیں ہیرے میں یوں ہی پارۂ سنگ
صدیوں میں کوئی عیب ہنر بنتا ہے

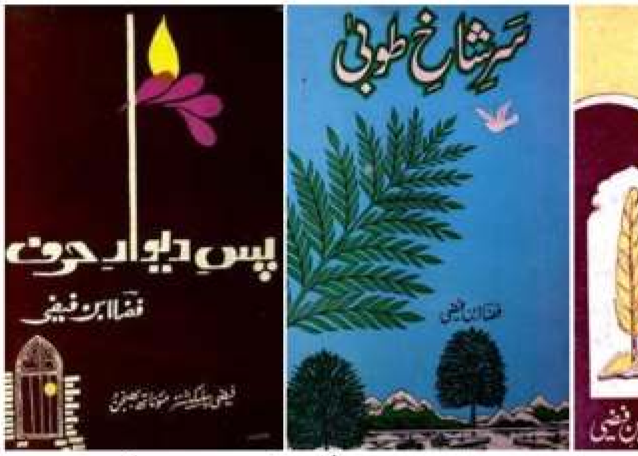

فضا ابن فیضی کے نزدیک اصول پرستی اور اصول پسندی اچھے انسان کے لیے ضروری ہے۔ اصول پرستی اچھے کردار کی ضمانت ہوتی ہے۔ جو لوگ اصول پسند نہیں ہوتے، ان کے یہاں کردار کشی عام بات ہوتی ہے۔ یہ کردار کشی اپنی بھی ہوسکتی ہے اور اپنوں کی بھی۔ ان کی ایک رباعی جس کا عنوان ہی ''کردار کشی'' ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

کردار کے پھولوں کو نہ سولی پہ چڑھاؤ
معصوم رسولوں کو نہ سولی پہ چڑھاؤ
اے زندگی نو کے علم بردارو!
خود اپنے اصولوں کو نہ سولی پہ چڑھاؤ

فضا صاحب عظمتِ رفتہ کی پاسداری اور پاسبانی کے قائل تھے۔ ماضی کی تہذیبی روایتیں زندگی کا قرینہ سکھاتی ہیں۔ انھیں اقدار کے میزان میں قوموں کا عروج وزوال تلتا ہے۔ وہی ہماری تاریخ اور ہمارے بزرگوں کی بنائی ہوئی شاہراہ ہے جس پر چل کر ہم آج کی منزل کا پتہ پاتے ہیں، عظمت رفتہ کے زوال پر فضا صاحب کافی رنجیدہ ہیں جس کا اظہار ''کاروانِ رفتہ'' کے عنوان سے کیا ہے۔

وہ میرے قبیلے، مرے طبقے کے لوگ
اوجھل ہوئے آنکھوں سے قرینے کے لوگ
شائستہ کب اتنی ہے یہ امروز کی نسل
آتے ہیں بہت یاد وہ پہلے کے لوگ

فضا ابن فیضی کی شاعری میں جہاں عصری حسیات اور سنجیدہ احساسات کا بھرپور فنکارانہ استعمال ملتا ہے، وہیں کلاسیکی کیفیات، سلگتے جذبات اور جمالیاتی نشاط کی فکر انگیزیاں اور شگفتہ طرازیاں بھی موجود ہیں۔ ان کا رومانی ذہن وجدان وشعور اور عرفان وبصیرت کی روشنی سے منور ہوتا ہے۔ شاعری کے یہ لوازمات ان کی غزلوں اور نظموں کے ساتھ ساتھ ان کی رباعیوں میں بھی موجود ہیں۔ اردو شاعری کے ہر دور میں عشقیہ جذبات واحساسات رباعی کا حصہ رہے ہیں، اگرچہ اس میں تصوف، اخلاق، پند ونصائح اور دیگر سماجی موضوعات استعمال ہوئے ہیں، مگر عموماً دیکھا جاتا ہے کہ عشقیہ مضامین سے مزین رباعی زیادہ مقبول ہوئی ہے۔ چاہے وہ دکنی ادب ہو یا شمالی ہند کی شاعری ہو۔ فضا ابن فیضی نے ان روایتوں سے انحراف نہ کرتے ہوئے اپنی بعض رباعیات میں جمالیاتی اور کلاسیکی موضوعات پیش کیے ہیں۔ جیسے ''شب عنبریں'' عنوان کے تحت ان کی ایک رباعی ہے۔

مستی میں جنوں بھیگ رہا تھا کل رات
کونین کی آنکھوں میں نشا تھا کل رات
کیا کہیے، کوئی پھول کی خوشبو کی طرح
پیراہن خلوت میں بسا تھا کل رات

فضا ابن فیضی تشبیہات واستعارات کے ذریعہ جذبہ وتخیل کی نئی معنویت سے روشناس کراتے ہیں۔ ''شگفتن گل ہائے ناز'' اور ''شعلۂ عریاں'' یہ دو رباعیاں ان کے اس تجربہ کا پتہ دیتی ہیں۔

بے موسم گل مہک رہا ہے وہ بدن
پیمانہ صفت چھلک رہا ہے وہ بدن
افسون صبا ہے کہ میرے ہاتھ کا لمس
غنچے کی طرح چٹک رہا ہے وہ بدن

سانچے میں شباب کے ڈھلتے ہوئے وہ جسم
غمزوں کے فشار سے مچلتے ہوئے وہ جسم
خلوت میں لپک اٹھتے ہیں کوندے کی طرح
آغوش کی گرمی سے پگھلتے ہوئے وہ جسم

اسی ضمن میں ان کی ایک رباعی ''بیت الغزل'' بھی توجہ کے لائق ہے۔

یہ بحث نہیں، کیا لکھو، کیا نہ لکھو
مقصد یہ ہے، جو کچھ لکھو، اچھا لکھو
احساس میں تیرے گی غزل کی خوشبو
ان کا نہ سہی اپنا ہی قصا لکھو

فضا ابن فیضی زندہ ادب کے ترجمان تھے اور زندہ ادب وہ ہے جو ماحول اور سماج کے نشیب وفراز کی سچی عکاسی کرتا ہے۔ فضا ابن فیضی نے اپنی شاعری میں معاشرے کی تباہ حالی اور تہذیب کی کج روی کی عاجزانہ انداز میں عکس بندی کی ہے۔ وہ بیدار اور بالیدہ شعور کے مالک تھے۔ اپنے گرد وپیش کے حوصلہ فرسا حالات سے چشم پوشی نہ کرتے ہوئے تہذیبی نقصانات کا برملا اظہار کرتے تھے۔ ان کی کچھ رباعیاں ''ہار گئے'' کی ردیف میں ہیں۔ ان رباعیات کو انھوں نے ''اعترافِ شکست'' کا عنوان دیا ہے۔ ان رباعیات میں فضا صاحب کی قادر الکلامی پوری طرح ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ''اعتراف شکست'' کی کچھ رباعیاں درج ذیل ہیں۔

فضا ابن فیضی کی شاعری میں جہاں عصری حسیات اور سنجیدہ احساسات کا بھرپور فنکارانہ استعمال ملتا ہے، وہیں کلاسیکی کیفیات، سلگتے جذبات اور جمالیاتی نشاط کی فکر انگیزیاں اور شگفتہ طرازیاں بھی موجود ہیں۔ ان کا رومانی ذہن وجدان وشعور اور عرفان وبصیرت کی روشنی سے منور ہوتا ہے۔

سب عشوہ و انداز و فسوں ہار گئے
سو عالمِ آشوب و سکوں ہار گئے
کھا جائیں گے یوں چوٹ یہ معلوم نہ تھا
ہم عقل کی بازی میں جنوں ہار گئے

ساز و قدح و رنگ و نوا ہار گئے
یا دولت و ناموس و قبا ہار گئے

لگتے ہیں تہی دست سے، لیکن یارو!
یہ بھی نہیں معلوم کہ کیا ہار گئے
وہ رنگ، وہ رعنائی ، وہ رس ہار گئے
وہ ناقہ، وہ محمل وہ جرس ہار گئے
اے دل کی جواں دھڑکنو! پیچھا چھوڑو
جینے کے لیے تھا جو نفس ہار گئے
دل ہار گئے، ذہن و نظر ہار گئے
جیتی ہوئی سب شرط ہنر ہار گئے
حالات کی سختی نے قلع توڑ دیا
لو، آج ہم اک اور سحر ہار گئے

فضا ابن فیضی نے اپنی رباعیات میں ان تمام موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے جو شاعری کی دیگر اصناف میں پائے جاتے ہیں۔ غزلوں، نظموں، قطعات اور ترانوں کی طرح حمد ونعت ومناجات میں بھی ان کی قادر الکلامی اور بیدار ذہنی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اردو رباعیات کی تاریخ میں مذہبی شاعری حمد، نعت اور منقبت پر مشتمل خاصی تعداد میں رباعیاں موجود ہیں۔ تقریباً تمام رباعی گوشعرانے اس موضوع کو اپنایا ہے۔ فضا ابن فیضی کے یہاں بھی حمد، نعت اور دعائیہ کلام رباعی کی صورت میں موجود ہیں۔ نعت میں انھوں نے کافی احتیاط سے کام لیتے ہوئے عقیدے کو متزلزل ہونے سے محفوظ رکھا۔ نبیؐ کی شان میں گفتگو کرتے وقت ان کی عالمانہ صفت کو فضا صاحب نے بڑے خوبصورت اور مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔ لفظ ''امی'' جو نبی اکرمؐ کے لیے اکثر استعمال ہوتا ہے، فضا صاحب

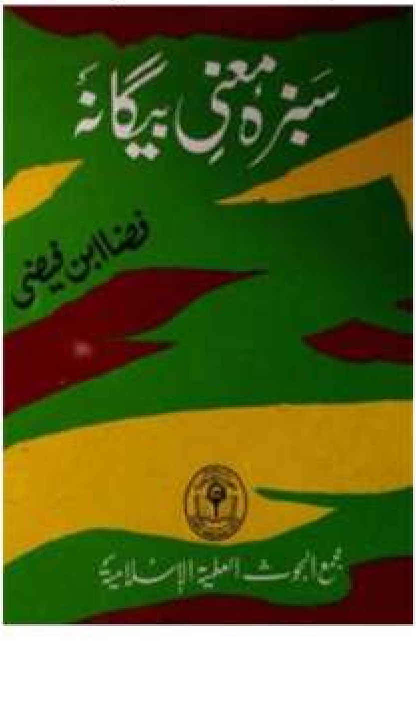

نے اس لفظ کے عمومی معنی سے احتراز کرتے ہوئے ایک الگ تشریح پیش کی ہے جو نبیؐ کی شان کے عین مطابق ہے۔ ''نبی امی'' عنوان کے تحت ان کی یہ رباعی اس لفظ کی تفہیم وتشریح میں معاون ہوگی۔

محدود ہیں کس تنگ گلی تک ہم لوگ
پہنچے نہ تری حرف رسی تک ہم لوگ
'' دانشکدۂ غار حرا'' کے فاضل
اُمی تجھے کہتے ہیں ابھی تک ہم لوگ

اسی انداز کی دوسری رباعی ''امیت بعد نبوت'' ملاحظہ فرمائیں۔

افہام بھی، تفہیم بھی بیکار گئی
''اقراء'' کی وہ تقدیم بھی بیکار گئی
اُمی کا یہ مطلب ہے بہ الفاظ دگر
جبریل کی تعلیم بھی بیکار گئی

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ رسول اکرم کو جبریل نے بحکم خداوندی 'اقراء' کی پہلی تعلیم دی۔ آپ نے کسی دنیاوی درس گاہ میں کسی انسان کے سامنے زانوے درس تہ نہیں کیا۔ ان کی تمام تعلیمات جبریل امین کے ذریعہ اللہ کے حکم سے ہوئیں۔ فضا ابن فیضی فارغ التحصیل عالم اور سلفی العقیدہ تھے اس لیے ان کے یہاں افکار وعقائد میں لغزش کی امید نہیں کی جاسکتی۔ عقیدہ وایمان کی حقیقت سے وہ بخوبی واقف تھے، اس لیے نبی آخرالزماںؐ کے تعلق سے گفتگو کرتے وقت وہ ہر پہلو کو نظر میں رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی نعتیہ شاعری میں جابجا ''اُمی'' لفظ کی حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ مندرجہ بالا دو رباعیوں کے علاوہ ایک اور رباعی اسی خیال کی تشریح ہے۔

''تلمیذ جبریل'' کے عنوان سے درج ذیل رباعی ملاحظہ کریں۔

معیار حرا بافتۂ جبرئیل
میزان نفس تافتۂ جبرائیل
خاکم بدہن ، کیوں تجھے نا خواندہ کہوں
اے شیخ سند یافتۂ جبرائیل

نعتیہ فکر کے ساتھ ساتھ حمدیہ اور دعائیہ انداز بھی ان کی رباعیات میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اللہ 'رب العالمین' ہے۔ ساری دنیا اسی کے فیض وکرم کی محتاج ہے۔ وہ اپنی رحمتیں ان پر بھی نازل کرتا ہے جو اس پر ایمان لاتے ہیں اور ان پر بھی جو اس سے منحرف ہیں۔ اس

فضا ابن فیضی نے اپنی رباعیات میں ان تمام موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے جو شاعری کی دیگر اصناف میں پائے جاتے ہیں۔ غزلوں، نظموں، قطعات اور ترانوں کی طرح حمد و نعت و مناجات میں بھی ان کی قادر الکلامی اور بیدار ذہنی دیکھنے کو ملتی ہے۔

کے جود وکرم کی بارش سب پر یکساں ہے۔ بندوں کے اعمال کے حساب سے سزا اور جزا کا معاملہ الگ ہے۔ لیکن کسی گناہ کے یا حکم الٰہی سے انکار کے سبب مخلوق پر آب ودانہ کی نوازش کا سلسلہ نہیں رکتا۔ یہی اس کی ربوبیت ہے۔ کیونکہ وہ رحیم ورحمٰن ہے۔ فضا ابن فیضی نے کچھ رباعیاں ان موضوعات کے تحت تخلیق فرمائی ہیں۔ ان میں سے تین رباعیاں ''ربوبیت''، ''حرف سوختہ'' اور ''عرفان'' کے عنوان سے یہاں پیش کی جارہی ہیں۔

جود و کرم و رافت و احساں سب پر
رحمت کا سحاب گوہر افشاں سب پر
انسان و ملائک، چرند اور پرند
فیضان ربوبیت ہے یکساں سب پر

ناکام ہوں، کامیاب کر دے یارب
تاریک ہوں آفتاب کر دے یارب
ہے لب پر جو یہ سوختہ سا حرفِ دعا
اس شعلے کو اب گلاب کر دے یارب

دل کی تڑپ، آنکھوں کو نظر کب دے گا
اس راکھ کو بالیدہ شرر کب دے گا
اے تو، کہ تری ذات سے خود روشن ذات
مجھ کو مرے مرنے کی خبر کب دے گا

فضا ابن فیضی کی رباعیات کے تعلق سے یہ مختصر خاکہ ان کی رباعی گوئی کو سمجھنے میں یقیناً معاون ہوگا۔ نہ صرف ان کی رباعی گوئی، بلکہ جملہ آہنگ شاعری کی ادنیٰ سی جھلک ان تحریروں کی روشنی میں دیکھی جاسکتی ہے، اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ موجودہ دور کے رباعی گوشعرا میں ان کا منفرد مقام ہے۔ ان کی شاعری میں دیگر اصناف کی طرح رباعیات بھی اسلوبیاتی تنوع کی نادر مثال ہیں۔

■

Dr. Imteyaz Nadeem
Global Pharma
Sattar Market, Faizi Gate
Doman Pura, Maunath Bhanjan U.P.275101
Mob. 9889283360
Email: faheembooks@gmail.com

محمد طارق

مرزا جعفر اوج کی مرثیہ نگاری

مرثیہ اردو کی اہم ترین، زندہ اور متحرک صنف سخن ہے اس کی ابتدا دکن میں ہوئی۔ اس صنف میں ماحول، تہذیب اور زمانے کو اپنے اندر سمو لینے کی پوری صلاحیت ہے۔ یہ انفرادی طور پر کسی فرد یا قوم کی شاعری نہیں بلکہ پوری تہذیب، قوم اور معاشرے کی آواز بن کر بلند ہوئی ہے۔ مرثیہ کے احساساتی آہنگ کو صبر و تحمل اور ایثار و قربانی نے توانائی بخشی ہے۔ لہٰذا مرثیہ وہ صنف سخن ہے جس میں اردو کی دیگر شعری اصناف کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ مرثیہ گوئی کے سلسلے میں ڈاکٹر مسیح الزماں لکھتے ہیں کہ:

''مرثیہ گوئی کے وسیع ذخیرے میں سے یہ چند مرثیے اوس سے پیاس بجھانے کی کوشش کے مصداق ہیں، لیکن اردو میں اس صنف کے آغاز کے چار سو سال بعد تک ایسی کوئی صورت نہ نکلی ہو تو اِن نگینوں کو ہی غنیمت سمجھا جانا چاہئے جن تک اردو مرثیہ کی ارتقائی شکل کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔''[1]

جہاں تک مرزا دبیر کے بیٹے مرزا محمد جعفر اوج کا تعلق ہے تو ان کے مرثیے غزل کے عنصر کو ملحوظ رکھنے کے ساتھ عمدہ اور سنجیدہ زبان میں نظر آتے ہیں۔

مرزا محمد جعفر نام اور تخلص اوج تھا یہ تخلص ان کے والد مرزا دبیر نے استخارہ کی بنا پر رکھا تھا اور یہ مرزا اوج کے لیے اتنا باعثِ شرف رہا کہ اوج نے مرزا دبیر و میر انیس کے کلام کو کمالِ عروج تک پہنچایا۔ مرزا اوج کی شاعری کا آغاز عنفوان شباب سے شروع ہو گیا تھا۔ انھوں نے پہلا مرثیہ محض سولہ یا سترہ سال کی عمر میں پڑھا تھا۔ یہ مرثیہ خاصہ طویل ہے۔ اس مرثیہ کا مطلع ملاحظہ کریں۔

اس مرثیہ میں عید و محرم کا حال ہے
امید و یاس، شادی و ماتم کا حال ہے

مرزا اوج کی طبیعت مال دنیا کی جانب سے اتنی غنی تھی کہ کبھی کسی چیز کی تمنا نہیں کی اور اپنی شاعری کو اس کا ذریعہ نہیں سمجھا اور نہ ہی اس کا کبھی حصہ بنے۔ ساری عمر نہایت سادگی سے بسر کی۔ مرثیہ گوئی کی راہ میں قدم رکھا تو عمر کے آخر تک اس کو برقرار رکھا۔ اس کے ساتھ انھوں نے توکل علی اللہ کا بھی عملی مظاہرہ کیا۔

تیرے کرم کا مجھ کو بھروسا ہے اے کریم
تیری عنایتوں کا سہارا ہے اے کریم

مرزا اوج کا یہ شعر ان کی سیرت کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر مسعود حسن ادیب لکھتے ہیں کہ:

''ہر شاعر کے ہر شعر سے اس کی سیرت کا استدلال کرنا صحیح نہیں ہو سکتا، لیکن جن مضامین کو کوئی شاعر بار بار نظم کرتا ہو اُن سے اُس کے خیالات کا کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ پھر جن شاعروں نے اپنے خیالات نظر خود رکھ لیے ممکن ہے کہ وہ ان کی طبیعت اور ان کے عمل کا صحیح عکس نہ ہوں لیکن انیس نے جو بات کہی ڈنکے کی چوٹ پر کہی۔''[2]

مرزا اوج کو فن عروض سے بہت دلچسپی تھی۔ انھوں نے عروض اپنے والد محترم مرزا دبیر سے سیکھا تھا اور کم و بیش تیئیس برس کی عمر میں اس فن پر عبور حاصل کر چکے تھے۔ جس کا اظہار انھوں نے ''میقاس الاشعار'' کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب کو ادب کی تاریخ میں ''ارمغان'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس میں فن عروض و قافیہ کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے جو مرزا اوج کا معیاری نثری کارنامہ ہے۔ اس سلسلے میں سید خیرات احمد محب نے اپنے ایک خط میں مرزا اوج کے فن عروض کے متعلق یوں لکھا ہے کہ:

''ہائے مرزا اوج مرحوم۔ اب لوگوں کو معلوم ہوگا کہ علم عروض کیا ہے اور اس میں اُس مرحوم کو کمال کیسا تھا۔''[3]

اس طرح نواب مرزا خاں داغ اور سید خیرات احمد محب جیسی شخصیتوں نے مرزا اوج کی عروض دانی اور اُن کی تصنیف ''میقاس الاشعار'' کو مستند طور پر تسلیم کیا ہے۔ اس کتاب کا اوّل حصہ علم عروض اور فنِ شعر سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا حصہ علم قافیہ سے متعلق ہے۔ پانچ ابواب پر مشتمل ہے اس کتاب کا خاتمہ فن تاریخ پر کیا گیا ہے۔

مرزا اوج بڑے انہماک سے مرثیے کہتے اور روایات کی بہتری کے لیے ہمیشہ اپنے کو مصروف رکھتے تھے۔ ان کو اپنے وقت اور اس کی قدر و منزلت کا اتنا خیال تھا کہ انھوں نے زندگی کے بیش قیمت لمحات کو کبھی ضائع نہیں کیا۔ ان کے ایک ہم عصر علی میاں کامل ملاقات کے لیے آتے اکثر و بیشتر گھنٹوں نشست ہوتی تھی جو نسبتاً ادبی ہوا کرتی تھی۔ کبھی کبھی مرثیے کے متعلق تو کبھی کسی مضمون کو نئے ڈھنگ سے ادا کرنے یا اس میں کوئی نیا پہلو یا گوشہ پیدا کرنے کے متعلق گفتگو ہوا کرتی تھی۔

مرزا اوج اپنی شاعری کو زمانہ سے ہم آہنگ کر کے آگے بڑھ رہے تھے تاہم ان کا عمومی نظریہ شاعری یہی تھا کہ مشاہدہ میں جو چیز جس طرح آئے بے کم و کاست اسی طرح سادگی سے بیان کر دی جائے۔ ان کا خیال تھا کہ رنگینیٔ الفاظ، مبالغہ آرائی، کلام میں حُسن تو پیدا کرتے ہیں مگر اس حُسن میں حسن حقیقی مفقود اور حسنِ ظاہری نمایاں طور پر نمودار ہوتا ہے اور وقتی طور پر ہماری آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے۔ تصنع و چپہ کاری کے یہ پردے جب ہٹ جاتے ہیں تو صرف حسن حقیقی کی تڑپ ہی باقی رہ جاتی ہے اور وہی متاثر کرتی ہے۔

مرزا اوج ابتدا سے آخر تک اپنے اصولوں پر قائم

رہے۔ ان کا یہ ماننا تھا کہ شاعری کی بنیاد ہمیشہ عمدہ ہونی چاہیے، کیونکہ اگر مضمون اچھا ہے تو سادگی سے ادا کرنے پر بھی ان خوبیوں کا حامل نظر آئے گا جو میزان شاعری پر معیاری تسلیم کی گئی ہیں۔ مرزا اوج کہتے ہیں کہ۔

مضمون سے ہیں تجل درمکتوں عدن عدن
پھیلی ہے بوئے مشک معانی ختن ختن
ان پھولوں کی ہے نکہت چمن چمن
ہر سو ہے بلبلوں کا اشارہ سمن سمن
صفحہ پہ یوں نشب نقوش مراد ہے
گویا سواد کشور مینو سواد ہے

مرزا اوج نے اپنی شاعری کی بنیاد میں فکری مضامین شامل کر کے کلام کو انفرادیت بخشی ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں فنّی لوازمات کا خاص خیال نہیں رکھا بلکہ وہ اس بات کے لیے ہمیشہ چاق و چوبند رہتے کہ شاعری میں ان کے جذبات واحساسات کی سچی ترجمانی الفاظ کے ذریعے ادا ہو جائے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ۔

کوئی سنے گل وبلبل کی داستاں کب تک
محاوروں کی خوش آمد چنیں چناں کب تک
یہ سردمہریوں کے ساتھ گرمیاں کب تک
غلط نمائی تخیل کا سما کب تک
ردیف وقافیہ کیا شے ہے جانتے ہی نہیں
فن ان کی طرح سے لاشے ہے ملتے ہی نہیں

جہاں ایک طرف مرزا اوج نے خالص فکری مضامین نظم کیے ہیں وہیں انھوں نے اپنی فلسفہ طرازی کو ایک معقول اسلوب دیا تھا لیکن مقبولیت نہ تو اتنے بنیادی ہیں کہ خود حسن بن جائے اور نہ ان میں لوازم کی ایسی آمیزش ہے کہ جو دل نشینی کی راہ پیدا کر دے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مرزا اوج نے اپنا آہنگ دراصل جذبات عالیہ کی ترجمانی کے وقت پایا تھا۔ انھوں نے زمانہ کے ساتھ عام نظریہ شاعری کو صرف اُس حد تک اپنایا جہاں تک وہ یہ سمجھتے تھے کہ مرثیہ خیال آرائی کا شکار نہ ہو جائے۔ اس کے لیے مرزا اوج نے اپنی آواز بھی بلند کی اور عملی طور پر اپنے بیان رزم میں بلند آہنگی اور جوش بھی پیدا کیا اور جو راستہ چُنا اس پر ثابت قدمی سے گامزن رہے۔

وہ چاہتے تھے کہ مرثیہ اپنے ادبی وقار کو برقرار رکھتے ہوئے صرف مرثیہ ہی رہے اس پر صنفِ غزل کا اثر نہ دکھائی دے۔ اس سلسلے میں مرزا اوج اپنی کتاب ''معراج الکلام'' میں لکھتے ہیں کہ:

''مرثیہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ مرثیہ رہے واسوخت نہ ہو جائے۔ غزل کے اصول اور ہیں مرثیے کے قواعد اور۔''4

مرزا اوج کی یہ کوشش ہمیشہ رہی تھی کہ ان کے ہم عصر مرثیہ گو بھی ان کی راہ پر چلیں لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اوج نے اس بات پر بھی زور دیا کہ مرثیہ میں صرف صحیح روایات کو ہی نظم کیا جائے گا۔ وہ اس بات کے حامی نہ تھے کہ قدیم شعرا جن روایت سے وابستہ رہے انھیں مکمل طور پر تسلیم کیا جائے، بلکہ ان کا ماننا یہ تھا کہ جو کچھ

مرزا اوج نے اپنی شاعری کی بنیاد میں فکری مضامین شامل کر کے کلام کو انفرادیت بخشی ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں فنّی لوازمات کا خاص خیال نہیں رکھا بلکہ وہ اس بات کے لیے ہمیشہ چاق و چوبند رہتے کہ شاعری میں ان کے جذبات و احساسات کی سچی ترجمانی الفاظ کے ذریعے ادا ہو جائے۔

نظم کیا جائے اس کی بنیاد تخیل پر نہ ہو کر نصوص پر مبنی ہو اور یہی وہ خصوصی نظریہ مرثیہ گوئی ہے جس میں وہ انفرادی حیثیت کے مالک نظر آتے ہیں۔ اس حوالے سے مرزا اوج نے اپنے ہم عصروں پر کوئی تنقید نہیں کی بلکہ آزادانہ طور پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

مرزا اوج کی مرثیہ نگاری ایسے دور میں پروان چڑھ رہی تھی جب انیس ودبیر کا زور عروج پر تھا۔ ایسے میں اوج کے لیے یہ مسئلہ بڑا نازک تھا کہ وہ کس رنگ کو اپنائیں۔ دراصل مرزا اوج کی جس ماحول میں پرورش ہوئی تھی وہ ان کے والد مرزا دبیر کے اثر سے معمور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ابتدائی مراثی میں رنگ دبیر کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے لیکن دھیرے دھیرے وقت کے عام تقاضوں سے مجبور ہو کر وہ رنگ انیس پر مائل ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ ذہن میں پیوست وہ فضائیں آسانی سے نہ نکل سکیں اور مرزا اوج کے لیے ایک کشمکش پیدا ہو گئی اسی سلسلہ روز وشب نے انھیں ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا جہاں میر انیس کی نازک خیالی، حسن لطافت اور حُسن ادا نظر آتی ہے تو وہیں دوسری جانب تشبیہ و استعارات، تراکیب وبندش مرزا دبیر کی دکھائی دیتی ہیں۔

اس طرح مرزا اوج کے کلام میں میر انیس و مرزا دبیر کا رنگ سمویا ہوا ہے۔ غرض ان باتوں کے پیش نظر مرزا اوج کے ابتدائی کلام کے چند نمونے ملاحظہ کریں۔

سرگرم نالہ طبع نزار ہے
گل چین بوستاں سخن بے قرار ہے
گلزار نظم رشک دہ شعلہ زار ہے
صفحہ پہ خامۂ دوزبان اشک بار ہے
خط کے سواد پر ہے گماں درد وآہ کا
مسطر میں سوزغم ہے کسی بے گناہ کا

اس کے بعد مرزا اوج نے ایسا بھی کیا کہ رنگِ انیس و دبیر یکجا کر کے ایک مرقع پیش کیا یعنی میدانِ کربلا میں گرمی کی شدّت ہے اور ہر نفس اس کا شکار ہے۔ اس منظر کی مرزا اوج نے جو تصویر پیش کی ہے اس کے چند اشعار دیکھیں۔

مشعل وصفت ہر ایک رگ گل ہے مشتعل
گرمی سے کھولتا ہے عنادل کا خونِ دل
ہر نخل تازہ بید کی صورت ہے جاں گسل
مثل چراغ کشتہ ہیں اشجار مضمحل
برداشت ہے محال جو گرمی سخت کی
سایہ پناہ ڈھونڈھ رہا ہے درخت کی

اس بند کا پہلا مصرعہ جو ہمہمہ یعنی شور پیدا کر رہا ہے وہ انداز دبیر ہے جب کہ باقی مصرعے رنگِ انیس میں کہے گئے ہیں۔

غرض ان مثالوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا اوج نے انیس و دبیر کے رنگ کو بھی ملحوظ رکھا اور دونوں کی جامعیت سے اپنی انفرادیت بھی قائم کرنے کی کوشش کی۔

حواشی

1- اردو مرثیہ کی روایت، ڈاکٹر مسیح الزماں، دیباچہ۔ گردین دیال روڈ لکھنؤ۔1969، صفحہ نمبر 8
2- انیسیات ۔سید مسعود حسن رضوی ادیب، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، 1981، صفحہ نمبر 37
3- یادگار حامد، سید خیرات احمد محب خط بنام حامد علی خاں بیرسٹر، 15 مئی 1917، مرتبہ مولانا صفی لکھنؤ، نظامی پریس لکھنؤ، صفحہ نمبر 242-241
4- معراج الکلام ۔جلد اول۔ مرزا محمد اوج، نظامی پریس لکھنؤ، 1924، صفحہ نمبر 4

Dr. MOHD TARIQ
F2, Naz Residency, New S.S. Nagar
Aligarh-200201
Email: roomisir786@gmail.com

قیام نیر

بانو سرتاج

قومی یکجہتی کی علمبردار

بانو سرتاج کا اصل نام بانو سرتاج قاضی تھا۔ ابتدا میں انھوں نے اس نام سے لکھنا شروع کیا تھا لیکن بعد میں قاضی ہٹا کر صرف بانو سرتاج کے نام سے لکھنے لگیں۔ وہ 17 جولائی 1945 کو پاندھر کوڑ میں پیدا ہوئیں جو ضلع ایوت محل، مہاراشٹر میں ہے۔ بعد میں چندر پور مہاراشٹر میں رہنے لگیں۔ چھ دہائیوں تک وہ اردو اور ہندی زبان وادب کی خدمت کرتی رہیں۔ 13 اگست 2026 کو اپنے مالک حقیقی سے جاملیں۔

بانو سرتاج کا تعلیمی ریکارڈ بڑا شاندار تھا۔ انھوں نے اردو، ہندی اور تاریخ میں ایم۔اے کیا تھا۔ ایجوکیشن میں پی ایچ۔ ڈی، گاندھیائی افکار میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما، بی ایڈ اور ڈپلوما ان رورل سرویسز بھی کر چکی تھیں۔ درس وتدریس سے جڑی تھیں۔ ایک طرف وہ تعلیمی نظام سے وابستہ تھیں تو دوسری طرف ان کی گہری وابستگی ادب سے بھی تھی۔ وہ اردو اور ہندی کے علاوہ مراٹھی اور انگریزی زبان میں بھی لکھتی تھیں۔ ان کی ایک کہانی پر ویڈیو فلم ''گڑیا'' اور ایک کہانی ''تیسرے راستے کے مسافر'' پر ایک ٹی وی سیریل ''کشمکش'' کے نام سے ٹیلی کاسٹ ہوا۔ انھوں نے دوسری زبانوں ہندی، مراٹھی اور انگریزی سے اردو میں ترجمے بھی کیے۔

بانو سرتاج نے مختلف اصناف ادب پر طبع آزمائی کی ہے۔ یوں تو اردو ادب کی تاریخ میں بہت سی خواتین قلمکاروں کے نام ملتے ہیں۔ شعروادب کے ہر اصناف پر خواتین قلمکاروں کی خدمات ناقابل فراموش رہی ہیں۔ قدرت نے انھیں افسانہ طرازی کا ملکہ عطا کیا ہے۔ گھریلو الفاظ، گھریلو محاورے اور گھریلو ضرب الامثال پر عورتوں کی گرفت زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ انھوں نے بہت سے گھریلو الفاظ کو وقار عطا کیا ہے۔ رسم و روایات، رہن سہن کے طور طریقے اور بچوں کی پرورش پرداخت سے بھی خواتین اچھی طرح واقف ہوتی ہیں۔ خود بھی کہانی سننا اور بچوں کو سنانا ان کی فطرت میں شامل ہے۔ خواتین نسوانی کردار اور بچوں کے جوش وخروش اور ان کی نفسیات سے اچھی طرح واقف ہوتی ہیں اس لیے ان کی تحریروں میں فطری رنگ ہوتا ہے۔ بانو سرتاج بھی ایسی ہی قلمکاروں میں سے ایک ہیں۔ انھوں نے بچے اور بڑے دونوں کے لیے لکھا اور خوب لکھا۔ وہ ایک کثیر الجہات مصنفہ تھیں۔ انھوں نے بچوں کے ادب پر بہت زیادہ کام کیا ہے۔ اپنی تعلیمی اور تدریسی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے انھوں نے بچوں کے لیے مختلف موضوعات پر ان کی نفسیات، ان کے ذہنی ارتقا اور ان کی زبان کا خیال رکھتے ہوئے کہانیاں، ڈرامے، مضامین اور ناول لکھے۔ بچوں کے ادب سے ان کی گہری وابستگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ادب اطفال کے لیے انھیں صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے 2015 میں ایوارڈ دیا جاچکا ہے۔

بانو سرتاج نے بچوں کے لیے پچاس سے زیادہ کہانیوں کے مجموعے شائع کروائے۔ ان میں جب جاگو تبھی سویرا، آئی برسات آئی، چناؤ کا چکر، گھمنڈ کا سر نیچا، وطن کے لیے، بارہ کہانیاں دو کی وغیرہ اہم ہیں۔ ان مجموعوں کی کہانیوں کے ذریعے انھوں نے بتانے کی کوشش کی ہے کہ ایک اچھا ادیب بچوں کو کہانی، ڈرامے، ناول اور مضامین کے ذریعے زندگی کی بنیادی قدروں سے روشناس کراتے ہوئے انھیں محبت، اخوت، ہمدردی، رواداری، انصاف اور وطن سے محبت کرنے کا جذبہ پیدا کراتا ہے۔ بانو سرتاج نے بچوں کے لیے تخلیقی ادب پیش کرتے ہوئے قومی اور سماجی مسائل کو مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے ادب اطفال میں قومی یکجہتی کا تصور خاص اہمیت رکھتا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں بچوں کو ذات، مذہب، زبان اور علاقائی اختلاف سے بالاتر ہو کر انسانیت اور وطن کی مشترکہ قدروں سے وابستہ ہونے کا پیغام دیتی ہیں:

''ایک گاؤں میں ایک بڑھیا رہتی تھی۔ ایک رات اس کے گھر مہمان آیا۔ بولا ''میں ایک سوداگر ہوں میں تھک گیا ہوں'' مجھے اپنے گھر میں ایک رات کے لیے ٹھہرنے اور آرام کرنے کی اجازت دیں۔ صبح میں چلا جاؤں گا۔ جو کچھ آپ معاوضہ مانگیں گی، دے دوں گا۔

بڑھیا نے بخوشی اجازت دے دی۔ اس کے لیے آرام دہ بستر لاکر دیا۔ سوداگر نے بڑھیا سے پوچھا ''مجھے کھانے کے لیے کچھ مل سکے گا؟ سخت بھوک لگ رہی ہے۔''[1]

بانو سرتاج کی کہانیوں میں مختلف طبقوں، مختلف علاقوں اور مختلف پس منظر رکھنے والے کردار ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے نظر آتے ہیں۔ اس سے بچوں کے ذہن میں اور دل و دماغ میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مذہب، ذات، زبان اور علاقائی اختلاف کے باوجود انسانیت اور وطن سے محبت سب کو ایک دوسرے سے جوڑتی ہے۔ چکی کے دو پاٹ، امیر غریب دو ہاتھ، دو پرندے دو بھائی، اچھی سوچ کا پھل، دو باپ دو بیٹے، لوٹ کے بدھو گھر کو آئے، بن کانٹوں کا گلاب اور بڑا کون وغیرہ میں قومی یکجہتی کا جذبہ پیدا کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔

بانو سرتاج نے بچوں کے لیے کئی ڈرامے بھی

لکھے ہیں۔ انوکھی بی کی سرائے (2011)، ایک بابی ڈرامے (2012)، مجھے شکایت ہے (1996)، گھر واپسی کا طویل سفر (2014، ترجمہ شدہ) اور ایک انار سو بیمار (1992) جیسے ڈراموں کے مجموعے لکھ کر مصنفہ نے بچوں کے ادب میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ ان مجموعوں میں بچوں کی جمہوریت، بہادر رانی درگا، دھرم راج کی عدالت، ایک بیمار سو انار، دلوں کے فاصلے، دکھوا میں کاسے کاٹوں، عدل اکبر، شیواجی کا انعام، انصاف کی ڈگر پر، وطن کے لیے، ہم ایک ہیں وغیرہ کے ذریعے مصنفہ نے انسانی اقدار، محبت، اخوت، تعاون، قربانی اور اچھے کردار کو اہمیت دی ہے جو قومی یکجہتی کے بنیادی ستون ہیں۔ مذہبی رواداری، بچوں کے ادب میں بہت ضروری ہے کیونکہ کم عمری ہی میں بچے اگر دوسروں کے مذاہب کا احترام کرنا سیکھ جاتے ہیں تو یہ جذبہ ان کے اندر ساری زندگی قائم رہتا ہے۔ ساتھ ہی بچوں کے اندر بھائی چارگی اور انسان دوستی پروان چڑھ جائے تو آگے چل کر وہ ایک اچھا شہری بن جاتا ہے۔

بانو سرتاج نے اپنے ڈراموں کے ذریعے بچوں کے اندر شعور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ مذہب، ذات پات، زبان، علاقہ اور ثقافت کے اختلاف کے باوجود سب ایک قوم کا حصہ ہیں۔ اس سے معاشرے میں آپسی اتحاد، میل جول اور بھائی چارے کی بنیاد مضبوط ہوتی ہے۔

مختصر یہ کہ مصنفہ نے بچوں کے ڈراموں کے ذریعے قومی یکجہتی کے فروغ کا پورا خیال رکھا ہے۔

''گھر واپسی'' بانو سرتاج کے ڈراموں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں مختلف زبانوں کے ڈراموں کا ترجمہ اردو میں کیا گیا ہے۔ ہندی، انگریزی، مراٹھی، بنگالی اور گجراتی کے ڈراموں کو اردو میں ترجمہ کر کے انھوں نے قومی یکجہتی کا بڑا ثبوت دیا ہے۔ ان ہی کے الفاظ میں:

''گھر واپسی کا طویل سفر'' ڈرامہ ہائے رنگا رنگ کا مجموعہ ہے۔ اس میں کل 21 ڈرامے ہیں۔ جن میں اردو (1)، ہندی (12)، مراٹھی (3)، انگریزی (2) گجراتی (1) اور بنگالی (1) ڈرامے ہیں۔ یہ وہ ڈرامے ہیں جنھیں 1992 سے آج تک میں نے مختلف اوقات میں اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ ان میں ہندی، انگریزی اور مراٹھی کے ڈرامے راست ان ہی زبانوں سے پیش کیے گئے ہیں۔ گجراتی اور بنگالی کے ڈرامے ہندی سے اردو میں ترجمہ کیے گئے ہیں۔ بیگم حضرت محل، بہادر رانی درگاوتی، اور پان دے جیسی ہندوستانی تاریخ کی بے مثال خواتین کی عظمت، ہمت اور بہادری کے مظہر ڈرامے ہیں۔ ''کون ہارا کون جیتا'' ڈراما ہندوستان کی سنہری تاریخ میں ہندو مسلم اتحاد کا مظہر ایک زریں باب ہے۔ بھارتندو ہریش چندر، رویندر ناتھ ٹیگور، اچاریہ چتر سین شاستری، مدھوکر آشتی کر، جیونت دیوی، اوجن اور نیل کرشنی ہندی، بنگالی، مراٹھی، انگریزی ادب کے سنگ میل قرار دیے جاتے ہیں۔''[2]

بانو سرتاج نے بچوں کے لیے کئی ناول بھی لکھے ہیں۔ ''جنگل میں منگل'' (1998)، اور ''پکیا اور پرچھم'' (2012) بہت اہم سمجھے جاتے ہیں۔ ''جنگل میں منگل'' ناول میں چھوٹے چھوٹے کئی ناول شامل ہیں۔ ''چار دوست''، ''بچھڑے مل گئے'' اور ''بھیڑیے کا حملہ'' وغیرہ ''پکیا اور پرچھم'' میں بھی چھوٹے چھوٹے ناول شامل کیے گئے ہیں ان میں ''بھج من پیارے کرشن کریم''، ''دوست وہی جو مصیبت میں کام آئے'' اور ''ٹوٹی گڑیاں جڑ گئیں'' وغیرہ اہم ہیں۔ اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

''چندر بھاگا نے اسے میٹھی ڈانٹ لگائی، اپنی صحت کا خیال رکھ۔ تو بیمار پڑ گئی تو ہم کہاں جائیں گے؟ کیسے جئیں گے؟ کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا۔ دوا دارو کا روپیہ میں دوں گی۔ ابھی سے کمر میں اکڑن اچھی نہیں۔ آ جا بائی۔ جلدی سے کام پر آ جا..... رام رام..... کرشن کرشن وہ لوٹنے لگی تھیں کہ کریم پر ان کی نظر اٹک گئی۔ وہ اشتیاق بھرے نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ چندر بھاگا کے دماغ میں اتھل پتھل مچ گئی۔ وہ پتھر کی طرح کھڑی رہ گئیں۔ آخر انھوں نے کریم کو نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔ کریم دوڑ کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ مسکرا کر اس نے پوچھا'' آپ چندرا، دادی ہیں نا؟ سفید مکان والی؟''[3]

بانو سرتاج نے بچوں کے لیے لکھے گئے ناولوں میں اپنے اس تصور کو کرداروں، واقعات اور اخلاقی رویوں کے ذریعے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ بچوں کو مختلف مذاہب، ذات اور فرقے کے اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کی عزت اور احترام کرنا سکھاتی ہیں۔ ان کے ناولوں میں مذہبی رواداری، مذہبی دوستی، باہمی تعاون اور انسان دوستی وغیرہ کا پورا خیال رکھا گیا ہے تاکہ ان کے اندر قوم اور وطن کے تئیں ایک مثبت سوچ پیدا ہو جو قومی شعور بیدار کرنے کا ذریعہ بنے۔ دیکھیے اقتباس:

''بچو! ادیب احساس جگانے کا چھوٹا سا، بہت چھوٹا سا کام کرتا ہے۔ دیئے اور جگنو کی طرح! روشنی اور دیئے کو پھیلنے کے لیے جگہ کی کمی نہیں.... بس پھیلانے والا چاہیے۔

تم پکیا اور پرچھم کی کہانی پڑھو اور بس اتنا کرو کہ کسی کے گھر برتن مانجھتی، آنگن جھاڑتی، بچوں کو پارک میں ٹہلاتی ہوئی لڑکی یا ہوٹل کی بھٹی دہکاتے، اخبار فروخت کرنے، اسکول کے باہر میٹھی گولیاں فروخت کر کے یا کچرا بنتے دس سے بارہ سال کے لڑکوں سے کہو۔

''دیکھو! یہ ایک کتاب ہے۔ اس میں تم جیسے بچوں کی کہانی ہے۔ بہت طویل نہیں ہے مگر دلچسپ ہے۔ تمھیں پسند آئے گی۔''[4]

بانو سرتاج افسانہ لکھنے میں بھی مہارت حاصل کر چکی ہیں۔ ان کے پانچ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانوں میں انسانی رشتوں اور سماجی زندگی کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے بیشتر افسانے قومی یکجہتی کی مثال پیش کرتے ہیں۔ آج کا انسان مختلف دائروں کے حصار میں قید ہے۔ مذہب، ذات، طبقے، زبان، علاقائیت اور تعصب جیسے دائرے میں گھرے ہوئے ہیں۔ قومی یکجہتی کی تشکیل اس وقت ہو سکتی ہے جب انسان ان محدود دائروں سے نکل کر وسیع انسانی اور قومی شعور تک پہنچے۔ بانو سرتاج نے اپنے افسانوں کے ذریعے انسان کو ان دائروں اور حصاروں سے نکلنے کا مشورہ اپنے افسانوں کے ذریعے دیا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے سماجی زندگی کے مثبت اور منفی دونوں رویوں کو پیش کیا ہے۔

بانو سرتاج کے افسانوی مجموعے ''دائروں کے قیدی'' (1992)، اس کے لیے (1994)، ذرا سی کمی (2001)، اپنے ہاتھوں میں تھاما ہوا میزان (2009) اور دھندلی پرچھائیاں (2014) بے حد اہم ہیں۔ ان مجموعوں کے کچھ افسانوں میں انھوں نے قومی یکجہتی کی مثال پیش کی ہے۔ قومی یکجہتی صرف سیاسی یا جغرافیائی اتحاد نہیں ہے بلکہ مختلف مذاہب اور طبقات کے افراد ایک دوسرے کے درد کو سمجھیں اور ایک دوسرے کی مدد کے لیے کھڑے ہوں۔ بانو سرتاج کے افسانوی ادب میں انسانی جذبات اور معاشرتی تعلقات کا مطالعہ قومی یکجہتی کے موضوع کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ قومی یکجہتی

کے موضوع پر ان کے افسانے ''تحفہ، گھر کا چراغ، دھندلی پرچھائیاں، اس کے لیے، اجڑی کوکھ کا بوجھ، نہ غم تیرا نہ غم میرا، اماں'' اور ''عورت'' وغیرہ اہم ہیں۔ اس بات کو اس اقتباس سے سمجھا جاسکتا ہے:

''سوال ہار کا نہیں ہے۔ میں نے زندگی کی حقیقتوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ آپ کی دنیا لائبریری اور آپ کے خزانے تک محدود ہے۔ میں نے رشتوں کی وسیع دنیا میں آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی ہے۔ بزرگوں سے، ہم عمروں سے، بچوں سے کیسے تعلقات رکھے جاتے ہیں یہ میں خوب اچھی طرح جانتی ہوں۔ جنھیں ہم پسند کرتے ہیں ان کے لیے کیا کچھ کیا جاسکتا ہے اور جنھیں ہم پسند نہیں کرتے ان سے کیسے نبھایا جاتا ہے اور یہ آرٹ بھی مجھے آتا ہے۔ دراصل یہ سب جاننا ہی زندگی کو صحیح طریقے سے جینا ہے۔''[5]

بانو سرتاج کے افسانوی ادب کا قومی یکجہتی کے حوالے سے مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ مصنفہ نے اتحاد کا تصور، انسانی رشتوں، رواداری، ہمدردی، اخلاقی اقدار اور مشترکہ تہذیبی زندگی کے ذریعے قومی یکجہتی کی بنیاد تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

بانو سرتاج کے افسانوں کا بنیادی مقصد انسان دوستی، مذہبی رواداری، باہمی احترام، ہمدردی، مشترکہ تہذیب اور بھائی چارہ ہے۔ ان کے افسانوں میں زندگی میں پیش آنے والے مسائل کے ساتھ ساتھ انسانی ہمدردی، باہمی تعاون اور سماجی ہم آہنگی کے عناصر نمایاں ہیں۔

بانو سرتاج بچوں کے لیے بہت سے مضامین بھی لکھ چکی ہیں۔ ان مضامین کے ذریعے انھوں نے بچوں کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین میں بچوں کی تعلیم و تربیت، رہن سہن، صحت کی دیکھ بھال اور اچھے شہری بننے کے ساتھ ساتھ ان کے اندر قومی یکجہتی کا جذبہ پیدا کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

بانو سرتاج کے مضامین کے دو مجموعے ''تال'' (2007) اور ماحصل (2005) شائع ہو چکے ہیں۔ ''تال'' میں ڈاکٹر شباب للت کی شاعری میں ہندی دیومالائی علائم، سلیمان خطیب کا مشن اور ان کی زبان، ہندی کے مسلمان شعرا، اہل بہار کی شاعری میں قومیت، قومی یکجہتی میں خواتین قلم کاروں کا حصہ وغیرہ شامل ہیں۔ عنوانات ہی سے ظاہر ہے کہ بانو سرتاج نے اس کتاب میں قومی یکجہتی پر کتنا زور دیا ہے، ان کی ایک اور کتاب (مضامین کا مجموعہ) ''ماحصل'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں قومی یکجہتی کے متعلق جو مضامین شامل ہیں وہ اس طرح ہیں۔ ''بھرتری ہری اردو میں، حملۂ چین اور اردو شاعری، اردو شاعری میں ہندو تہوار، جنگ آزادی میں اردو شاعری کا حصہ اور اردو شاعری میں ہندوستانیت''۔

بانو سرتاج نے کم و بیش ہر کتاب میں قومی یکجہتی کو مضبوط کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کی فہرست پر نظر ڈالتے ہی سے معلوم ہوجاتا ہے کہ ان کے موضوعات بے حد متنوع اور منفرد ہیں۔

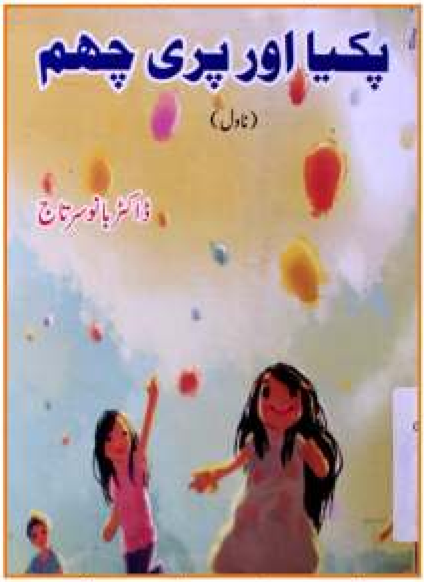

بانو سرتاج نے بہت سے طنز و مزاح پر مبنی مضامین بھی لکھے ہیں۔ تیرا ممنون ہوں (2004)، اور خطرے کا الارم (2010)۔ دونوں مجموعوں میں شامل مضامین میں قومی یکجہتی کی جھلک نمایاں ہے۔ پہلے مجموعے میں علمی اور ادبی حلقوں میں پائی جانے والی کمزوریوں اور خامیوں، رسم و رواج میں پائی جانے والی اندھی عقیدت اور طرح طرح کی پابندیوں اور خود پسندی جیسے موضوعات کو مزاح کے پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ خطرے کا الارم میں بھی بانو سرتاج نے زندگی میں رونما ہونے والے مختلف واقعات اور سماج کی جڑوں میں پوشیدہ بدعنوانیوں کے خلاف طنز و مزاح کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔

بانو سرتاج کی ایک کتاب ''اردو شاعری اور قومی یکجہتی'' ہے۔ اس کتاب میں مصنفہ نے براہ راست قومی یکجہتی جیسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ اس موضوع پر یہ ایک بہت ہی اہم کتاب ہے۔ ہر دور میں مختلف مذہبوں، تہذیبوں، علاقوں اور زبانوں میں اتحاد و اتفاق اردو شاعری کے اہم موضوعات رہے ہیں۔ بانو سرتاج کی اس کتاب میں جتنے بھی شاعروں کو شامل کیا گیا ہے سب کی شاعری میں قومی یکجہتی اور گنگا جمنی تہذیب کی عکاسی ملتی ہے۔ عنوانات ہی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے جیسے اردو شاعری میں گرونانک، اردو شاعری میں شری کرشن، اردو شاعری میں ہولی، اردو شاعری میں شری رام، اردو شاعری میں دیوالی کی جگمگاہٹ، اردو شاعری میں عید کی مٹھاس، اردو شاعری اور شریمد بھگوت گیتا، اردو شاعری کے عیسائی شاعر، قومی یکجہتی اور اردو شاعری اور غیر مسلم شعرا کا نعتیہ کلام وغیرہ۔ ان عنوانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بانو سرتاج نے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی تہذیبی حوالوں کو اردو شاعری میں تلاش کرکے اردو کے سیکولر اور مشترکہ تہذیبی مزاج کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

بانو سرتاج کا اسلوب بیان، سادہ، رواں اور شگفتہ ہے۔ کہیں کہیں تو ان کے کردار کی زبان، مکالمے اور موقع محل کی مناسبت سے تشبیہ و استعارے کا استعمال اتنا دلنشیں اور دلکش ہوتا ہے کہ قارئین کچھ دیر کے لیے سوچنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔

بانو سرتاج اردو کی ایک اہم قلمکار تھیں۔ انھوں نے مختلف اصناف ادب پر بہت ساری کتابیں لکھیں ہیں۔ ان کے ادبی اور عملی کارناموں کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ قومی یکجہتی پر انھوں نے جتنا لکھا ہے اور اپنے قلم کے ذریعے اسے قائم رکھنے کی جتنی کوششیں کی ہیں یہ ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔

حواشی:

1. دو تھیلی گیہوں، مشمولہ ''بارہ کہانیوں دو کی'' بانو سرتاج، قسیم گرافکس، مالی گاؤں، 2018، ص:16
2. گھر واپسی کا طویل سفر، بانو سرتاج، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2014، میری بات، ص:8
3. پکیا اور پری چھم۔ بانو سرتاج نرالی دنیا پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2012، ص: 9
4. ایضاً، ص:22
5. افسانہ ''کیل برہنگا بچپن'' مشمولہ، اپنے ہاتھوں میں تھا ما ہوا میزان۔ بانو سرتاج۔ نرالی دنیا پبلی کیشنز۔ 2009 ص:18

■

Dr. Qayam Naiyar
Ex-HoD of Urdu
At+P.O. Bardaha, Via: Kamtaul, Dist: Madhubani
Bihar, Pin-847304
Mob: 9973743606
Email: drqayamnaiyar@gmail.com

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے اور کتاب کے مشمولات کے تعلق سے قارئین کو اہم معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت پائی جاتی ہے۔ قدیم رسائل و مجلات نے نئی مطبوعات سے متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تبصرہ ایک ذمہ داری کا عمل بھی ہے۔ اس لیے مبصرین کو تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، طوالت، تحسین اور نکتہ چینی سے گریز کرتے ہوئے کتاب کے اہم نکات پر اظہار خیال کرنا چاہیے۔ رسالے میں اردو زبان و ادب سے متعلق انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں شائع ہونے والی کتابوں پر تبصرے بھی شامل کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا مبصرین اس جانب بھی توجہ فرمائیں۔ (ادارہ)

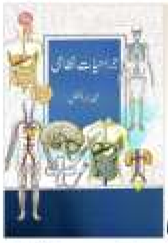

جراحیات نظامی

مصنف: محمد ذوالکفل

صفحات: 358، قیمت: 275 روپے، سنہ اشاعت: 2026

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: محمد قمر عالم، شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی، یوپی

علم طب انسانی صحت، بیماریوں کی تشخیص، علاج اور حفظان صحت سے متعلق ایک وسیع علمی شعبہ ہے۔ طب کی مختلف شاخوں میں جراحی کو اہم مقام حاصل ہے۔ طب کی تاریخ میں جراحی کا ارتقا طویل اور تدریجی عمل رہا ہے۔ قدیم یونانی حکما سے لے کر مسلم اطبا اور پھر جدید طبی سائنس تک جراحی مسلسل ترقی کرتی رہی ہے اور یہ سلسلہ آج بھی قائم ہے۔

قدیم یونانی طب میں بقراط نے زخموں، ہڈیوں اور بعض اعصاب کی جراحت کے مسائل سے متعلق اہم طبی اصول بیان کیے ہیں۔ یونانی طبی روایت میں جسمانی ساخت، زخموں کے مختلف طریقۂ علاج اور اس سے وابستہ علوم پر اظہار خیال کی مضبوط روش ملتی ہے۔ بعد میں جالینوس نے اس فن کو کافی ترقی عطا کی۔ اسلامی تہذیب کے علمی دور میں یونانی، سریانی، ایرانی اور دیگر طبی ذخائر سے استفادہ اور ان علوم پر مشتمل کتب کا ترجمہ بڑے پیمانے پر ہوا۔ مسلم اطبا نے ان علوم کو نہ صرف محفوظ کیا بلکہ اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر ان میں قابل قدر اضافے بھی کیے۔

علم جراحیات پر ایک نہایت اہم کتاب محمد ذوالکفل نے 'جراحیات نظامی' نام سے تحریر کی ہے جو حال ہی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں جراحی کے اصول وضوابط، اس کے متعلقات، اس کی ضرورت اور حفظان صحت کے باب میں اس کی اہمیت کو بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اردو میں ایسی کتابوں کا شائع ہونا اردو زبان نیز علم طب دونوں کے لیے سودمند ہے۔ گذشتہ برسوں سے اردو میں علمی کتابوں کی اشاعت میں بتدریج کمی آئی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت اردو زبان کے لیے تازہ ہوا کا جھونکا ہے جو صحت و تندرستی کے لیے ازحد ضروری ہے۔

محمد ذوالکفل کی کتاب 'جراحیات نظامی' گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ کتاب میں کوئی ایسی تحریر شامل نہیں ہے جسے مصنف کا مقدمہ یا دیباچہ کہا جاسکے۔ کتاب براہ راست پہلے باب یعنی 'نظام دماغ و اعصاب' سے شروع ہوتی ہے۔ اس باب میں 'امراض رأس و دماغ و دیگر امراض عصبی جراحی' کے تحت امراض موروثی، ضرباتی، سلعات، عروقی، متعدی، طفلی، ماء دماغی اور وجعی کیفیتوں کا مفصل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ معالجاتی تجربہ، امتحان جسمانی، ضرب رأس، ماہیت المرض، علاج و تدابیر، ماہرین کی خدمت حاصل کرنے کے لیے ضروری امور، نظام اعصاب سے متعلق جراحی تدبیر، اندرونی دماغ جریان الدم، سلعات دماغ اور کسر الاضلاع کے متعلق احتیاطی تدابیر کی توضیح و تشریح ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

باب دوم اور باب سوم 'نظام ہضم' پر مشتمل ہے۔ ان دونوں ابواب میں امراض ہاضمہ کی اقسام مثلاً: مری اور حجاب حاجز، مری کے سلعات، فتق، یرقان، یرقان دموی، یرقان سدی، حصاۃ مرارہ، سرطان مرارہ، سرطان بانقراس، ضغط الدم، بطلان کبد، التہاب معدہ، دق معوی، ورم قولون، سرطان مقعد، بواسیر، انشقاق مقعد، ورم زائدہ اعور حاد وغیرہ سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور ان کی علامات و نشانیاں، اسباب و علاج، تشخیص و تفتیش کے علاوہ احتیاطی تدابیر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

پیٹ کو ام الامراض بھی کہا جاتا ہے۔ انسانی جسم میں زیادہ تر بیماریاں اسی کے سبب لاحق ہوتی ہیں۔ اس کتاب کے تین ابواب یعنی 'باب چہارم: فتوق و دیوار بطن، باب پنجم: باریطون، خرب، ماساریقی و جوف باریطون' اور 'باب ششم: اضطراری بطن' امراض بطن سے متعلق ہیں۔ ان ابواب میں پیٹ کی ظاہری و باطنی بیماریوں کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔ جیسے فتق الامعا، فتق الفخذ، نادرالوقوع فتوق، ناف و دیوار بطن وغیرہ کا

تعارف اوراس کی تشخیص وعلاج کے طریقے بیان کیے گئے ہیں۔

کتاب کا 'باب ہفتم غدولاقناتیہ' پر مشتمل ہے۔ اس باب میں غدہ درقیہ، کیسہ عنقی لسانی، غوطر، منافع الاعضائی، سرطانی عظم درقی، اورام غدہ درقی وغیرہ کے اسباب وعوامل پر روشنی ڈالی گئی ہے اوران کی جراحت ومعالجے کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ آٹھواں باب 'ثدی (پستان)' کے امراض پر مشتمل ہے۔ اس میں رسولی، درد، خُراج پستان، ورم غدی لیفی، سرطان ثدی کے علاوہ مردوں میں پستان سے متعلق امراض پر روشنی ڈالی گئی ہے اوران کے علاج ومعالجہ نیز جراحت کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔

انسانی زندگی میں بول وتناسل کے امراض کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ مصنف نے باب نہم میں نظام بول کے تحت جن امراض کا تذکرہ کیا ہے ان میں سلسل البول، پیشاب میں خون آنا، درد، التہاب مثانہ، غدہ مذی، التہاب خصیتین و بربخ، حصاۃ کلیہ، سوزاک، آتشک، سرطان قناۃ بولی، امراض خصیہ وفوطہ اوران جیسی متعدد امراض کا تفصیل سے مطالعہ پیش کیا گیا ہے اوران کے علاج ومعالجے کے طریقے نیز جراحت کی ضرورت اوراس کے طریقے بیان کیے گئے ہیں۔

مصنف کی رو سے اس کتاب کا آخری باب آلات جراحی ومواد خیاطی' ہے۔ اس میں انھوں نے جراحت کے لیے ضروری ساز وسامان اور خیاطی کے طور طریقوں پر روشنی ڈالی ہے جب کہ کتاب کا آخری باب ان تصاویر پر مبنی ہے جنھیں' آلات جراحی ومواد خیاطی' کا نام دیا جاتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ محمد ذوالکفل کی کتاب 'جراحیات نظامی' میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کے ساتھ ساتھ ان اطبا کے لیے بھی مفید اور کارآمد ہے جو جراحت کا عمل انجام دیتے ہیں۔ اس کتاب کا وہ حصہ عام قارئین کے لیے بھی کارآمد ہے جہاں امراض کی نشانیوں اور علامتوں پر بحث ہوئی ہے اوران کے علاج ومعالجہ کے ساتھ حفظان صحت کے لیے بیداری کا فریضہ بھی یہ کتاب ادا کرسکتی ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں. کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

240 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر................ بتاریخ................ بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/240 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....
....

پتہ : ....
....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں: دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066
فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

تحقیق و تنقید

افکار انجم

مصنف: محمد خالد انجم عثمانی
قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2026
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
مبصر: محمد شاہنواز عالم
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، ملت کالج، دربھنگہ، بہار

زبان و ادب میں تنقید و تحقیق کا شعبہ ہمیشہ سے ایک دشوار اور ذمہ دارانہ شعبہ رہا ہے جو غور و فکر، عمیق مشاہدے اور غیر جانبدارانہ تجزیے کا تقاضہ کرتا ہے۔ اس لیے تنقید و تحقیق کی راہ آسان نہیں۔ اس دشوار گزار راستے پر محمد خالد انجم عثمانی کی پیش قدمی یقیناً قابل تحسین ہے۔

کتاب کا آغاز کالم نگار، نقاد، شاعر و ادیب اور 'جہان اردو' کے مدیر پروفیسر مشتاق احمد کے تاثرات بعنوان 'نقوشِ تاثر' سے ہوتا ہے، جو پوری کتاب کے فکری اور تنقیدی مزاج کا فکر انگیز تعارف پیش کرتا ہے۔ پروفیسر مشتاق احمد نے اپنے تاثرات میں مغرب و مشرق میں تنقید و تحقیق کی روایت نیز اس کی افادیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے موجودہ دور میں درپیش مسائل اور اس کی وجوہات کی نشاندہی کی ہے، اور ایک نہایت متوازن اور بامعنی مشورہ بھی دیا ہے۔ اس بابت وہ لکھتے ہیں ''مشرق میں خاص طور پر اردو ادب کو اس وقت ایسی تنقید کی ضرورت ہے جو روایت اور جدیدیت کے درمیان توازن قائم کر سکے، اور ادب کو عالمی تناظر میں دیکھنے کی صلاحیت پیدا کر سکے۔ اسی فکری کسوٹی پر انھوں نے 'افکار انجم' کے حوالے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ڈاکٹر محمد خالد انجم عثمانی نے تحقیق و تنقید کو نئے افق نقد سے آشنا کیا ہے۔''

'افکار انجم' کا مقدمہ بھی تنقیدی نوعیت کا ہے جسے ڈاکٹر عثمانی نے مختصر مگر جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے کتاب کی مناسبت سے مضمون کی افادیت سے بحث کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ مضمون محض اظہار خیال نہیں ہوتا ہے بلکہ حقیقت کی دریافت کا موثر وسیلہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کا مقدمہ نہ صرف کتاب میں شامل مضامین کی افادیت کو واضح کرتا ہے بلکہ مضمون نگاری کے فکری پہلوؤں کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔

کتاب میں جن موضوعات کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے اس کی فہرست سازی یوں کی گئی ہے۔ پریم چند کے مضامین کا تنقیدی جائزہ، انیسویں صدی کے نثری اسالیب، بے خبری رہی کا شاعر: سراج اورنگ آبادی، میر و سودا کی شاعری کا تقابلی مطالعہ، مومن کی رباعی گوئی، غالب کی شاعری میں تکثیری پہلو، آزاد: ہندوستانی تکثیریت کے امین، علامہ اقبال کا تصور وطنیت، سید احتشام کے شعری محاسن، اردو: تاریخ آزادی ہند کی امین، ترقی پسند تحریک کی فکری بنیادیں اور دبستان عظیم آباد: ایک فکری مطالعہ۔

ہر چند کہ ان موضوعات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ تاہم خالد انجم عثمانی نے اپنی تحقیقی و تنقیدی بصیرت سے کچھ نئے پہلوؤں کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر پریم چند پر اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں بے شمار تحقیقی و تنقیدی مضامین اور کتابیں لکھی گئی ہیں۔ عام طور پر پریم چند کے افکار و نظریات کو سمجھنے کے لیے ان کے افسانوں اور ناولوں کو بنیادی وسیلہ بنایا جاتا ہے۔ لیکن صاحب کتاب نے اس ڈگر سے ہٹ کر پریم چند کے نظریات کو سمجھنے کے لیے ان کے مضامین کا انتخاب کیا ہے اور اسے اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔

اسی طرح 'انیسویں صدی کے نثری اسالیب' کا مطالعہ اردو نثر کی تشکیل و ارتقا کے اس دور کی طرف توجہ دلاتا ہے جس نے بعد کی اردو نثر کے لیے بنیادی راستہ ہموار کیا۔ 'میر اور سودا کا تقابلی مطالعہ' بھی ایک دلچسپ اور قابل توجہ مضمون ہے۔ مصنف نے میر اور سودا کے شعری مزاج، موضوعات، اسلوب، زبان اور اس عہد کے فکری رویوں کو تقابل کے ذریعے دونوں کی انفرادیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

'مومن کی رباعی گوئی' کے تعلق سے مصنف نے مومن کے یہاں موضوعات کے تنوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے نتیجے کے طور پر دو باتوں کا ذکر بطور خاص کیا ہے۔ اول یہ کہ مومن کے یہاں موضوعات کے تنوع کے باوجود عشق و محبت ان کی رباعی کا غالب موضوع ہے، اور دوسرے یہ کہ زبان و بیان میں سادگی، سوز و گداز، داخلیت اور جذبات کی شدت جیسی خصوصیات کے باعث ان کی رباعیوں میں دبستان دہلی کی شعری روایت اور مزاج کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔

'دبستانِ عظیم آباد: ایک فکری مطالعہ' اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت موزوں، جامع اور معنی خیز مضمون ہے۔ مصنف نے عظیم آباد سے وابستہ شعرا کے کلام میں موجود جدتِ فکر، ندرتِ خیال اور تخلیقی انفرادیت کو اس دبستان کی بنیادی فکری شناخت قرار دے کر محض شعری خصوصیات کے بیان پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اس کے فکری مزاج اور ادبی تشخص کو بھی نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اعتبار سے عنوان اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ دبستانِ عظیم آباد کو صرف ایک علاقائی ادبی دبستان کے طور پر نہیں، بلکہ ایک مخصوص فکری رویے اور تخلیقی شعور کے نمائندہ دبستان کے طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔

کتاب میں شامل تین مضامین 'غالب کی شاعری میں تکثیری پہلو'، 'آزاد: ہندوستانی تکثیریت کے امین' اور 'علامہ اقبال کی شاعری کا تصور وطنیت' میں مصنف نے ہندوستان کی لسانی، مذہبی اور تہذیبی رنگارنگی کے پس منظر میں تکثیریت کے نمایاں خدوخال کو موضوع بحث بنایا ہے۔ مصنف نے غالب، علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کے فکر و فن سے متعلق متعدد مستند حوالوں کی روشنی میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ تینوں شخصیات اپنے اپنے عہد میں ایک روشن خیال، وسیع النظر اور انسانی اقدار کے علم بردار ادیب و مفکر کے طور پر ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے مبلغ نظر آتے ہیں۔ لہٰذا غالب کی شاعری میں موجود فکری وسعت، مذہبی رواداری، انسانی ہمدردی اور مختلف تہذیبی اثرات کی آمیزش کو مصنف نے ہندوستانی معاشرے کی تکثیری ساخت سے مربوط کیا ہے۔ اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کے حوالے سے یہ دکھایا ہے کہ ان کی فکر میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب، مذہبی ہم آہنگی، قومی یکجہتی اور مختلف طبقات کے باہمی احترام کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے نزدیک ہندوستان محض جغرافیائی خطہ نہیں بلکہ مختلف زبانوں، مذاہب اور تہذیبوں کے اشتراک سے تشکیل پانے والی ایک زندہ تہذیبی وحدت ہے۔

علامہ اقبال کے تصورِ وطنیت کے مطالعے میں بھی مصنف نے ان کے فکری ارتقا اور ہندوستانی تناظر کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مصنف نے اپنی کتاب میں مختلف النوع موضوعات کو اپنی تنقیدی بصیرت سے ان پوشیدہ رموز و نکات کو تلاش کرنے کی کامیاب کوشش

کی ہے، جن کی معنویت اور افادیت آج کے بدلتے ہوئے معاشرے میں بھی پوری طرح برقرار ہے۔ ان کے مضامین محض ماضی کے ادبی وفکری مباحث کا احاطہ نہیں کرتے بلکہ عصرِ حاضر کے سماجی، تہذیبی اور فکری مسائل سے بھی ایک بامعنی رشتہ قائم کرتے ہیں۔

کتاب کی ایک نمایاں خوبی اس کا سادہ، شستہ اور رواں اسلوبِ بیان ہے۔ مصنف نے ثقیل اور بھاری بھرکم الفاظ کے غیر ضروری استعمال سے گریز کرتے ہوئے عام فہم زبان کو ترجیح دی ہے۔ امید ہے کہ ڈاکٹر عثمانی کی یہ کاوش علمی وادبی حلقوں میں نہ صرف قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی بلکہ اردو ادب کے سنجیدہ قارئین اور محققین کے لیے بھی مفید ثابت ہوگی۔

کتابوں کے ساتھ

مصنف: ثناءاللہ دوگھروی

صفحات: 272، قیمت: 300 روپے

مبصر: نوشاد عالم ندوی، E-167/1، شاہین باغ، نئی دہلی

ثناءاللہ ثناء دوگھروی ایک باصلاحیت شاعر، نثر نگار اور ماہر تبصرہ نگار ہیں۔ ان کے تبصرے مختلف اخبارات اور ادبی رسائل کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب بھی ان کی اسی علمی وادبی کاوش کا ثمرہ ہے، جس میں ان کے شائع شدہ تبصروں کو یکجا کرکے 'کتابوں کے ساتھ' کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے۔ شاعری کے میدان میں بھی ثناء دوگھروی نے نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ ان کے شعری مجموعوں 'اڑان سے آگے'، 'ستاروں سے آگے' اور 'متاعِ تشنگی' کو اہلِ ذوق نے خوب پذیرائی بخشی ہے۔

صاحبِ کتاب نے مقدمہ 'اپنی بات' میں تبصرہ نگاری کے فن، اس کی اہمیت اور اس کے بنیادی اصولوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ مصنف نے واضح کیا ہے کہ ایک اچھے تبصرے میں کتاب کا تعارف، اس کا مختصر خلاصہ، اس کے فکری وفنی محاسن اور تجزیاتی مطالعہ بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح تبصرہ نگار کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مصنف کے مزاج، اسلوب اور فکر کو سمجھے۔ ان اصولوں کی جھلک 'کتابوں کے ساتھ' میں شامل ہر تبصرے میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

'کتابوں کے ساتھ' ثناءاللہ ثناء دوگھروی کی تازہ تصنیف ہے، جس میں مختلف اہلِ قلم کی کتابوں پر تحریر کیے گئے تبصروں کو یکجا کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں 105 مختلف کتابوں پر تبصرے شامل ہیں، جنھیں مصنف نے نہایت سلیقے کے ساتھ حروفِ تہجی کی ترتیب سے مرتب کیا ہے۔

مصنف کے تبصروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کتاب کے محض خلاصے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس کے فکری، فنی اور اسلوبیاتی پہلوؤں کا بھی متوازن جائزہ لیتے ہیں۔ وہ مصنف کے مقام، موضوع کی اہمیت، زبان وبیان، اسلوبِ اظہار اور مجموعی تاثر پر نہایت اعتدال کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔

کتاب کے اختتام پر معروف ادیب اور نقاد ڈاکٹر عطا عابدی کا تاثراتی مضمون ''ثناء کے تبصرے اور مصنف کا تعارف'' شامل ہے، جو اس کتاب کی اہمیت کو مزید نمایاں کردیتا ہے۔

مصنف کی زبان نہایت سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ وہ مشکل الفاظ اور بوجھل تراکیب سے حتیٰ الامکان گریز کرتے ہیں، تاہم سادگی کے باوجود ان کے اسلوب میں ادبی وقار اور معنوی گہرائی برقرار رہتی ہے۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ 'کتابوں کے ساتھ' اس میں شامل ہر تبصرہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ مصنف نے متعلقہ کتاب پر نہایت غور وفکر اور مطالعے کے بعد اپنی رائے قائم کی ہے۔ ان تبصروں میں مصنف نے غیر ضروری طوالت سے گریز کرتے ہوئے اختصار سے کام لیا ہے۔ گویا یہ تبصرے اختصار کے باوجود فکری گہرائی، تنقیدی بصیرت اور حسنِ اظہار کے اعتبار سے قابلِ توجہ ہیں۔

کتاب میں شامل پروفیسر شہاب الدین ثاقب کی تصنیف 'شہر میرے خواب کا' پر کیا گیا تبصرہ اس کی عمدہ مثال ہے۔ مصنف نے نہایت سادہ مگر موثر انداز میں کتاب کی فکری جہات، اسلوبِ بیان اور ادبی محاسن کو نمایاں کیا ہے۔

کتاب میں شامل پروفیسر طارق جمیلی کے شعری مجموعے 'جذبِ دروں' پر لکھا گیا تبصرہ بھی اپنی فکری گہرائی اور تنقیدی توازن کے اعتبار سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ثناء دوگھروی لکھتے ہیں کہ شاعر نے اپنے گرد وپیش کے مشاہدات، زندگی کے تلخ تجربات اور معاشرتی مسائل کو نہایت خلوص اور سچائی کے ساتھ اپنے کلام کا حصہ بنایا ہے۔ ان کے مطابق طارق جمیلی کی شاعری محض تخیل کی پرواز نہیں بلکہ زندگی کے حقیقی تجربات کا آئینہ ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر مشتاق احمد کی تصنیف 'آئینہ حیراں ہے' پر کیا گیا تبصرہ بھی قابلِ ذکر ہے، جس میں مختلف شعرا کے فکری، فنی اور جمالیاتی پہلوؤں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

معروف صحافی احمد جاوید کی کتاب 'آسان تذکرۂ خاک' پر ان کا تبصرہ بھی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ یہ کتاب مختلف شخصیات کے حالاتِ زندگی، خدمات اور علمی وادبی کردار کو نہایت سادہ، رواں اور دل نشیں انداز میں پیش کرتی ہے۔ ان تمام تبصروں کا مجموعی مطالعہ اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ ثناء دوگھروی نے ہر کتاب کے ساتھ انصاف کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔

ثناءاللہ ثناء دوگھروی نے اس مجموعے میں شامل تبصروں کے ذریعے نہ صرف مختلف اہلِ قلم کی تصانیف کا تعارف کرایا ہے بلکہ اردو تبصرہ نگاری کی علمی روایت کو بھی مضبوط بنانے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ یہ مجموعہ نہ صرف اہلِ ادب میں مقبول ہوگا بلکہ آئندہ آنے والے تبصرہ نگاروں کے لیے بھی مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔ ثناءاللہ ثناء دوگھروی نے اس تصنیف کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ تبصرہ نگاری محض کتابوں کا تعارف نہیں بلکہ ایک ذمہ دار، سنجیدہ اور تخلیقی ادبی عمل ہے۔

ترتیب

شیش محل

مصنف: شوکت تھانوی، مرتب: ڈاکٹر مشتاق اعظمی

صفحات: 223، قیمت: 385، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: ذیشان برادرس، آسنسول

مبصر: افراز خان، ریسرچ اسکالر، ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جے این یو، نئی دہلی

اردو ادب میں تدوین وترتیب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ترتیب کی بدولت اردو ادب میں کچھ ایسے نادر ونایاب نسخے موجود ہیں جس کو اگر تدوین وترتیب کے مراحل سے نہ گزارا گیا ہوتا تو یقیناً اردو ادب کے اہم اور قیمتی اثاثے سے ہم محروم رہ جاتے۔

زیرِ نظر کتاب 'شیش محل' شوکت تھانوی کے مزاحیہ شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے۔

یہاں یہ واضح کرتا چلوں کہ 'شیش محل' سب سے پہلے اردو بک اسٹال، لاہور سے 1950 میں شائع ہوئی تھی۔ مشتاق اعظمی نے زیرنظر کتاب کو از سرِنو ترتیب دیا جو نومبر 2025 کو ذیشان برادرس، آسنسول سے شائع ہوئی۔ مشتاق اعظمی کی شناخت افسانہ نگار، تذکرہ نگار، مترجم کے طور پر ہوتی ہے۔ ان کی اب تک کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، جن میں 'آدھا آدمی'، 'نارسیدہ' اور 'یہ دھواں سا' (افسانوی مجموعے)، 'کھلونا' اور 'کنکر منتر' (بچوں کا ادب)، ''اشارت و ارشادات' (مضامین کا مجموعہ) 'بیدی میرا ہمدم میرا دوست' (ترجمہ شدہ) قابل ذکر ہیں۔

'شیش محل' میں مشتاق اعظمی نے 'گفتنی ناگفتنی' کے عنوان سے ایک طویل مقدمہ تحریر کیا ہے، جس میں انھوں نے سب سے پہلے اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت، آغاز و ارتقا اور اردو کے نمائندہ مزاح نگاروں کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد شوکت تھانوی کے حالات زندگی کے کم و بیش تمام پہلوں پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ شوکت تھانوی کا شمار اردو کے بہترین مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی زندگی کے کئی دلچسپ واقعات مشہور ہیں۔ ان مزاحیہ واقعات کو مشتاق اعظمی نے اس مقدمے میں شامل کیا ہے۔ یہاں مرتب نے شوکت تھانوی کے بچپن کا ایک دلچسپ واقعہ رقم کیا ہے، ملاحظہ کریں:

''میری ایک غزل چھپ گئی کچھ نہ پوچھیے میری خوشی کا عالم میں نے وہ رسالہ کھول کر ایک میز پر رکھ دیا تھا کہ ہر آنے جانے والے کی نظر اس پر پڑ سکے مگر شامت اعمال کہ سب سے پہلی نظر والد صاحب کی پڑی انھوں نے یہ غزل پڑھتے ہی ایسا شور مچایا گویا چور پکڑ لیا ہو۔ والدہ محترمہ کو بلا کر کہا آپ کے صاحبزادے فرماتے ہیں کہ

ہمیشہ غیر کی عزت تیری محفل میں ہوتی ہے
ترے کوچے میں ہم جا کر ذلیل و خوار ہوتے ہیں

میں پوچھتا ہوں یہ جاتے ہی کیوں ہیں، کس سے پوچھ کر جاتے ہیں والدہ بیچاری سہم کر رہ گئیں اور خوف زدہ آواز میں کہا:
''غلطی سے چلا گیا ہوگا۔'' (مابدولت، ص 14-13)

مشتاق اعظمی نے اس طرح کے بہت سے دلچسپ اور مزاحیہ واقعات کا ذکر کیا ہے جس سے شوکت تھانوی کے مزاحی ذہن کا اندازہ ہوتا ہے۔

شوکت تھانوی فطرتاً مزاح نگار تھے۔ وہ خوش طبع اور خوش فکر انسان تھے۔ زیر نظر کتاب میں مشتاق اعظمی نے موصوف کی تمام تصانیف کا ذکر بھی کیا ہے جن میں 'موج تبسم'، 'بحر تبسم'، 'طوفان تبسم'، 'بار خاطر'، 'جوڑ توڑ'، 'سنی سنائی'، 'خدانخواستہ'، 'بکواس'، 'بقراط'، 'قاعدے بے قاعدے'، 'الٹ پھیر'، 'لاہوریات'، 'قاضی جی'، 'منشی جی'، 'بھابھی' اور 'مابدولت' وغیرہ اہم ہیں۔

'شیش محل' پر روشنی ڈالتے ہوئے مشتاق اعظمی لکھتے ہیں '' یہ کتاب دراصل ایک طلسماتی محل ہے جس میں شوکت تھانوی نے 112 احباب کے چہروں کو حروف تہجی کے مطابق ترتیب دیا ہے۔'' (ص، 23) یہاں یہ واضح کرتا چلوں کہ گنتی کرنے پر ان خاکوں کی تعداد 113 ہے لیکن مشتاق اعظمی نے 112 لکھا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ شوکت تھانوی نے افقر موہانی کا صرف نام اور فارسی شعر کا ایک مصرع 'آفاقہا گردیدہ ام لیکن تو چیزے دیگرم' درج کیا ہے۔ شاید مشتاق اعظمی نے اس تحریر کو خاکے میں شمار نہیں کیا ہے۔ دوران ترتیب جن جن کتب و رسائل سے استفادہ کیا ہے اس کے حوالے و حواشی بھی کتاب میں درج ہیں۔

زیرنظر کتاب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس طرح کی سادہ اور سلیس زبان اور جملوں کے الٹ پھیر سے مزاح پیدا کرنا شوکت تھانوی کا وطیرہ رہا ہے۔ موصوف کو فن مزاح نگاری میں کس قدر مہارت حاصل تھی اس بات کا اندازہ ذیل میں درج اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

''اس مجموعے میں جن حضرات کا ذکر ہے ان میں سے بہت دماغ جدائی دے چکے ہیں (نوٹ: میرا خیال ہے یہاں 'داغ جدائی' ہوگی کیونکہ 'داغ جدائی' کا مطلب 'بچھڑنے کا وہ زخم جو دل پر نشان چھوڑ جاتا ہے' ممکن ہے یہاں پروف کی غلطی ہو) اور بہت سے اس میں بخل کر رہے ہیں کچھ کی موت میرے لیے ناقابل برداشت ہے اور کچھ کی زندگی معلوم نہیں کتنے سالوں سے برداشت کر رہا ہوں۔'' (ص 36)

مرتب نے کتاب کے درمیان اور آخر میں شوکت تھانوی، ان کی شریک حیات اور کچھ احباب جن میں ساغر نظامی، نسیم انہونوی وغیرہ کی دلچسپ اور رنگین تصاویر شامل کی ہیں جس سے کتاب کی زیبائش میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ یہ کتاب مجلد فام میں ہے اور مزاح نگاری کے حوالے سے کافی اہمیت کی حامل ہے۔

تیشہ اٹھا لیا ہے تو..

مرتب: ایس ٹی رضا
صفحات: 244، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2025
ناشر: حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: ساحر داؤدنگری، 322، گلی نمبر 9، للیتا پارک، لکشمی نگر، دہلی۔92

زیر تبصرہ کتاب 'تیشہ اٹھا لیا ہے تو...' اردو کے مشہور صحافی ڈاکٹر سید احمد قادری کے ان اداریوں کا مجموعہ ہے، جسے معروف صحافی ایس ٹی رضا نے مرتب کیا ہے۔ یہ وہ اداریے ہیں جو ڈاکٹر سید احمد قادری کی ادارت میں بہار کے تاریخی شہر گیا سے 1984 سے 1993 تک ہفتہ وار 'بودھ دھرتی' کے نام سے نکلنے والے ہفتہ وار اخبار میں شائع ہوتے رہے۔ اس ہفت روزہ اخبار کے ہر شمارہ میں سیاسی منظرنامہ کے ساتھ ساتھ ادبی دنیا کی خبریں، تبصرے، حالات حاضرہ پر اداریے شائع ہوتے تھے۔ قارئین ان اداریوں پر اپنی رائے کا اظہار اس اخبار میں شائع ہونے والے خطوط کے کالم 'قیامت کے یہ نامے' میں کیا کرتے تھے۔ پیش لفظ بعنوان 'سید احمد قادری کے اداریے' میں کتاب کے مرتب نے لکھا ہے کہ اس اخبار کے اداریوں کو ملک کی مختلف ریاستوں سے شائع ہونے والے اردو کے اخبارات و رسائل بڑے اہتمام سے شائع کرتے تھے۔

'اداریہ' کسی بھی رسالے یا اخبار کی جان ہوتا ہے۔ کبھی کبھار صرف اداریہ پڑھ کر ہی قارئین اس کے اندر موجود تحریروں کے بارے میں اندازہ لگا لیتے ہیں کہ اس کے اندر کس نوعیت کی تحریریں ہوں گی، اسی لیے اداریہ لکھنے سے پہلے بہت غور و خوض کیا جاتا ہے۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ پوری ٹیم کے باہم مشورے سے اداریے کا مضمون طے پاتا ہے۔ اداریے کی معنویت اور اس کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے کتاب کے مرتب ٹی ایس رضا لکھتے ہیں:

''اداریہ چونکہ کسی بھی اخبار یا رسالہ کی روح ہوتا ہے، اس لیے بڑے اخبارات و رسائل کے اداریہ کے لیے باضابطہ ماہرین صحافی یا اداریہ نگاروں کی ایک

باضابطہ ادارتی ٹیم ہوتی جو ہر دن کی ادارتی میٹنگ میں یہ طے کرتی ہے کہ آنے والے کل کے اخبار کا اداریہ کس موضوع پر ہوگا اور یہ اداریہ ادارتی ٹیم کے ماہرین کا کون ممبر اداریہ سپرد قلم کرے گا۔''

اس کا ثبوت کچھ دہائی قبل جب اردو صحافت کا سنہری دور تھا، اس دور میں کسی بھی اخبار یا رسالے کا اداریہ خاص اہمیت کا حامل سمجھا جاتا تھا۔ اداریے سے ہی اخبار و رسائل کے حسن اور معیار کا پتہ چلتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور میں بعض اخبارات و رسائل قارئین کے درمیان محض اپنے اداریے کی وجہ سے مقبول تھے۔ اس شاندار روایت کے بنیاد گزاروں میں بلاشبہ مولانا ابوالکلام آزاد کا نام لیا جاسکتا ہے، جن کے اداریے قارئین میں بہت مقبول تھے۔

'تیشہ اٹھالیا ہے تو..' میں مرتب ایس ٹی رضا نے 'پیش لفظ' میں اداریہ اور اداریہ نگاری کی اہمیت اور افادیت کے تعلق سے لکھا ہے کہ:

''کسی بھی اخبار یا رسالہ کا اداریہ نہ صرف اس اخبار اور رسالہ کی پالیسی اور اس کے مطمح نظر کو واضح کرتا ہے بلکہ ہر شمارہ میں حالات حاضرہ کے کسی بھی سیاسی، سماجی، معاشرتی، اقتصادی، تعلیمی، علمی، ادبی، سائنسی موضوع یا کسی بھی ہنگامی واقعہ یا سانحہ کی غیر معمولی خبر یا کسی اہم موضوع کی تہہ میں اتر کر اداریہ نگار اپنے قلم کی بیباکی، ہمت وحوصلہ، جرأت اور حق گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عام فہم زبان میں معروضی تجزیہ اپنے مخصوص اسلوب میں اس خوبصورتی اور حسن ومعیار کے ساتھ اس کے منفی و مثبت پہلو کو اجاگر کرے کہ قاری اداریہ نگار کے اظہار بیان سے نہ صرف متاثر ہو بلکہ اس کے فکر واحساس کے دریچے بھی واہو جائیں۔

اس کتاب میں شامل ڈاکٹر سید احمد قادری کے کل 87 اداریوں کو 9 مرکزی عنوانات کے تحت منقسم کیا گیا ہے۔ ان میں اردو زبان ادب اور مسائل، بھارت کی آزادی، جمہوریت اور انتخاب، بھارت کے وزرا اعظم، ریاست بہار اور سیاست، چند شخصیات اور یاد ماضی اور کچھ تلخ وشیریں وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

ان مرکزی عنوانات میں ذیلی عنوانات کے تحت جو اداریے شامل ہیں، وہ نہ صرف ہمیں چونکاتے ہیں بلکہ مطالعہ کے لیے مہمیز بھی کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان اداریوں میں زبردست فکر ومعنی کے ساتھ ساتھ صحافتی دیانتداری اور دور اندیشی بھی پنہاں ہے۔ اس ضمن میں ان کے کئی اداریے پیش کیے جاسکتے ہیں جیسے تجارت بن گئی ہے اردو کی تعلیم، اردو ادب کے بہروپیے، اردو کا برا وقت آگیا ہے، سید شہاب الدین کا مسلم کنونشن، اردو کتابوں کی باڑھ، بھارت میں مسلم قیادت کا فقدان.. وغیرہ وغیرہ۔ اسی نوع کا ایک اداریہ 22 دسمبر 1985 کے شمارہ میں 'صحافت میں سیاست ہی سیاست' کے عنوان سے سپرد قلم کیا گیا ہے جس میں صحافیوں کو ان کی ذمے داریوں کے تئیں احساس دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔

ایسے چبھتے اور فکر واحساس کو مہمیز کرنے والے اداریوں کی شمولیت سے اس کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ 'تیشہ اٹھالیا تو..' کے اداریوں کو، جس دور میں یہ اداریے لکھے گئے تھے، اس وقت کے سماجی، معاشرتی، سیاسی، ادبی اور لسانی منظرنامے کو ذہن رکھتے ہوئے مطالعہ کیا جائے تو ان کی اہمیت اور افادیت میں مزید اضافے کے ساتھ فکر واحساس کے دروازے بھی واہو جاتے ہیں۔

ترجمہ

مسلم اذہان کی تشکیل نو

مصنف: مصطفیٰ آکیول، مترجم: جلیس اختر نصیری

صفحات: 344، قیمت: 600، سنہ اشاعت: 2026

ناشر: خسرو فاؤنڈیشن، ڈی-319، ڈیفنس کالونی، نئی دہلی

مبصر: شاہ عمران حسن، اے 22، شاہ ہاوس،، نگی مسجد کالونی مدن پور کھادر ایکسٹینشن، پارٹ: 3، نالہ روڈ، سریتا وہار، نئی دہلی۔ 110076

مسلمانوں کو علمی، فکری، معاشی اور سماجی اعتبار سے ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے برسوں سے مختلف سطحوں پر کوششیں جاری ہیں۔ اہل علم اور اہل فکر کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ عام مسلمان بھی زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کریں، زمانے کے تقاضوں کو سمجھیں اور بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ہم آہنگ ہوکر آگے بڑھیں۔ اسی مقصد کے پیش نظر مختلف زبانوں میں نشر واشاعت، تعلیم وتربیت اور افہام وتفہیم کا سلسلہ ماضی میں بھی جاری رہا ہے اور آج بھی مختلف صورتوں میں جاری وساری ہے۔

مسلمانوں کو فکری اعتبار سے بیدار، بلند اور عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ماضی میں جن اصحاب قلم اور مفکرین نے نمایاں کام کیا ہے، ان میں علامہ اقبال کا نام نمایاں ہے۔ علامہ اقبال نے انگریزی زبان میں ایک سلسلۂ خطبات پیش کیا تھا، جس کا عنوان تھا:

Reconstruction Of Religious Thought In Islam

یعنی فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید۔

تقریباً ایک صدی قبل عظیم شاعر اور فلسفی علامہ اقبال نے جدید دور کے مسلمانوں کے فکری مسائل اور ان کے ممکنہ حل کے سلسلے میں اپنا نظریہ پیش کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ''جدید مسلمان کے سامنے جو کام ہے، وہ بے حد عظیم ہے؛ اسے پورے نظامِ اسلام پر ازسرِ نو غور کرنا ہے، مگر اس طرح کہ ماضی سے کامل قطعِ تعلق بھی نہ ہو۔''

یہ باتیں مجھے اس وقت یاد آئیں جب میں ترکی نژاد امریکی مسلمان مصطفیٰ آکیول کی کتاب 'مسلم اذہان کی تشکیلِ نو' پر تبصرہ کر رہا تھا۔ اس کتاب میں بھی اُنھی بنیادی پہلوؤں پر گفتگو کی گئی ہے جن پر اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق علامہ اقبال نے تقریباً ایک صدی قبل کلام کیا تھا۔ تاہم، دورِ جدید کے مسائل، سوالات اور فکری ضرورتوں کے پیشِ نظر مصطفیٰ آکیول نے انھی موضوعات کو ایک نئے زاویے، نئے اسلوب اور نئے فکری پس منظر میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب اصل انگریزی متن میں امریکہ سے 2021 میں شائع ہوئی تھی۔ اردو میں اس کا ترجمہ منظرِ عام پر آنا اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس کے ذریعے جدید مسلم فکر سے متعلق ایک اہم بحث اردو خواں طبقے تک بآسانی پہنچ گئی ہے۔

'فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید' کے موضوع پر اردو زبان میں حالیہ دور میں کئی بڑے اہلِ قلم نے کام کیا ہے، جن میں ایک نمایاں نام پروفیسر مشیر الحق کا ہے۔ ان کے علاوہ مولانا وحید الدین خاں، جاوید احمد غامدی اور مولانا وارث مظہری وغیرہ کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اب اردو میں فکرِ اسلامی کے مباحث پر مصطفیٰ آکیول کی زیرِ نظر کتاب ایک اہم اضافہ ہے۔

انھوں نے اس کتاب کو اپنے دو معصوم بچوں کے نام معنون کرتے ہوئے لکھا ہے: ''میرے عزیز بیٹوں لیونت طٰہٰ اور ایلفے رؤف کے نام، تاکہ وہ ایمان کی روشنی

کے ساتھ ساتھ عالمی انسانی اقدار کی روشنی میں بھی پروان چڑھیں۔'' یہ انتساب دراصل پوری کتاب کے بنیادی مزاج کی بھی عکاسی کرتا ہے، جس میں ایمان کے ساتھ عقل، انسانی وقار، اخلاق، آزادیِ فکر اور عالمی انسانی اقدار کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔

اس کتاب کا پیش لفظ خسرو فاؤنڈیشن کے کنوینر ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن نے تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''بعض کتابیں محض مطالعے کے لیے نہیں ہوتیں، بلکہ وہ قاری کو سوچنے، سوال کرنے اور اپنے فکری زاویے پر نظرِ ثانی پر مجبور کرتی ہیں۔ مصطفیٰ آ کیول کی یہ کتاب بھی اسی قسم کی ایک سنجیدہ فکری کاوش ہے، جو مذہب، آزادیِ فکر، اخلاقیات اور انسانی شعور جیسے بنیادی موضوعات کو نہایت متوازن اور دیانت دارانہ انداز میں پیش کرتی ہے... اس میں غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کی نوعیت کو قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔''

جدید دنیا اور اسلام کے موضوع پر مصطفیٰ آ کیول گذشتہ دو دہائیوں سے زائد عرصے سے تحریر و تقریر کے ذریعے اپنی بات لوگوں تک پہنچا رہے ہیں۔ اس دوران انھیں قدامت پسند مسلمانوں کی جانب سے زد و کوب کا بھی نشانہ بنایا گیا۔

مصطفیٰ آ کیول جہاں مسلم تہذیب کی شاندار روایات پر فخر کرتے ہیں، وہیں وہ اس امر پر بھی سوال اُٹھاتے ہیں کہ آخر ہم نے ان روایات کو ترک کیوں کر دیا۔ ان کے ہاں ماضی محض فخر کا موضوع نہیں بلکہ غور و فکر کا سرچشمہ بھی ہے۔ وہ اسلامی تاریخ کے ان روشن اور کشادہ فکری کے حامل ادوار کی طرف توجہ دلاتے ہیں جن میں علمی اختلاف، فکری تنوع اور مختلف آرا کے لیے گنجائش موجود تھی۔

وہ سوال کرتے ہیں کہ جب خانہ کعبہ کے اندر مرد اور عورت ایک ساتھ اور یکساں انداز میں خدا کی عبادت کرتے ہیں تو باقی دوسری جگہوں پر یہ کیونکر ممکن نہیں ہے۔ 2011 میں انھوں نے TED Talks میں اس موضوع پر بطورِ خاص 16 منٹ کا خطاب کیا تھا، جسے بہت زیادہ پسند کیا گیا۔ آج بھی اسے یوٹیوب پر سنا جا سکتا ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف ایک باہمت انسان ہیں۔ وہ اپنی بات مضبوطی کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور مشکل، حساس اور متنازع موضوعات سے بھی گریز نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ انھوں نے ایک معروف مگر فراموش شدہ اسلامی روایت 'ارجاء' پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔

جیسے جیسے ہم کتاب کا مطالعہ کرتے جاتے ہیں، مصنف کی وسعتِ مطالعہ اور گہرائیِ فکر کا اندازہ بھی بڑھتا جاتا ہے۔ وہ خیالی یا محض جذباتی باتیں نہیں کرتے بلکہ اپنے نقطۂ نظر کے حق میں تاریخی شواہد، علمی حوالوں اور فکری دلائل پیش کرتے ہیں۔ خواہ وہ امام احمد بن حنبل کا ذکر ہو یا ابوالحسن اشعری کا، ابن خلدون کا مقدمہ ہو یا معتزلہ کا نظریہ، مصنف ہر موضوع کو اس کے تاریخی اور فکری پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مصنف اگرچہ وسعتِ نظر اور فکری آزادی کی بات کرتے ہیں، تاہم اپنی تحریر میں وہ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ اسلام میں ہر مسئلے کا اولین ماخذ قرآن ہے، جو کتاب اللہ ہے۔ (ص: 48) اس طرح وہ فکری آزادی کو مذہبی ماخذ سے بے تعلق کرنے کے بجائے قرآن کو بنیادی رہنما حیثیت دیتے ہیں۔

مصطفیٰ آ کیول مسلمانوں کے اخلاقی رویے پر بھی شدت سے تنقید کرتے ہیں اور یہ سوال اُٹھاتے ہیں کہ آخر ہم اخلاقی اعتبار سے پست کیوں ہو گئے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ لبنانی نژاد فرانسیسی ادیب امین معلوف کا یہ قول نقل کرتے ہیں: ''ان کے پاس دین ہے، وہ گمان کرتے ہیں کہ اب انھیں اخلاق کی حاجت نہیں۔'' وہ اس قول کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ غیر شعوری طور پر مسلم اذہان پر یہی رویہ چھایا ہوا ہے۔ یعنی مذہب کو محض شناخت یا ظاہری وابستگی تک محدود کر دیا گیا ہے، جب کہ اس کا اصل مقصد انسانی کردار اور اخلاق کی تعمیر بھی ہے۔

علمِ کلام کے ذیل میں مصطفیٰ آ کیول نے روزمرہ کی زندگی سے متعلق متعدد مسائل پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ مثلاً وہ عورتوں کے تنہا سفر کرنے کے بارے میں بھی گفتگو کرتے ہیں۔ دورِ جدید کے معروف عالمِ دین اور محقق جاوید احمد غامدی بھی ''عورتوں کو ضرورت کے پیشِ نظر تنہا سفر کے حق میں ہیں۔'' (دیکھیے: مقامات، از جاوید احمد غامدی، ص: 252)

موجودہ زمانہ ہر لحاظ سے ایک نیا زمانہ ہے، جس نے زندگی کے تمام شعبہ جات کو پوری طرح بدل کر رکھ دیا ہے۔ قدامت پسند روش موجودہ دور کے ساتھ نہیں چل سکتی، اس لیے کہ جدید حالات اس بات کی دعوت دے رہے ہیں کہ نئے حالات کے مطابق قدم بڑھایا جائے اور زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کی جائے۔ پوری کتاب کا ماحصل بھی کسی نہ کسی درجے میں یہی ہے۔ تاہم، اخیر میں مصنف یہ بھی کہتے ہیں کہ ''فکری تنوع کو باقی رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے سیکھا جائے تاکہ شعور و آگہی کی نئی قندیلیں روشن ہوں۔''

آخر میں مصنف مسلم اذہان سے ایک دردمندانہ اپیل کرتے ہیں کہ ہم باہر کی دنیا کو کوسنے کے بجائے اپنے باطن میں جھانکیں، اپنے فکری ورثے کو ازسرِ نو دریافت کریں اور ایسے مستقبل کا خواب دیکھیں جو عقل کی روشنی، رحم کی حرارت، آزادی کے شعور اور انسانی وقار کی بنیاد پر استوار ہو۔ (ص: 265)

زیرِ نظر کتاب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں جو بھی دلائل دیے گئے ہیں یا جس نظریے پر گفتگو کی گئی ہے اس کے ساتھ ساتھ ایک طویل ببلیوگرافی (Bibliography) بھی دی گئی ہے، تاکہ قاری کو متعلقہ حوالوں اور ماخذ تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ یہ چیز کتاب کی علمی اہمیت میں مزید اضافہ کرتی ہے اور قاری کو مصنف کے استدلال کے بنیادی مآخذ تک رسائی کا موقع فراہم کرتی ہے۔

'مسلم اذہان کی تشکیلِ نو' ایک دلچسپ اور قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔ دلچسپ اس معاملے میں کہ اس کا اندازِ بیان خشک اور بوجھل نہیں ہے۔ حالانکہ یہ اصل میں انگریزی زبان میں لکھی گئی کتاب ہے اور اردو میں ترجمہ ہوئی ہے، مگر مترجم ڈاکٹر جلیس اختر نصیری نے نہایت سلیس، رواں اور شستہ انداز میں اسے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ترجمے کی زبان اس قدر فطری اور رواں ہے کہ پڑھنے والا بعض مقامات پر یہ محسوس ہی نہیں کرتا کہ وہ کسی ترجمہ شدہ کتاب کا مطالعہ کر رہا ہے، بلکہ اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کتاب براہِ راست اردو میں لکھی گئی ہو۔ اس عمدہ ترجمے اور اہم کتاب کی اشاعت کے لیے مصنف مصطفیٰ آ کیول نے خاص طور پر خسرو فاؤنڈیشن اور اس کے کنوینر ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن کا شکریہ ادا کیا ہے۔ یقیناً ایسے موضوعات پر اہم اور معیاری کتابوں کی اشاعت اردو کے علمی و فکری سرمائے میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔

آخر میں ہم بتاتے چلیں کہ خسرو فاؤنڈیشن کی کوششوں سے یہ اہم ترین کتاب منظرِ عام پر آئی ہے۔ امید کہ اس کتاب کو خاطر خواہ پذیرائی ملے گی۔

■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

ایف آئی پی کی جانب سے قومی اردو کونسل کے رسالہ اردو دنیا کو 'جرنلس اینڈ ہاؤس میگزین' کے زمرے میں اول ایکسی لینس ایوارڈ

نئی دھلی: دی فیڈریشن آف انڈین پبلشرز کے چھیالیسویں بک پروڈکشن ایوارڈ (2026) میں قومی اردو کونسل سے شائع ہونے والے موقر رسالہ ماہنامہ 'اردو دنیا' کو 'جرنلس اینڈ ہاؤس میگزین' کے زمرے میں اول 'ایکسی لینس ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ دی فیڈریشن آف انڈین پبلشرز ہر سال تقریباً 9 زمروں میں قومی سطح کا ایکسی لینس ایوارڈ دیتی ہے۔

واضح رہے کہ قومی اردو کونسل گزشتہ تین برسوں سے مسلسل انعام حاصل کرتی رہی ہے۔ اس سے قبل 2024 میں بھی ماہنامہ 'اردو دنیا' کو دوسرے انعام سے اور سال 2025 میں بچوں کی کہانی کی کتاب پر تیسرے انعام سے نوازا جا چکا ہے۔

بک پروڈکشن اور اشاعت کے میدان میں قومی کونسل کی یہ کامیابی ادارے کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال کی گہری لگن اور بک پبلشنگ سے ان کی دلچسپی کا ثبوت ہے۔ تقسیم انعام کی اس تقریب میں قومی اردو کونسل کی جانب سے اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی اور اسسٹنٹ ایڈیٹر محترمہ نہاں رباب نے شرکت کی۔ یہ اعزاز سپریم کورٹ آف انڈیا کے جج عزت مآب سنجیو سچدیوا کے ہاتھوں دیا گیا۔ اس دوران این بی ٹی کے ڈائرکٹر جناب یوراج ملک، معزز مہمانان اور دی فیڈریشن آف انڈین پبلشرز کے اراکین موجود رہے۔

قومی اردو کونسل اس کامیابی پر بک پروڈکشن اور ماہنامہ 'اردو دنیا' کی پوری ٹیم کو مبارکباد پیش کرتی ہے اور اپنے قارئین کا بطور خاص شکریہ ادا کرتی ہے۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 22 اگست 2026

قومی اردو کونسل میں منعقد ہونے والی فائنینس کمیٹی کی میٹنگ میں چند اہم پروپوزل پر لیے گئے فیصلے

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر دفتر میں 24 اگست کو فائنینس کمیٹی کی میٹنگ منعقد ہوئی تھی جس کی صدارت ڈاکٹر ماجد احمد تالی کوٹی نے کی اور ممبران میں جناب عرفان علی پیرزادہ اور شری پی وی سوریا نارائن مورتی (مہک حیدرآبادی) کے علاوہ شری شریانش موہن (ڈپٹی سکریٹری لینگویجز) اور وویک کمار (انڈر سکریٹری، آئی ایف ڈی، وزارت تعلیم حکومت ہند) نے شرکت کی تھی۔ اس میٹنگ

میں ادارے کی جانب سے کئی ایجنڈے پیش کیے گئے جن پر غور و خوض کے بعد کمیٹی نے ایجنڈوں کو منظوری دی۔ میٹنگ میں پاس کیے گئے ایجنڈوں میں ایک اہم ایجنڈہ موبائل بس سروس کی منظوری ہے۔ کمیٹی نے اردو کتابوں کی نمائش، فروخت اور کتاب کلچر کو بڑھاوا دینے کے لیے ایک خصوصی موبائل بس کی تجویز منظور کرتے ہوئے اس پر جلد کارروائی کی بات کہی۔ واضح رہے کہ کونسل کی جانب سے اس سے پہلے بھی موبائل بس کا انتظام کیا گیا تھا جس کی میعاد 2023 میں مکمل ہو جانے کے سبب یہ سروس معطل ہوگئی تھی۔ کمیٹی کی جانب سے پاس کیا جانے والا دوسرا اہم ایجنڈہ 'لرننگ مینجمنٹ سسٹم (ایل ایم ایس)' ہے۔ اس ایجنڈے کے تحت اردو سیکھنے والوں کو ویب اور موبائل ایپلی کیشن کے ذریعے اردو کورسز آڈیو اور ویڈیو اسباق، محاسبہ اور مواد تک رسائی فراہم کی جائے گی۔ یہ سروس آف لائن بھی دستیاب ہوگی اور طلبا کو ڈیجیٹل سرٹیفکٹ بھی فراہم کرے گی۔ تلفظ کی درست ادائیگی، اہم موضوعات پر لیکچر اور مشق کے ذریعے اسے مزید موثر بنایا جائے گا۔ قومی اردو کونسل کی یہ سروس نہ صرف ہندوستان بلکہ دیگر ممالک کے صارفین کے لیے بھی دستیاب ہوگی۔ تیسرا اہم ایجنڈہ قومی اردو کونسل کی مطبوعات کی آن لائن خرید و فروخت کے لیے ای کامرس پلیٹ فارم تیار کرنا ہے۔ قومی اردو کونسل نے 2200 سے زائد ٹائٹل شائع کیے ہیں، اس پلیٹ فارم کے ذریعے انھیں حاصل کرنا آسان ہو جائے گا۔ کتاب حاصل کرنے کے لیے آن لائن رقم کی محفوظ ادائیگی اور صحیح پتے پر کتابوں کی ڈیلیوری بھی اس پلیٹ فارم کے ذریعے ممکن بنائی جائے گی۔ چوتھا ایجنڈہ قومی اردو کونسل سے شائع ہونے والی 50 سے زائد اردو لغات اور انسائیکلوپیڈیا کو سرچ موڈ کے قابل (Searchable) بنانا ہے۔ اس ایجنڈے کے تحت قومی اردو کونسل کی تمام لغات کو ایک ویب اور موبائل ایپ پر دستیاب کرایا جائے گا جہاں تمام لغات کو ضم کر کے محققین، طلبا اور اساتذہ کے لیے اسے مستند ماخذ اور حوالے کی شکل دی جائے گی۔ اس منصوبے کو مرحلہ وار عمل میں لایا جائے گا جس میں مواد کو ڈیجیٹل فارم میں منتقل کرنا، صارف دوست بنانا، جدید ترین سرچ ٹولز (Search Tools) کو بروئے کار لانا شامل ہیں۔ ان کے علاوہ (Annual Account) اور مالی سال 27-2026 کے لیے اضافی فنڈ کے حوالے سے بھی کارآمد گفتگو ہوئی اور اسے بھی منظور کیا گیا۔

قومی اردو کونسل نے اپنے قیام کے ساتھ ہی اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے کلاسیکی اور مختلف علوم کی اردو میں کتابوں کی اشاعت کے ساتھ عصری تقاضے اور جدید ٹیکنالوجی کو ہمیشہ مدِ نظر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کونسل نے وقت کے ساتھ اپنے صارفین کی ضرورتوں کو سمجھتے ہوئے ویب سائٹ اور دیگر اسکیموں میں مناسب ترمیم و اضافے بھی کیے ہیں۔ ان ایجنڈوں کی منظوری سے کتابوں کی نمائش و فروخت کے لیے موبائل بس، آن لائن لغات اور ویب سائٹ ایپلی کیشن نہ صرف اردو زبان کی ترویج و اشاعت کا اہم حوالہ بنیں گے بلکہ اردو کے نئے قارئین بھی پیدا کریں گے۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 31 اگست 2026

اردو زبان میں طبی تاریخ نویسی اور تذکرہ نگاری کی روایت

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی بہ اشتراک اصلاحی ہیلتھ کیئر فاؤنڈیشن 'اردو زبان میں طبی تاریخ نویسی اور تذکرہ نگاری کی روایت' کے موضوع پر نہرو گیسٹ ہاؤس، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کمیٹی روم میں ایک روزہ سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار میں طبی تاریخ نویسی اور تذکرہ نگاری کی روایت، اس کے تاریخی وتہذیبی پس منظر اور اردو زبان و ادب سے اس کے گہرے رشتے کے حوالے سے پر مغز خطبات اور مقالات پیش کیے گئے۔

سیمینار کے افتتاحی اجلاس کے مہمانِ خصوصی ڈاکٹر نور ظہیر احمد (ڈائرکٹر جنرل، سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن) نے قومی اردو کونسل اور اصلاحی ہیلتھ کیئر فاؤنڈیشن کو اس اہم اور منفرد موضوع پر سیمینار کے انعقاد پر مبارک باد پیش کی۔ اپنے خطاب میں انھوں نے بین العلومی تناظر میں اردو زبان میں طبی تاریخ نویسی اور تذکرہ نگاری کی روایت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ طبی تاریخ محض امراض، علاج اور اطبا کے احوال کا بیان نہیں، بلکہ یہ ہمارے تہذیبی، علمی اور سماجی ارتقا کی ایک اہم دستاویز بھی ہے۔ اردو میں طبی تاریخ نویسی اور تذکرہ نگاری کی ایک گراں قدر روایت موجود ہے، جسے محفوظ کرنا اور نئی نسل تک منتقل کرنا ہماری علمی ذمہ داری ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ موجودہ ڈیجیٹل عہد میں ہمارے لیے یہ ناگزیر ہے کہ ہم اپنے طبی، ادبی اور علمی ورثے کو جدید ذرائع کے ذریعے محفوظ کریں اور اسے عالمی سطح پر متعارف کرائیں، تاکہ ہمارے اسلاف کی علمی کاوشیں محض ماضی کا حصہ بن کر نہ رہ جائیں، بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے تحقیق و جستجو کا سرچشمہ بن سکیں۔

اس سے قبل استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک)، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، نے قومی اردو کونسل کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اس موضوع سے متعلق کونسل کی جانب سے شائع ہونے والی اہم کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ کونسل نے علمی، ادبی اور تحقیقی کتابوں کی اشاعت کے علاوہ طبی، سائنسی اور سماجی علوم کے میدان میں بھی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ کونسل کی جانب سے جدید اور قدیم اطبا اور طب سے متعلق 50 سے زائد کتابوں کی ترتیب و تدوین بھی کی گئی ہے۔

مہمانِ اعزازی پروفیسر کوثر مظہری (صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے اپنی گفتگو میں طبی اصطلاحات اور اردو زبان کے باہمی رشتے پر نہایت جامع انداز میں روشنی ڈالی۔ انھوں نے اردو شاعری کے الفاظ، تراکیب اور قوافی میں مستعمل بعض ایسے الفاظ کی نشان دہی کی جو طبی اصطلاحات سے مماثلت رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے مختلف اہم ادویہ اور امراض کے ناموں کا حوالہ دیتے ہوئے اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ اردو زبان و ادب کا طب، بالخصوص یونانی طب کی تہذیبی و علمی روایت سے ایک گہرا، قدیم اور معنویت سے بھرپور رشتہ رہا ہے۔ یہ مماثلتیں اس بات کی غماز ہیں کہ اردو زبان و ادب اور طب کی روایت نے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ہماری تہذیبی اور علمی تاریخ کو ثروت مند بنایا ہے۔ پروفیسر کوثر مظہری نے مزید کہا کہ یونانی طب محض علاج معالجے کا ایک نظام نہیں، بلکہ یہ ایک وسیع تہذیبی اور علمی ورثہ ہے، جس کے اثرات ہماری زبان، ادب اور روزمرہ زندگی تک پھیلے ہوئے ہیں۔

سیشن کے دوسرے مہمانِ اعزازی ڈاکٹر یونس افتخار منشی (ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل، سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن) نے اپنے خطاب میں طب کی مخصوص زبان اور اس کے لسانی ارتقا پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ طب کی اپنی ایک مخصوص زبان ہوتی ہے اور جس معاشرے میں اس علم کی آبیاری ہوتی ہے، وہاں کی زبان بھی طبی اصطلاحات کی تشکیل، ترویج اور فروغ کا اہم ذریعہ بنتی ہے۔ طبی زبان کسی ایک زبان تک محدود نہیں رہتی، بلکہ مختلف تہذیبوں اور علمی روایتوں کے باہمی تعامل سے تشکیل پاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ طبی اصطلاحات میں فارسی اور عربی کے علاوہ دیگر زبانوں کے الفاظ بھی شامل ہوئے ہیں، جو صدیوں پر محیط علمی و تہذیبی میل

جول کی عکاسی کرتے ہیں۔ انھوں نے مختلف ادویہ اور امراض کے ناموں کی مثالیں پیش کرتے ہوئے ان کے ماخذ اور لسانی پس منظر پر روشنی ڈالی۔

ڈاکٹر یونس افتخار منشی نے مزید کہا کہ برصغیر ہندو پاک میں یونانی طب کے زندہ اور متحرک رہنے اور اس کی علمی روایت کو نسل در نسل منتقل کرنے میں اردو زبان نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو نے نہ صرف طبی علوم کے ابلاغ کو آسان بنایا بلکہ یونانی طب کے علمی سرمائے کو محفوظ رکھنے اور عام کرنے میں بھی ایک مؤثر وسیلے کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری ادا کی ہے۔

کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے حکیم وسیم احمد اعظمی (سابق ڈپٹی ڈائرکٹر، سینٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن) نے اردو تذکرہ نگاری کی روایت، اس کے ارتقا اور طبی تذکرہ نگاری کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے گفتگو کی۔ انھوں نے اردو تذکرہ نگاری کے حوالے سے فورٹ ولیم کالج کی علمی سرگرمیوں، مرزا علی لطف کے 'گلشن ہند'، حیدر بخش حیدری، میر تقی میر کے 'نکات الشعرا' اور محمد حسین آزاد کے 'آب حیات' جیسے اہم متون کا ذکر کیا اور تذکرہ نگاری کی روایت میں ان کی اہمیت کو واضح کیا۔ انھوں نے طبی تذکرہ نگاری کے ضمن میں 'تذکرۃ الاطباء'، 'طبقات الاطباء' اور دیگر تذکرۂ اطباء و حکما کی روایت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ طبی تذکرے محض اطبا، حکما اور ان کی تصانیف کا تعارف نہیں کراتے بلکہ اپنے عہد کی طبی فکر، علمی ماحول، تہذیبی صورتِ حال اور طب کے ارتقا کے اہم شواہد بھی فراہم کرتے ہیں۔ ان کے مطابق ایک اچھے تذکرے میں اختصار کے ساتھ جامعیت، تحقیق پسندی، غیر جانب داری اور مستند معلومات کا ہونا ضروری ہے۔ تذکرہ نگاری کا اسلوب غیر انشائیہ، متوازن اور غیر جانب دار ہونا چاہیے، تاکہ شخصیت اور اس کے علمی و فنی کارناموں کا حقیقت پسندانہ جائزہ پیش کیا جا سکے۔ انھوں نے کہا کہ یہ خصوصیات تذکرہ نگاری کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

تعارفی کلمات میں سید منیر عظمت (سکریٹری، اصلاحی ہیلتھ کیئر فاؤنڈیشن) نے یونانی طب اور صحت کے حوالے سے اس موضوع کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اردو زبان، طب اور برصغیر کی تاریخی و تہذیبی روایت کے باہمی تعلق پر گفتگو کرتے ہوئے اصلاحی ہیلتھ کیئر فاؤنڈیشن کے اغراض و مقاصد، تعلیمی سرگرمیوں، سماجی شعور بیدار کرنے اور سماجی خدمات کے حوالے سے بھی اظہار خیال کیا۔

افتتاحی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر عمیر منظر (ایسوسی ایٹ پروفیسر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس، لکھنؤ) نے کی، جبکہ کلماتِ تشکر ڈاکٹر نازش احتشام اعظمی (جنرل سکریٹری، اصلاحی ہیلتھ کیئر فاؤنڈیشن) نے ادا کیے۔

افتتاحی اجلاس کے بعد دو تکنیکی اجلاس منعقد کیے گئے، پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر ادریس احمد، پروفیسر احمد محفوظ، پروفیسر ندیم احمد اور جناب عارف زیدی (سابق ڈین، جامعہ ہمدرد، دہلی) نے کی۔ اس میں ڈاکٹر خورشید احمد شفقت اعظمی (دہلی)، ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، پروفیسر عبداللہ عزیز (لکھنؤ)، پروفیسر حکیم اشہر قدیر (علی گڑھ)، حکیم امان اللہ (دہلی)، ڈاکٹر فیض الرحمٰن اقدس (دہلی) اور ڈاکٹر عبدالحلیم (لکھنؤ) نے اپنے مقالات پیش کیے۔ اجلاس کی نظامت ڈاکٹر محمد فیصل نے کی۔

دوسرے تکنیکی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر خورشید احمد شفقت اعظمی، پروفیسر شاہ عالم اور پروفیسر علاء الدین خاں نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر خان محمد قیصر (ممبئی)، ڈاکٹر عمیر منظر (لکھنؤ)، ڈاکٹر اسعد فیصل فاروقی (علی گڑھ)، ڈاکٹر محمد مقیم (دہلی) اور ڈاکٹر شاہنواز فیاض (دہلی) نے اپنے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر ثاقب عمران نے کی۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 25 اگست 2026

ریسرچ اسکالرز غالب سمینار

نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے زیراہتمام سہ روزہ بین الاقوامی ریسرچ اسکالرز سمینار 4 تا 6 ستمبر 2026 کا ایوان غالب، نئی دہلی میں افتتاحی اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں پروفیسر سید عین الحسن (وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی (سکریٹری، غالب انسٹی ٹیوٹ)، ڈاکٹر رخشندہ جلیل (معروف مصنفہ، مترجمہ وادبی مؤرخ)، ڈاکٹر شمس اقبال (ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی)، ڈاکٹر شمس بدایونی (معروف اردو محقق)، جناب آلوک اوریل (معروف شاعر) نے

شرکت کی جبکہ اس اجلاس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر ادریس احمد (ڈائرکٹر، غالب انسٹی ٹیوٹ) نے انجام دیے۔

صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر عین الحسن نے کہا کہ موجودہ عہد میں تحقیق کے نئے تقاضے ہیں جنھیں پورا کرنا ضروری ہے۔ تحقیق میں عجلت سے گریز کرنا چاہیے۔ انھوں نے فارسی ادبیات کے انگریزی ادبیات پر اثرات کی بھی نشاندہی کی ۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہمیں اردو زبان کو تمام تفریقات سے بچانا ہے یہی اس زبان کی بڑی خدمت ہوگی۔

قبل ازاں جلسے کا افتتاح ڈاکٹر شمس اقبال کے استقبالیہ کلمات سے ہوا۔ مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے انھوں نے اس سہ روزہ ریسرچ اسکالرز سمینار کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی اور اسے طلبہ کے لیے بے حد اہم قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ دور میں معیاری تحقیق کے لیے ریسرچ اسکالر کا اردو کے ساتھ دیگر زبانوں سے واقف ہونا بھی ضروری ہے، اس کے بغیر ایک اچھی تحقیق نہیں کی جاسکتی۔ انھوں نے ریسرچ اسکالرز سے اپیل کی کہ وہ تحقیق کے ضروری اصول وضوابط پر عمل کرنے کے ساتھ اردو اور دوسری مختلف قومی و عالمی زبانوں کے ادب کا مطالعہ کرنے کی کوشش کریں تاکہ ان کا علمی وفکری افق وسیع ہو اور تحقیق میں عمدگی آئے۔

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اس موقعے پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے اہل علم وادب کو زبان وادب کی مختلف جہات کی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اس اہم پروگرام میں شریک ہونے والے تمام اسکالرز کو مبارکباد پیش کی اور اسے ان کی کامیابی کا اہم وسیلہ قرار دیا۔

افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے محترمہ رخشندہ جلیل نے کہا کہ میں تحقیق میں عجلت کے خلاف ہوں۔ انھوں نے کہا کہ آج طلبہ کے ساتھ اساتذہ میں بھی اکیڈمک لیزینس محسوس کی جارہی ہے۔ تحقیق میں جستجو اور گہرائی کو ضروری بتاتے ہوئے انھوں نے دیگر زبانوں کے لٹریچر کو پڑھنے کی بھی ترغیب دی۔

مہمان خصوصی جناب آلوک اوریل نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تحقیق کا وسیع الجہات ہونا ضروری ہے، اس کے بغیر اس کی معنویت قائم نہیں ہوتی۔ انھوں نے غالب کی شاعری کے حوالے سے کئی اہم نکات کی جانب اشارہ کیا۔

کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر شمس بدایونی نے کہا کہ ہندوستان میں ادبی اور جامعاتی تحقیق کی قدیم روایت ہے۔ انھوں نے ادبی تحقیق وتدوین کے اصول وضوابط اور تاریخ کے حوالے سے اہم اور مفید گفتگو کی ۔ سندی اور غیر سندی تحقیق کے مابین فرق کو بھی واضح کیا اور کہا کہ معیاری تحقیق کے لیے مطالعے کا تسلسل ضروری ہے۔

آخر میں ڈاکٹر ادریس احمد نے کلمات تشکر پیش کرتے ہوئے اس سہ روزہ ریسرچ اسکالرز سمینار کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالی اور اسے غالب انسٹی ٹیوٹ کا ایک اہم پروگرام قرار دیا۔ اس اجلاس میں طلبہ، ریسرچ اسکالرز، اور دانشوران کی بڑی تعداد موجود رہی۔

واضح رہے کہ اس سہ روزہ ریسرچ اسکالرز غالب سمینار میں اگلے دودنوں کے دوران آٹھ تکنیکی اجلاس بھی منعقد کیے جائیں گے۔

سمینار کے دوسرے روز چار اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت شعبۂ اردو جواہر لال نہرو یونیورسٹی کی استاد ڈاکٹر سفینہ نے کی۔ اس اجلاس میں محترمہ افزا نقوی، جناب سہیل رضا، جناب ساجد انصاری، جناب آصف جمال نے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر صائمہ ثمرین نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد ڈاکٹر جاوید حسن نے کی۔ اس اجلاس میں جناب تنویر خان، محترمہ رفعت گلزار، محترمہ صائمہ انصاری، محترمہ ہما سیفی، جناب محمد مہتاب عالم نے نے مقالے پیش کیے۔ نظامت ڈاکٹر امیر حمزہ نے کی۔ تیسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر مشتاق عالم قادری نے کی۔ اس اجلاس میں محترمہ افشانہ غمگین بشیر، جناب یاور احمد شیخ، محترمہ کنیز فاطمہ، جناب مصطفیٰ علاء الدین محمد علی نے مقالے پیش کیے۔ نظامت ڈاکٹر نورین علی حق نے کی۔ چوتھے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر خان محمد آصف نے کی۔ اس اجلاس میں جناب محمد یوسف، جناب محمد نوشاد احمد، محترمہ نکہت پروین، محترمہ منیر محمدی نے مقالہ پیش کیا۔ نظامت ڈاکٹر فیضان الحق نے کی۔

سمینار کے آخری دن سمینار کے چار اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر علی احمد ادریسی نے کی۔ اس اجلاس میں جناب سید مظہر علی عباس، جناب شرف الدین، جناب سجاد الرحمٰن، جناب نور عالم، جناب محمد علی باشا نے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر شاداب شمیم نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر احمد امتیاز نے کی۔ اس اجلاس میں محترمہ آل زہرہ زیدی، محترمہ مریم بی، جناب محمد شاداب انصاری، جناب علی حسین، محترمہ عظمیٰ نے مقالے پیش کیے۔ نظامت ڈاکٹر جاوید رحمانی نے کی۔ تیسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر خالد مبشر نے کی۔ اس اجلاس میں جناب امتیاز احمد، جناب محمد فدیان، جناب محمد ریحان خان، جناب ساجد رضا، جناب عبید الرحمٰن نے مقالے پیش کیے۔ نظامت جناب غلام سرور نے کی۔ سمینار کے آخری اجلاس کی صدارت ڈاکٹر مہتاب جہاں نے کی۔ اس اجلاس میں جناب علی اشرف، محترمہ شگفتہ خانم، محترمہ فرحین خانم، جناب خلیق الرحمٰن اعوان، محمد وسیم نے مقالات پیش کیے۔ اجلاس کی نظامت ڈاکٹر ضوفشاں نے کی۔ سمینار کے آخر میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 4 ستمبر و پریس ریلیز، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی 7 ستمبر 2026

نوجوان سائنٹسٹ کانکلیو

پٹنہ/نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، کائنات فاؤنڈیشن، جہان آباد، شری کرشنا سائنس سینٹر، وزارتِ ثقافت، حکومتِ ہند اور بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ، حکومتِ بہار کے باہمی اشتراک سے منعقد ہونے والے 'نوجوان سائنٹسٹ کانکلیو' کا انعقاد آج شری کرشن سائنس سینٹر، پٹنہ کے آڈیٹوریم میں ہوا۔ کانکلیو میں بہار کے 24 اضلاع سے تقریباً 250 طلبہ و طالبات نے شرکت کی، جن میں 74 مدارس کے طلبہ بھی تھے۔ اس موقعے پر طلبہ میں سائنس کے تئیں غیر معمولی جوش وخروش دیکھنے میں آیا۔

افتتاحی اجلاس کی صدارت شری کرشن سائنس سینٹر، پٹنہ کے سینئر ہیڈ انجینئر سرینواپی کنڈا نے کی، جب کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال بطور مہمانِ خصوصی شریک رہے۔ افتتاحی تقریب میں بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے چیئرمین جناب سلیم پرویز، بہار اسٹیٹ سنی وقف بورڈ کے چیئرمین جناب محمد ارشاداللہ، روبن گروپ آف ہاسپٹلس کے بانی و مینیجنگ ڈائرکٹر ڈاکٹر ستیہ جیت کمار سنگھ، پرائیویٹ اسکول اینڈ چلڈرن ویلفیئر ایسوسی ایشن کے قومی صدر جناب سید شمائل احمد، بہار اسٹیٹ شیعہ وقف بورڈ کے چیئرمین جناب ارشاد علی اور زینب انٹرنیشنل گرلس پبلک اسکول، کٹیہار کے فاؤنڈر چیئرمین ڈاکٹر شکیل احمد خان سمیت متعدد معزز شخصیات، اساتذہ اور طلبہ وطالبات موجود تھے۔

صدارتی تقریر میں انجینئر سرینواپی کنڈا نے کہا کہ نوجوان سائنٹسٹ کانکلیو کے افتتاحی پروگرام میں بچوں کی بڑی تعداد اور سائنس کے تئیں ان کی دلچسپی دیکھ کر انھیں بے حد خوشی ہورہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ نوجوان نسل کسی بھی ملک کا مستقبل ہوتی ہے اور اگر اس کے اندر سوال کرنے، تجربہ کرنے اور نئی چیزیں دریافت کرنے کا جذبہ پیدا کردیا جائے تو وہ ملک کی سائنسی ترقی میں اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ سائنس کو صرف کتابوں تک محدود رکھنے کے بجائے اسے تجربات اور عملی سرگرمیوں سے جوڑنا ضروری ہے۔

افتتاحی تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے کہا کہ سائنسی مزاج کے بغیر نہ تو اچھی تحقیق وجود میں آسکتی ہے اور نہ ہی تنقید وتخلیق کا حق ادا کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ نئی نسل میں سائنٹفک ٹیمپرامنٹ پیدا کرنا محض ایک تدریسی ضرورت نہیں بلکہ اکیسویں صدی کا اہم تعلیمی تقاضا ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی سائنسی مزاج، تخلیقی وتنقیدی فکر اور اختراع کے فروغ پر خصوصی زور دیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ نوجوان کسی بھی معاشرے کا سب سے قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں، اس لیے ان کے اندر سوال کرنے، تجربہ کرنے، تحقیق کرنے اور مسائل کے سائنسی حل تلاش کرنے کا جذبہ پیدا کرنا ضروری ہے۔

انھوں نے اردو زبان کے حوالے سے کہا کہ اردو محض شاعری، تنقید اور تحقیق کی زبان نہیں ہے بلکہ اس میں سائنس اور جدید علوم کے فروغ کے بے شمار امکانات موجود ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کو جدید سائنسی علوم کے اظہار اور ترسیل کا موثر وسیلہ بنایا جائے اور نوجوان نسل کو اپنی زبان کے ذریعے سائنس اور ٹیکنالوجی سے جوڑا جائے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کانکلیو اسی سمت میں ایک منفرد کوشش ہے،

جہاں سائنس، نوجوان اور اردو ایک مشترکہ فکری پلیٹ فارم پر جمع ہو رہے ہیں۔

اس سے قبل کائنات فاؤنڈیشن کے فاؤنڈر سکریٹری جناب شکیل احمد کاکوی نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے تمام مہمانوں، اساتذہ، طلبہ و طالبات اور شرکائے کانکلیو کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے کانکلیو کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس پروگرام کا بنیادی مقصد نوجوانوں میں سائنسی ذوق و شوق پیدا کرنا، ان کی اختراعی صلاحیتوں کو سامنے لانا اور اردو کے ذریعے سائنسی علوم کے فروغ کی راہیں تلاش کرنا ہے۔

جناب سلیم پرویز، چیئرمین، بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ نے کہا کہ موجودہ دور میں اس نوع کے پروگرام وقت کی اہم ضرورت ہیں۔ ایسے پروگرام بچوں کے ذہن و دماغ پر مثبت اثرات مرتب کرتے ہیں اور ان میں نئی چیزیں سیکھنے، غور و فکر کرنے اور آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کرتے ہیں۔

جناب محمد ارشاداللہ، چیئرمین، بہار اسٹیٹ سنی وقف بورڈ نے کہا کہ یہ دور سائنس، ایجادات اور اختراعات کا دور ہے۔ ایسے میں نوجوان نسل کو سائنسی سرگرمیوں سے جوڑنا اور ان کے اندر سائنس کا ذوق پیدا کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس طرح کے پروگرام بچوں کو سائنسی دنیا سے متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کریں گے۔

اس موقعے پر ڈاکٹر ستیہ جیت کمار سنگھ، جناب سید شمائل احمد، جناب ارشاد علی اور جناب شکیل احمد خان نے بھی سائنس، تعلیم اور نوجوانوں کے باہمی تعلق کے حوالے سے اظہار خیال کیا اور نوجوان سائنٹسٹ کانکلیو کے انعقاد کو ایک اہم اور قابلِ تحسین کوشش قرار دیا۔

افتتاحی اجلاس کے بعد کانکلیو کے مختلف سیشنز کا انعقاد ہوا۔ پہلے سیشن 'سائنس دانوں سے ملاقات: سائنسی گفتگو اور نوجوان ذہنوں سے مکالمہ' میں طلبہ و طالبات کو ماہرینِ سائنس سے براہِ راست گفتگو اور سوال و جواب کا موقع ملا۔ اس سیشن میں پروفیسر (ڈاکٹر) ڈولی سنہا، ڈاکٹر کماری نمیشا اور انجینئر سرینواپی کنڈا نے سائنسی موضوعات پر گفتگو کی، جب کہ ڈاکٹر اظفر احمد نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

دوسرے سیشن 'عملی سائنس: سائنس کے عملی مظاہرے' میں مختلف سائنسی اصولوں کو تجربات اور عملی مظاہروں کے ذریعے طلبہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس سیشن میں محمد آفتاب حسین نے سائنسی مظاہرے پیش کیے، جب کہ جناب ستیش رنجن نے نظامت کی۔ سیشن کی صدارت ڈاکٹر پروفیسر ارون کمار نے کی۔

تیسرا سیشن 'اردو بازگشت: بیت بازی و طلبہ کا تمثیلی مشاعرہ' پر مشتمل تھا، جس میں مختلف اسکولوں کے طلبہ نے شرکت کی اس سیشن میں سائنس، زبان اور تخلیقی اظہار کے دوران ایک خوبصورت ربط قائم کیا۔

کانکلیو کا آخری سیشن' اختتامی تقریب و تقسیم انعامات' پر مشتمل تھا جس میں مختلف سرگرمیوں میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے طلبہ و طالبات کی حوصلہ افزائی کی گئی اور انھیں انعامات سے نوازا گیا۔ اس سیشن کی صدارت جناب شفیع مشہدی، سابق چیئرمین، اردو ایڈوائزری کمیٹی، حکومتِ بہار نے کی اور پروفیسر اعجاز علی ارشد، وائس چانسلر مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی، پٹنہ اور پروفیسر ڈاکٹر شکیل احمد قاسمی، چیئرمین، فرحان فاؤنڈیشن، انڈیا بطور مہمان خصوصی موجود تھے۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی، 8 ستمبر 2026

اردو ترجمہ نگاری: تخلیقیت، روایت اور افادیت

پٹنہ/نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارتِ تعلیم، حکومتِ ہند بہ اشتراک شعبۂ اردو، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا 'اردو میں ترجمہ نگاری: تخلیقیت، روایت اور افادیت' کے موضوع پر ایک روزہ قومی سمینار کا انعقاد ڈاکٹر رادھا کرشنن ہال، شعبۂ تعلیم، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا میں کیا گیا۔

سمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے مگدھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر دلیپ کمار کیسری نے کہا کہ اردو بے حد خوب صورت، دلکش اور شیریں زبان ہے۔ اردو کی تاریخ اور اس کے ارتقائی سفر پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہندی کی بہت سی مذہبی اور اہم کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہوا ہے، جس

سے دونوں زبانوں اور تہذیبوں کے درمیان قربت پیدا ہوئی۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ اردو کو زیادہ سے زیادہ بول چال اور علمی و ادبی سطح پر فروغ دیا جانا چاہیے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے افتتاحی خطاب میں کہا کہ مگدھ یونیورسٹی وہ سرزمین ہے جس نے علم کی روشنی دور تک پہنچائی ہے۔ یہ معرفت کی سرزمین ہے اور گوتم بدھ کی سرزمین ہے، اس لیے اس علمی و تہذیبی ماحول میں ترجمے جیسے اہم موضوع پر گفتگو کی خاص معنویت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو میں ترجمے کی روایت بے حد قدیم اور مضبوط ہے۔ فورٹ ولیم کالج، عثمانیہ یونیورسٹی، دہلی کالج اور سائنٹفک سوسائٹی نے ترجمے کے میدان میں غیر معمولی خدمات انجام دیں، جن کے نتیجے میں اردو کے علمی و ادبی سرمایے میں خاصا اضافہ ہوا۔

ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ آزادی کے بعد بھی اردو ترجمے کے میدان میں بہت کام ہوئے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سمیت متعدد سرکاری ادارے مختلف اصناف اور موضوعات کی اہم کتابوں کے تراجم شائع کر رہے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ترجمہ ایک زبان کے علوم و افکار کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا نام ہے اور اس کے ذریعے ایک خطے کی تہذیب، ثقافت، فکر اور علمی سرمایہ دوسرے خطے تک پہنچتا ہے۔ انڈین نالج سسٹم کے حوالے سے اپنشد، رامائن اور دیگر اہم متون کے تراجم کا ذکر کرتے ہوئے اس پر زور دیا کہ ترجمہ تہذیبوں کے درمیان فاصلے کم کرتا ہے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔

انھوں نے یہ بھی کہا کہ مترجم کی حیثیت کسی بھی طرح تخلیق کار سے کم نہیں ہے، اس لیے اسے بھی وہی علمی و ادبی احترام ملنا چاہیے جو ایک تخلیق کار کو حاصل ہوتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ایک اچھا مترجم دو زبانوں ہی نہیں بلکہ دو تہذیبوں، دو ذہنی دنیاؤں اور دو فکری روایتوں کے درمیان پل تعمیر کرتا ہے۔

کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر امتیاز احمد، سابق ڈائرکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ نے ترجمہ نگاری کے اصول و مبادی اور ایک اچھے مترجم و اچھے ترجمے کی خصوصیات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ترجمے کا عمل بے حد چیلنج بھرا ہے اور مترجم ایک تخلیق کو سامنے رکھ کر نئی تخلیق کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ترجمہ دنیا میں حائل فاصلوں کو ختم کرتا اور مختلف قوموں کی تہذیب و ثقافت کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ مترجم کو دونوں زبانوں کے ساتھ ساتھ متعلقہ موضوع اور تہذیبی پس منظر سے بھی گہری واقفیت ہونی چاہیے۔

مہمان خصوصی پروفیسر ابوبکر رضوی، رجسٹرار پاٹلی پترا یونیورسٹی، پٹنہ نے کہا کہ ترجمہ ہمیں دوسری زبانوں اور مختلف قوموں سے ملواتا ہے، اجنبیت کا پردہ چاک کرتا اور انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ترجمے کا سب سے

بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے اپنی زبان میں نئے علوم وافکار شامل ہوتے ہیں اور ہمارا ادبی وعلمی سرمایہ وسیع ہوتا ہے۔ انھوں نے مصنوعی ذہانت کے درست اور ذمے دارانہ استعمال پر زور دیتے ہوئے کہا کہ جدید ٹیکنالوجی مترجم کے لیے معاون ضرور بن سکتی ہے، لیکن اس پر مکمل انحصار انسانی فہم، تخلیقی صلاحیت اور زبان کی باریکیوں کو متاثر کرسکتا ہے۔

ڈاکٹر بی۔ کے۔ منگلم، رجسٹرار مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا نے اردو زبان کی شیرینی، دلکشی اور چاشنی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو میٹھی زبان ہے اور اسے بولنے میں خاص لطف محسوس ہوتا ہے۔ انھوں نے ترجمے کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ ایک اچھا ترجمہ وہ ہے جو قاری کی روح میں اتر جائے اور پڑھتے ہوئے ترجمہ محسوس نہ ہو بلکہ اصل تخلیق کا تاثر دے۔

اس سے قبل شعبۂ اردو، مگدھ یونیورسٹی کے صدر ڈاکٹر عبدالحی نے استقبالیہ خطاب میں تمام مہمانوں اور شرکا کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے اردو ترجمے کی قدیم روایت اور موجودہ دور میں اس کی ضرورت وافادیت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ترجمہ اردو کے علمی اور ادبی دائرے کو وسیع کرنے کا مؤثر ذریعہ ہے اور ایسے سمینار اس موضوع پر سنجیدہ علمی مباحث کو فروغ دیتے ہیں۔

افتتاحی اجلاس میں ڈاکٹر شکیلہ نگار نے کلمات تشکر پیش کیے، جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ضیاء اللہ انور اور ڈاکٹر ترنم جہاں نے انجام دیے۔

اس کے بعد پہلا تکنیکی اجلاس ہوا، جس کی صدارت جناب معصوم عزیز کاظمی، ریٹائرڈ آئی جی نے کی۔ اجلاس میں پروفیسر مشرف علی، شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی؛ ڈاکٹر ارشاد نیازی، شعب؟ اردو، یونیورسٹی آف دہلی؛ ڈاکٹر احمد صغیر، معروف فکشن نگار، گیا؛ اور ڈاکٹر محمد ذاکر حسین، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ نے اپنے مقالات پیش کیے۔ مقررین نے اردو ترجمہ نگاری کے مختلف پہلوؤں، اس کی روایت، تخلیقی امکانات اور عصرِ حاضر میں اس کی افادیت پر اظہار خیال کیا۔

اس اجلاس کے مہمان خصوصی پروفیسر ایوب (پرنسپل، جگ جیون کالج، گیا) نے اردو ترجمے کی اہمیت وخصوصیت پر گفتگو کی اور موجودہ دور میں ترجمے افادیت پر روشنی ڈالی۔

صدارتی خطاب میں معصوم عزیز کاظمی نے کہا کہ ترجمہ محض الفاظ کی منتقلی نہیں بلکہ ایک زبان کے فکری اور تہذیبی مزاج کو دوسری زبان تک پہنچانے کا نام ہے۔ انھوں نے کہا کہ کامیاب مترجم کے لیے دونوں زبانوں پر عبور کے ساتھ موضوع کی گہری سمجھ اور تخلیقی بصیرت بھی ضروری ہے۔ ڈاکٹر ترنم جہاں نے کلمات تشکر ادا کیے، جب کہ ڈاکٹر سمی اقبال نے اجلاس کی نظامت کی۔

بعد ازاں دوسرا تکنیکی اجلاس منعقد ہوا، جس میں شعبۂ اردو، مگدھ یونیورسٹی کے 5 ریسرچ اسکالرز نصرت رسول، نازش ہاشمی، نفیسہ خاتون، عصمت درخشاں، محمد نوشاد احمد نے مقالات پیش کیے۔ ریسرچ اسکالرز نے اردو ترجمہ نگاری کے مختلف گوشوں، اس کی تخلیقی جہات، روایت اور عصری امکانات کے حوالے سے تحقیقی نتائج پیش کیے۔

اس سمینار میں اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور شائقین زبان وادب کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی، 10 ستمبر 2026

زبان، ادب اور تعلیم سے متعلق خبریں

ماہنامہ اردو دنیا میں 'خبر نامہ' کے تحت علمی، ادبی، ثقافتی اور تعلیمی سرگرمیوں سے متعلق خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ ان خبروں سے ہماری ادبی و ثقافتی سرگرمیوں، تنوع اور زبان و ادب کی سمت و رفتار کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ خبر نامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ کوشش کے باوجود بہت سی اہم خبریں ہم تک موصول ہونے سے رہ جاتی ہیں۔ اس لیے منتظمین سے گزارش ہے کہ وہ اہم علمی، ادبی و ثقافتی تقریبات اور وفیات سے متعلق خبریں درج ذیل ای۔میل editor@ncpul.in | urdudunyancpul@yahoo.co.in پر ارسال کرنے کی زحمت کریں۔ (ادارہ)

دھلی

فراق گورکھ پوری: شخصیت اور ادبی میراث

نئی دھلی: فراق نے اردو شاعری کو نیا عاشق دیا ہے۔ فراق کی غزل کے عاشق و معشوق کی بڑی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ ان میں وقار پایا جاتا ہے جو ہماری چار سو سال کی روایت میں نئی چیز ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر خالد علوی نے غالب انسٹی ٹیوٹ کے منعقد کردہ سمینار 'فراق گورکھ پوری: شخصیت اور ادبی میراث' کا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مزید کہا: فراق نے ہندی اور سنسکرت کا وہ سرمایہ جو بکھرا پڑا تھا اس کو سمیٹ کر اپنی رباعیوں میں پیش کیا اور اس کوشش کو 'رنگوں' کا نام دیا۔ سمینار کا افتتاح انگریزی کے ممتاز اسکالر پروفیسر ہریش ترویدی نے کیا۔ انھوں نے کہا غزل کے فنی تقاضوں پر فراق کی گرفت اتنی گہری تھی کہ میر اور غالب کے رنگِ سخن کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے انھوں نے غزل کو ایک نئی بلند آہنگی بخشی۔ فراق کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کلاسیکی سرمائے کو ضائع کیے بغیر جدید انسانی نفسیات اور دکھی روح کی ترجمانی کی، جس نے اردو شاعری کو ایک ایسی آفاقی جہت بخشی جو ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اجلاس کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ انھوں نے کہا فراق کی شاعری نے اردو غزل کو نیا آہنگ دیا۔ وہ اس دور میں شاعری کر رہے تھے جب اقبال کا طوطی بول رہا تھا اور اس زمانے کے شاعر کا اقبال کے اثر سے نکلنا بہت دشوار تھا لیکن اس کوشش میں سب سے زیادہ کامیابی کے فراق کے ہاتھ آئی۔

مجھے خوشی ہے کہ ہم نے ایسے لوگوں کو جمع کرلیا ہے جو شاعری اور ادب پر بہت گہری نظر رکھتے ہیں جن سے بجا طور پر یہ امید وابستہ ہے کہ وہ فراق کو نئے تناظر میں پیش کریں گے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا: فراق نے اردو غزل کے کینوس کو وسعت دی اور اس میں ہندی گیتوں کی لے، رتوں، تہواروں اور پوربی تہذیب کے استعاروں کو اس فنکارانہ مہارت سے سمویا کہ زبان کی تاثیر دوچند ہوگئی۔ ان کے یہاں ہجر و وصال کے روایتی موضوعات ایک نئے نفسیاتی اور فکری شعور کے ساتھ ابھرتے ہیں۔

آخری دن یعنی 29 اگست کو سمینار کے چار تکنیکی اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر پروفیسر شہپر رسول نے کی۔ صدارتی تقریر میں انھوں نے کہا فراق گورکھپوری نے اردو کی شعری روایت میں نئے پہلو پیدا کیے۔ شاعری میں استعارہ سازی کا عمل شاعر کا امتحانی مرحلہ ہوتا ہے اور فراق کی شاعری میں یہی پہلو سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کو نئے استعاروں سے روشناس کیا۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر جانکی پرساد شرما، پروفیسر خالد اشرف، پروفیسر ندیم احمد، ڈاکٹر عادل حیات، ڈاکٹر محمد آدم، ڈاکٹر سفینہ، اور ڈاکٹر عالیہ نے مقالے پیش کیے۔ نظامت ڈاکٹر ثاقب فریدی نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدات سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر خالد محمود نے کی۔ صدارتی تقریر کے دوران انھوں نے کہا کہ فراق کو اردو شاعری سے یہ شکوہ تھا کہ اردو میں عربی فارسی تہذیب کے عناصر تو خوب ہیں لیکن ہندوستانی عناصر کی کمی ہے۔ اس کمی کو انھوں نے ہندستانی عناصر کی شمولیت سے پورا کیا۔ انھوں نے نہایت تخلیقی انداز میں ہندستانی عناصر کو شاعری میں برتا ہے۔ اس اجلاس میں پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی اور ڈاکٹر عادل حیات نے مقالہ پیش کیا۔ نظامت ڈاکٹر نوشاد منظر نے کی۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر چندر سری واستو نے کی۔ انھوں نے کہا شاعری کا امتیاز یہ نہیں ہے کہ اس پر کتنا زمانہ بیت گیا بلکہ شاعری کا امتیاز یہ ہے کہ گزرتے ہوئے زمانے کا ساتھ وہ کس طرح دیتا ہے۔ ہمیں آج بھی کبیر کی یاد کیوں آتی ہے۔ شاعر کا اپنے کلچر سے جڑنا کوئی بری بات نہیں ہے بلکہ یہ تو شاعری کی خوبی ہے کہ اس میں اصل کلچر کی نمود ہو۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر عبدالعزیز، ڈاکٹر نور فاطمہ، ڈاکٹر سرفراز جاوید اور محترمہ سیمیں فلک نے مقالے پیش کیے۔ نظامت ڈاکٹر جاوید حسن نے کی۔ چوتھے اور آخر اجلاس کی صدارت پروفیسر عبدل بسم اللہ نے کی۔ صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا' فراق نے

اردو اور ہندی شاعری کو متاثر کیا ہے۔ انھوں نے امراؤ جان ادا' کا ہندی ترجمہ کیا اور ان کی شاعری ہندی حلقوں میں بھی خوب مقبول ہوئی۔ اس طرح وہ پوری ہندستانی تہذیب کی علامت بن گئے۔ اس اجلاس میں پروفیسر ارشاد نیازی، ڈاکٹر معید رشیدی، ڈاکٹر سلمان فیصل اور جناب امام الدین نے مقالے پیش کیے۔ نظامت جناب فیصل خان نے کی۔ سمینار کے اختتام پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر مظفر رضا، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، 31 اگست 2026

دیکشا آغاز 2026-27

نئی دھلی: ''روحانی زندگی کی بنیاد ایمان پر ہے اور ایمان انسان کی باطنی زندگی کو صحیح سمت عطا کرتا ہے، جب کہ عملی زندگی میں اس کی تکمیل نیک اعمال، حسن کردار اور دوسروں کے لیے نفع بخش رویے سے ہوتی ہے۔ علم بھی اسی وقت حقیقی معنویت اختیار کرتا ہے جب وہ انسان کے کردار اور عمل میں نمایاں ہو۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر مظہر آصف، وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے فیکلٹی برائے انسانی علوم والسنہ کے نئے طلبہ وطالبات کے لیے منعقد اورینٹیشن پروگرام بعنوان 'دیکشا آغاز 27-2026' میں صدارتی خطاب کے دوران کیا۔ پروفیسر موصوف نے اسلامک اسٹڈیز، عربی اور اردو جیسے علوم کی معنوی وتہذیبی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ یہ علوم انسانی فکر کی بالیدگی، تہذیبی شعور کی تشکیل اور انسانی بصیرت کی نشوونما میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں، اس لیے ان سے وابستہ طلبہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے علمی سفر کو محض حصول علم تک محدود نہ رکھیں، بلکہ وہ اسے وسیع تر انسانی مقاصد اور معاشرتی ذمہ داریوں سے مربوط کریں۔ مزید انھوں نے یہ بھی کہا کہ انسان عروج کی ہر منزل طے کرسکتا ہے، سوائے پیغمبری کے۔

رجسٹرار پروفیسر محمد مہتاب عالم رضوی نے نئے طلبہ وطالبات کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تحقیق اپنے موضوع کے گہرے اور تنقیدی مطالعے، نئے سوالات کی تشکیل، دستیاب شواہد کے تجزیے اور حقائق کی روشنی میں نئے نتائج تک رسائی کا نام ہے۔ اس تناظر میں اعلیٰ تعلیم کا مقصد طلبہ کو صرف موجودہ معلومات کا حامل بنانا نہیں، بلکہ ان میں غور وفکر، تنقیدی بصیرت، سوال اٹھانے اور علم کی نئی جہتیں دریافت کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا بھی ہے۔ پروفیسر اقتدار محمد خان، صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز اور ڈین فیکلٹی برائے انسانی علوم والسنہ نے خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے جامعہ کی قیادت، فیکلٹی کے ذمہ داران، اساتذہ اور دیگر مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور نئے طلبہ و طالبات کو اپنے علمی سفر کے آغاز پر مبارک باد پیش کی۔

انھوں نے اس موقع کو محض رسمی استقبال تک محدود نہ رکھتے ہوئے نئے طلبہ کو جامعہ کے علمی ماحول، تعلیمی نظام، انتظامی امور اور دستیاب سہولیات سے آشنا کرنے کی ایک بامقصد کاوش قرار دیا، تاکہ وہ نئے ادارہ جاتی ماحول سے مانوس ہوکر اپنے تعلیمی سفر کو بہتر فہم اور واضح سمت کے ساتھ آگے بڑھا سکیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 19 اگست 2026

تحریک آزادی اور اردو مدرسین

نئی دھلی: اکادمی برائے فروغ استعدادِ اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے زیر اہتمام یوم آزادی کی مناسبت سے مورخہ 14 اگست 2026 کو ساڑھے تین بجے گوگل میٹ پر ایک خصوصی آن لائن خطبہ کا اہتمام کیا گیا۔ آن لائن خطبے کا موضوع 'تحریک آزادی میں اردو زبان اور تدریس پیشہ مجاہدین کا کردار' تھا۔ اردو کے ممتاز محقق و ناقد ڈاکٹر صفدر امام قادری، شعبہ اردو، کالج آف کامرس، آرٹس اینڈ سائنس، پاٹلی پترا یونیورسٹی، پٹنہ نے یہ اہم خطبہ ارشاد فرمایا۔ آن لائن خصوصی خطبے کے اجلاس کی صدارت پروفیسر جسیم احمد، اعزازی ڈائرکٹر، اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کی۔ اکادمی نے مختلف مواقع پر خصوصی خطبات کا سلسلہ منعقد کرنے میں ہر طرح کا تعاون فراہم کرنے پر پروفیسر مظہر آصف، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جامعہ کے قابل احترام مسجل، پروفیسر محمد مہتاب عالم رضوی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ آن لائن خصوصی خطبہ کے کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر نوشاد عالم نے حاضرین اور مہمان خطیب کا خیر مقدم کیا۔ آزادی کی مناسبت سے منعقدہ خطبے کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے اکادمی کے قیام کی تاریخ کے ساتھ ساتھ اس کے دائرہ کار سے بھی سامعین کو روشناس کرایا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 19 اگست 2026

یوم آزادی 2026: آزادی، ذمے داری اور مشترکہ قومیت

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ سماجیات کی جانب سے آج FTK-CIT کانفرنس ہال میں 'یوم آزادی 2026: آزادی، ذمہ داری اور مشترکہ قومیت' کے موضوع پر ایک روزہ سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سمینار میں ممتاز ماہرین تعلیم، دانشوروں، اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور طلبہ نے شرکت کی اور معاصر ہندوستان میں آزادی، ذمہ داری، سماجی تنوع اور مشترکہ قومیت کے تصور پر علمی تبادلۂ خیال کیا۔ سمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے رجسٹرار، پروفیسر محمد مہتاب عالم رضوی نے کی۔ حکومت ہند کے قومی کمیشن برائے اقلیتی امور کی نائب صدر، محترمہ ایس۔ منوری بیگم نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کلیدی خطبہ پیش کیا، جب کہ فیکلٹی آف سوشل سائنسز، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈین، پروفیسر زبیر مینائی نے خصوصی کلمات پیش کیے۔ اس موقعے پر شعبۂ سماجیات کی صدر اور سمینار کی کنوینر، پروفیسر عذرا عابدی نے کہا کہ آزادی محض ایک تاریخی کامیابی نہیں بلکہ ایک مسلسل سماجی ذمہ داری بھی ہے۔ انھوں نے آئینی اقدار، سماجی انصاف، اخوت، باہمی احترام، مکالمے اور ذمہ دار شہری شعور کو فروغ دینے میں تعلیم اور جامعات کے اہم کردار پر روشنی ڈالی۔ محترمہ ایس۔ منوری بیگم نے سماجی ترقی اور قومی تعمیر میں تعلیم کے بنیادی اور تبدیلی لانے والے کردار پر خصوصی زور دیا۔ انھوں نے قومیت کے تصور پر روشنی ڈالتے ہوئے وزیر اعظم کے وژن 'وکست بھارت 2047' کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ انھوں نے مجاہدینِ آزادی کی جدو جہد، قربانیوں اور ایثار کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی خدمات اور قربانیاں آج بھی نئی نسل کے لیے مشعل راہ ہیں کلیدی خطبے میں پروفیسر اختر الواسع نے ہندستانی قومیت کے فکری تہذیبی اور سماجی پہلوؤں پر روشنی ڈالی، جب کہ پروفیسر زبیر مینائی نے جمہوری اقدار سماجی ہم آہنگی اور قومیت کے ایک جامع اور شمولیتی تصور کو مضبوط بنانے میں تعلیمی اداروں کی ذمہ داری کو اجاگر کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 19 اگست 2026

زیر تربیت اساتذہ کے لیے آئی سی ٹی اور ابھرتی ہوئی ٹیکنالوجیز

نئی دہلی: شعبۂ تعلیمی مطالعات، فیکلٹی آف ایجوکیشن، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل ٹیکنالوجی (سی آئی ای ٹی) این سی ای آر ٹی کے اشتراک سے 10 سے 12 اگست تک 'اساتذہ، اساتذہ کے تربیت کاروں اور زیر تربیت اساتذہ کے لیے آئی سی ٹی اور ابھرتی ہوئی ٹیکنالوجیز' کے موضوع پر سہ روزہ فیکلٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کا انعقاد کیا۔ جاری ریلیز کے مطابق پروگرام کا مقصد اساتذہ، اساتذہ کے تربیت کاروں اور زیر تربیت اساتذہ کی تکنیکی اور تدریسی صلاحیتوں کو بہتر کرنا اور انھیں اس قابل بنانا تھا کہ وہ تعلیمی ٹیکنالوجی کے تیزی سے تبدیل ہوتے منظر نامے میں بامعنی، تنقیدی اور تخلیقی انداز میں شامل ہوسکیں۔ اس پروگرام میں تقریباً 100 شرکا نے حصہ لیا، جن میں ملازمت سے قبل اور دوران ملازمت اساتذہ، پوسٹ گریجویٹ طلبہ اور تحقیقی اسکالرس شامل تھے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مظہر آصف نے کی۔ این سی ای آر ٹی، نئی دہلی کے جوائنٹ ڈائرکٹر پروفیسر پرکاش چندر اگروال اجلاس کے مہمان خصوصی تھے۔ شعبہ ایجوکیشنل اسٹڈیز کے سربراہ پروفیسر اعجاز مسیح کی رہنمائی میں منعقد پروگرام میں پروفیسر کوشل کشور اور ڈاکٹر سمیر بابو ایم نے بطور کوآرڈینیٹر اپنی خدمات انجام دیں جب کہ ڈاکٹر آفاق ندیم خان اور ڈاکٹر محمد موسیٰ علی نے بطور منتظم سکریٹری اپنے فرائض انجام دیے۔

افتتاحی اجلاس میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ تعلیمی مطالعات کے اساتذہ نے شرکت کی۔ پروفیسر اعجاز مسیح نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ سی آئی ای ٹی، این سی ای آر ٹی کے میڈیا پروڈکشن ڈویژن کے پروفیسر شیریش پال سنگھ نے فیکلٹی ڈولپمنٹ پروگرام (ایف ڈی پی) کا ایک جائزہ پیش کیا۔ افتتاحی اجلاس کے اہم ترین لمحات میں سے ایک مہمانِ خصوصی پروفیسر پرکاش چندر اگروال، جوائنٹ ڈائرکٹر، این سی ای آر ٹی کا خطاب تھا۔ ان کے فکر انگیز کلیدی خطبے میں ٹیکنالوجی کے ارتقا اور تعلیمی عمل پر اس کے بڑھتے ہوئے اثرات کا احاطہ کیا گیا۔

اینالاگ ٹیکنالوجیز سے سیمی کنڈکٹر پر مبنی پیش رفت کی طرف منتقلی کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر اگروال نے وضاحت کی کہ کس طرح تکنیکی ترقی نے تعلیم کے تصور اور اس کی فراہمی کے طریقوں کو بتدریج تبدیل کر دیا ہے۔ انھوں نے تعلیم کے میدان میں ٹیکنالوجی کو 'مساوات پیدا کرنے والے' عنصر کے طور پر پیش کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 13 اگست 2026

اردو زبان وادب کے فروغ میں ٹیلی ویژن کا کردار

نئی دہلی: سوشل کیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام جامعہ نگر کے تسمیہ آڈیٹوریم میں ڈاکٹر محمد شمیم اختر کی کتاب 'اردو زبان و ادب کے فروغ میں ٹیلی ویژن کا کردار' پر مذاکرے کا انعقاد کیا گیا۔ تسمیہ سوسائٹی کے چیئرمین ڈاکٹر سید فاروق نے پروگرام کی صدارت کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں ڈاکٹر سید فارق نے ڈاکٹر محمد شمیم اختر کی کتاب کو معلومات کا ذخیرہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ موجودہ دور میں کتاب لکھنا جگر کا کام ہے وہ بھی اردو زبان میں۔ انھوں نے موجودہ دور میں اردو زبان کے خدوخال کو بھی بیان کیا۔ پروگرام کے مہمان خصوصی ماہنامہ آج کل کے سابق مدیر، خورشید اکرم نے ڈاکٹر محمد شمیم اختر کی کتاب کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب کے ٹائٹل کو اس انداز میں رکھنا چاہیے تاکہ اسکولوں وکالجوں میں اس کو شامل کیا جاسکے۔

مہمان ذی وقار ڈاکٹر سجاد سید نے کہا کہ ڈاکٹر شمیم اختر نے جس محنت ولگن کے ساتھ ٹیلی ویژن میں اردو الفاظ کے استعمال پر کتاب مرتب کی ہے، وہ لائق تحسین ہیں۔ کتاب کے مصنف اور دوردرشن نیوز سے وابستہ ڈاکٹر محمد شمیم اختر نے اس موقع پر اپنے خطاب میں کہا کہ یہ کتاب ان کے لیے صرف ایک تحقیقی موضوع نہیں ہے بلکہ اس کتاب کے پیچھے ان کے بچپن کی یادیں، ان کی تعلیم، صحافت، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ساتھ دو دہائی سے بھی زیادہ مدت کی وابستگی شامل ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ جب انھوں نے اردو اور ٹیلی ویژن کے تعلق پر غور کیا تو انھیں محسوس ہوا کہ ٹیلی ویژن صرف تصویر اور ویڈیو نہیں دکھاتا بلکہ آواز کو گھر گھر پہنچانے والا ذریعہ ہے اور حقیقت ہے کہ آواز کے ساتھ زبان بھی گھر گھر پہنچتی ہے اس پروگرام میں زبان وادب سے تعلق رکھنے والی معزز شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 25 اگست 2026

ریسرچ اسکالرز سمینار

نئی دہلی: جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں ریسرچ فورم کے زیر اہتمام 'یوسف ادریس کی کہانیوں میں سماجی تجزیہ' کے عنوان سے ماہانہ سمینار منعقد ہوا جس میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ عربی کی استاد ڈاکٹر ہیفاء شاکری نے صدر جلسہ کی حیثیت سے شرکت کی، جب کہ ابوسعید نے نظامت کی۔

علمی نشست کے آغاز میں صدر شعبۂ عربی پروفیسر محمد قطب الدین نے صدر جلسہ، اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور تمام حاضرین کا خیر مقدم کیا اور سمینار کی افادیت پر روشنی ڈالی۔ بعد ازاں ڈاکٹر محمد اجمل نے صدر جلسہ کا تفصیلی تعارف پیش کیا اور تمام شرکا کا استقبال کیا۔ اس موقع پر مقرر خصوصی احسن ہلال نے اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا، جس میں انھوں نے معروف عربی ادیب یوسف ادریس کی کہانیوں کا سماجی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ مقالے کے بعد اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز نے موضوع کے مختلف پہلوؤں سے متعلق متعدد علمی سوالات پیش کیے، جن کے احسن ہلال نے اطمینان بخش جوابات دیے۔ اس موقع پر پروفیسر مجیب الرحمٰن نے مقالے کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یوسف ادریس نے اپنی کہانیوں میں مصری معاشرے کے مختلف طبقات اور ان سے وابستہ سماجی مسائل کی نہایت موثر انداز میں عکاسی کی ہے۔

اختتام پر صدر جلسہ ڈاکٹر ہیفاء شاکری نے اپنے صدارتی کلمات میں مقالے کے موضوع، انداز پیشکش اور تحقیقی گہرائی کو سراہا۔ انھوں نے کہا کہ مقرر نے نہایت بصیرت اور وسعتِ مطالعہ کے ساتھ موضوع کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ یوسف ادریس نے اپنی بیشتر کہانیوں میں عامیانہ اور روزمرہ زبان کا استعمال کیا ہے، جو عام انسان کی گفتگو اور معاشرتی زندگی سے قریب تر ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے معاشرے کے مختلف طبقوں اور ان کے مسائل کو اپنی کہانیوں میں موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ آخر میں عربی فورم کی جانب سے محمد قاسم نے صدر جلسہ، اساتذہ اور تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس پر اساتذہ کے ساتھ شعبۂ عربی کے ریسرچ اسکالرز اور طلبہ وطالبات کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 اگست 2026

سنسکرت کرم یوگی مہوتسو

نئی دہلی: سنٹرل سنسکرت یونیورسٹی میں منعقدہ انٹیگریٹی سنسکرت ہفتہ وار اتسو 2026 میں 'سنسکرت کرم یوگی مہوتسو' کے دوران یونیورسٹی کے مختلف شعبہ جات کے کرم یوگیوں نے سنسکرت میں اپنا تعارف دینے کے ساتھ ہی گیت، وندنا اور شلوک کے مقابلوں میں حصہ لے کر جوش وخروش کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ رجسٹرار پروفیسر آر جی مرلی کرشن نے کہا کہ سنسکرت کو صرف کتابوں اور کلاس روم تک محدود نہ رکھ کر روزمرہ کی زندگی اور جائے ملازمت کی زبان بنایا جانا چاہیے۔

انھوں نے مزید کہا کہ سنسکرت کا استعمال مشکل نہیں ہے اور اس کی شروعات روزمرہ کے استعمال میں آنے والے آسان الفاظ اور چھوٹے چھوٹے جملوں سے کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے کرم یوگیوں سے سنسکرت کو صرف ہفتہ وار جشن تک محدود نہ رکھتے ہوئے سال بھر اپنے معمولات زندگی میں اپنانے کی اپیل کی۔ انھوں نے کہا کہ یونیورسٹی کے کرم یوگیوں کا سنسکرت سے لگاؤ طلبا اور معاشرے تک مثبت پیغام پہنچاتا ہے اور سنسکرت کی وسیع تر اشاعت وترویج میں ان کے کردار کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ پروگرام میں طلبا کی فلاح و بہبود کی چیف پروفیسر لینا سکروال، آدرش یوجنا انچارج پروفیسر کلدیپ شرما، پروجیکٹ آفیسر ڈاکٹر وجے داؤیچ، پروگرام آرگنائزر ڈاکٹر امریتا کور نیز شریک آرگنائزر ڈاکٹر یوگیندر دکشت نے فاتح شرکا کو انعامات سے نوازا۔ مقابلوں میں ڈاکٹر پرمود بتولیا اور ڈاکٹر کے منوجنیا نے جج کا کردار ادا کیا۔ نظامت کے فرائض یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالرز نے انجام دیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 23 اگست 2026

کاپی رائٹ، ریسرچ انٹیگریٹی اینڈ پبلشنگ ان دی اے ایرا

نئی دہلی: مصنوعی ذہانت (AI) کو انسانی تخلیقی صلاحیتوں، تحقیق اور فیصلہ سازی کو بڑھانے کے لیے ایک آلے کے طور پر استعمال کیا جانا چاہیے، نہ کہ انسانی فیصلہ سازی کے متبادل کے طور پر۔ یہ بات نئی دہلی میں فیڈریشن آف انڈین چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری (FICCI) کے زیر اہتمام Publicon 2026 میں عالمی اشاعت اور تحقیق کی دنیا کے ماہرین نے کہی۔ 'کاپی رائٹ، ریسرچ انٹیگریٹی اینڈ پبلشنگ ان دی اے ایرا' کے موضوع پر منعقد کی گئی کانفرنس نے پبلشرز، مصنفین، محققین، ماہرین تعلیم، ٹیکنالوجی کے ماہرین اور پالیسی سازوں کو اس بات پر تبادلہ خیال کرنے کے لیے اکٹھا کیا کہ کس طرح اشاعتی دنیا AI کو موثر طریقے سے استعمال کر سکتی ہے جب کہ دانشورانہ املاک، تحقیق کی سالمیت اور عوامی اعتماد کا تحفظ کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر گیتا وانی ریاسام، ڈائرکٹر، CSIR نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کمیونیکیشن اینڈ پالیسی ریسرچ (CSIR-NIScPR) نے کہا کہ AI کے تیزی سے بڑھتے ہوئے استعمال کے ساتھ، تحقیق کی سالمیت اور بیداری پہلے سے کہیں زیادہ اہم ہوگئی ہے۔ انھوں نے کہا، ایک AI ٹول کے استعمال سے اس ٹول کی ذمہ داری منتقل نہیں ہوتی۔ ذمہ داری انسانی صارف کی رہتی ہے۔ اگر AI غلط معلومات، جعلی حوالہ جات، غلط ڈیٹا یا ہیلوسینیشن پیدا کرتا ہے، تو اس معلومات کو استعمال کرنے کی ذمہ داری مصنف یا محقق پر عائد ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ریاسام نے کہا، ''بہت سے طلبا اور خاص طور پر داخلہ سطح کے محققین ہمیشہ یہ نہیں جانتے کہ ادبی سرقہ، تحقیقی بدانتظامی یا غیر اخلاقی تحقیقی طریقوں میں کیا شامل ہے۔ لہٰذا تحقیقی اخلاقیات اور دیانت کو تعلیمی اور تحقیقی تربیتی پروگراموں کا لازمی حصہ بنایا جانا چاہیے۔'' انھوں نے یہ بھی کہا کہ AI کے استعمال کو شفاف طریقے سے کرنا چاہیے اور مصنفین کو AI سے تیار کردہ معلومات، حوالہ جات، اعداد وشمار اور حوالہ جات کی تصدیق کرنی چاہیے۔ ایس ٹی ایم ایسوی ایشن کی سی ای او محترمہ کیرولین سوٹن نے کہا کہ پبلشنگ انڈسٹری آج اعتماد، AI اور تحقیقی سالمیت کے ایک اہم مقام پر کھڑی ہے۔ انھوں نے کہا، STM کا مشن معتبر تحقیق کو آگے بڑھانا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب لوگوں کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا جارہا ہے کہ کون سی معلومات قابل اعتماد ہے، تصدیق شدہ معلومات کے ذرائع کی حفاظت، مضبوطی اور اعتماد پیدا کرنا انتہائی ضروری ہے۔ محترمہ سوٹن نے کہا کہ تحقیقی ابلاغ ایک علمی نظام کا حصہ ہے اسے شفاف اور جوابدہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا، جب AI سائنسی یا علمی معلومات تیار کرتا ہے، تو ہمیں اس کے ذرائع میں شفافیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمیں جواب کے پیچھے موجود علم کے مکمل حصے کو سمجھنے کے قابل ہونے کی ضرورت ہوتی ہے، جس نے اس جواب کو ممکن بنانے میں محققین کا تعاون کیا، اور اگر تحقیق میں کوئی غلطی ہوئی ہے، تو اس کی نشاندہی کی جاسکتی ہے اور اسے درست کیا جاسکتا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 11 اگست 2026

راہی معصوم رضا کی صد سالہ تقریب کا انعقاد

نئی دہلی: ڈاکٹر راہی معصوم رضا صد سالہ تقریب کا دوسرا ایڈیشن نئی دہلی کے تسمیہ آڈیٹوریم میں وزارت ثقافت، حکومت ہند اور قلم فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام منعقد ہوا۔ پروگرام کا آغاز کوآرڈینیٹر آصف اعظمی کے افتتاحی خطاب سے ہوا۔ اس موقعے پر انھوں نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ راہی کے کاموں نے سب کو جوڑ دیا ہے اور آج کا مقصد پورے ملک کو اس نام سے جوڑنا ہے۔ انھوں نے ایک سال میں 100 تقریبات منعقد کرنے کا تفصیلی منصوبہ بھی پیش کیا۔ سامعین سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر مجاز مونس، ڈاکٹر راہی معصوم رضا کے داماد اور امریکہ میں مقیم نیورولوجسٹ

نے کہا کہ راہی نے تنہائی پر شور اور ہلچل کو ترجیح دی اور ان کے کاموں کا ذریعہ امیر اور طاقتور نہیں بلکہ عام لوگ تھے۔ انھوں نے کہا کہ راہی صاحب گھر کے سادہ ماحول میں لکھتے تھے۔ پروگرام کی صدارت قلم فاؤنڈیشن کے سرپرست ڈاکٹر ایس فاروق نے کی۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر راہی معصوم رضا اردو اور ہندی ادب کا وہ عظیم ستون ہیں جنھوں نے اپنی تحریروں کو عام آدمی کے دکھوں پر مرکوز رکھا۔ مہا بھارت سیریل میں ان کے مکالموں نے انھیں بڑے پیمانے پر پہچان دلائی، لیکن ان کی نظمیں اور ناول اس سے بھی زیادہ نمایاں ہیں۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی معروف معالج پروفیسر ڈاکٹر ایم فاروق نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ راہی صاحب کے کام معاشرے کے زخموں پر مرہم اور نوجوان نسل کے لیے امید کی کرن ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ فاؤنڈیشن نے راہی معصوم رضا کی صد سالہ سالگرہ کے موقعے پر ملک بھر میں 100 تقریبات منعقد کرنے کا منصوبہ بنایا ہے، جن میں شاعری، سیمینار، ڈرامے اور ورکشاپس شامل ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 9 اگست 2026

نئے پرانے چراغ

نئی دهلی: دہلی کی ادبی روایت کو نئی نسل کے تخلیق کاروں سے جوڑنے اور مختلف عمر کے اہلِ قلم کو ایک مشترکہ ادبی

پلیٹ فارم فراہم کرنے کے مقصد سے منعقد ہونے والے 5 روزہ ادبی اجتماع 'نئے پرانے چراغ' کا افتتاحی اجلاس 28 اگست کو اردو اکادمی کے قمر رئیس سلور جبلی آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ افتتاحی اجلاس کے آغاز میں اکادمی کے سینئر کارکنان محمد ہارون اور عزیز حسن قدوسی نے مہمانِ خصوصی و صدر اجلاس پروفیسر صادق علی، سابق صدر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی اور دیگر معزز مہمانوں کا پودا پیش کر کے خیر مقدم کیا۔ تقریب کی نظامت معروف شاعر و ناظم ڈاکٹر شفیع ایوب نے کی۔ انھوں نے 'نئے پرانے چراغ' کی تاریخ، پس منظر اور اس کے مختلف ادوار میں مرتب ہونے والے پروگراموں کے ڈھانچے پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر خالد رضا خاں نے اردو اکادمی اور اس کے منتظمین کو اس اہم ادبی اجتماع کے انعقاد پر، مبارکباد پیش کی۔ اجلاس کے مہمانِ خصوصی پروفیسر صادق نے 'نئے پرانے چراغ' کی ابتدا اور اس کے پس منظر پر گفتگو کی۔

افتتاحی اجلاس کے اختتام کے بعد محفل شعر و سخن کا انعقاد ہوا جس کا باقاعدہ آغاز پروفیسر صادق، پروفیسر اخلاق احمد آہن اور دیگر معزز شعرا نے شمع روشن کر کے کیا۔ مشاعرے کی صدارت پروفیسر اخلاق احمد آہن نے کی جب کہ نظامت کے فرائض معروف نوجوان شاعر انس فیضی نے انجام دیے۔

دوسرے دن کا پہلا تنقیدی و تحقیقی اجلاس 29 اگست کو 10 بجے اکادمی کے قمر رئیس سلور جبلی آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ اجلاس کی صدارت پروفیسر خواجہ اکرام الدین، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی اور پروفیسر شمیم احمد، سینٹ اسٹیفنس کالج، دہلی یونیورسٹی نے مشترکہ طور پر کی، جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ترنم جبیں نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں سجاد الرحمٰن، محترمہ امانہ ساجد، محمد صادق، فواد رشید، وسیمہ اختر، شمزا سہیل، معین الدین، اسمہ خاتون، محترمہ طوبیٰ الماس، افراز خان، نے اپنے مقالات پیش کیے۔ مقالات کی پیشکش کے بعد پہلے اجلاس کی صدارت صدر پروفیسر شمیم احمد نے کی۔

تیسرے روز کے اجلاس کی صدارت پروفیسر ندیم احمد، پروفیسر محمد کاظم اور پروفیسر شیخ عقیل احمد نے مشترکہ طور پر کی جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر محضر رضا نے انجام دیے۔ اس اجلا میں زین العابدین ہاشمی، شارق محمد عزیز، محمد تہلیل عالم، وپن کمار، عبید اللہ اور فیضان اللہ نے اپنے مقالے پیش کیے۔

چوتھے روز بھی مختلف ادبی نشستوں کا انعقاد ہوا۔ چوتھے دن کا پہلا تنقیدی و تحقیقی اجلاس صبح 10 بجے شروع ہوا۔ اجلاس کی صدارت پروفیسر احمد محفوظ، پروفیسر مشتاق عالم قادری اور پروفیسر شاہ عالم نے مشترکہ طور پر کی جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عمران اعظم نے انجام دیے۔ اجلاس کے دوران فیض الرحمٰن، محمد انیس، اقبال احمد، عمر فاروق، ابوہریرہ، محترمہ عائشہ افضل، عامر مظفر بھٹ نے اپنے مقالات پیش کیے۔ اس کے بعد اجلاس کے صدر نے ان مقالات پر اپنی آرا سے بھی روشناس کرایا۔

آخری روز کی ان سرگرمیوں نے 5 روزہ ادبی اجتماع کو مزید وقار، معنویت اور علمی وسعت عطا کی۔ آخری دن کا پہلا تنقیدی و تحقیقی اجلاس صبح 10 بجے شروع ہوا۔ اجلاس کی صدارت پروفیسر معین الدین جینا بڑے، پروفیسر خالد اشرف اور ڈاکٹر خالد علوی نے مشترکہ طور پر کی جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر یوسف رضا نے انجام دیے۔ اجلاس کے دوران دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالرز فردوس عالم، محمد چاند رضا، محمد سرتاج حسین، عبدالماجد، شہباز قدیر چودھری، سیف الرحمٰن، طفیل احمد، ساجد انصاری، عبدالرحمٰن عابد، نے مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 30 اگست تا 2 ستمبر 2026

مملوک العلی لیکچر سیریز

نئی دهلی: مادری زبان کے علاوہ دیگر زبانوں کے سیکھنے میں یقیناً بہت سی دشواریاں پیش آتی ہیں لیکن عمدہ حکمت عملی اور اچھی منصوبہ بندی کے ذریعہ ہم ان دشواریوں اور مشکلوں پر آسانی سے قابو پا لیتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ عربی کی مہمان اسپیکر ڈاکٹر ہیفاء شاکری نے اپنے اس محاضرے میں کیا، جسے وہ ذاکر حسین دہلی کالج کے شعبہ عربی میں منعقد کیے جانے والے آٹھویں 'مملوک العلی لیکچر سیریز' میں 'عربی زبان کی آموزش میں پیش آنے والی دشواریاں اور ان کے حل' کے عنوان سے کلیدی خطبے کے طور پر پیش کر رہی تھیں۔ واضح رہے کہ دہلی یونیورسٹی سے وابستہ 300 سالہ قدیم ذاکر حسین دہلی کالج کے شعبہ عربی نے اپنے قدیم استاذ کی یادگار کے طور ہر تعلیمی سال میں یادگاری لیکچر

منعقد کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ یہ لیکچر اس سلسلے کی آٹھویں کڑی تھا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر ہدیٰ کاظمی نے کی۔ پروگرام کے آغاز ہی میں ڈاکٹر محمد عبیداللہ نے اس لیکچر سیریز کے سابقہ محاضرات اور ان کے پیش کنندگان کی خدمات پر روشنی ڈالی، جس کے بعد شعبے کے انچارج سید محمد طارق نے مہمان اسپیکر کا تعارف پیش کیا۔ مہمان محاضرہ نے پروجیکٹر کے خوبصورت استعمال کے ساتھ نہایت جامع طریقے سے اپنا محاضرہ پیش کیا، جس میں انھوں نے اولاً بین الاقوامی زبانوں میں عربی زبان کی اہمیت اور اس کے تعلیمی فوائد کو بیان کیا، پھر انھوں نے آموزش زبان کے آزمودہ طریقوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ حرف ہجا در اصل منھ سے نکلی ہوئی آواز ہوتے ہیں، اس لیے ہمیں حروف کی شناخت کے ساتھ ان کے مخارج پر بھی توجہ دینا ہوتی ہے، گرچہ عربی زبان کے علاوہ دیگر زبانوں میں ان مخارج کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی ہے لیکن عربی زبان اس کے بغیر ادھوری سی لگتی ہے۔ اس کے بعد دوسرا نمبر مفردات کی ترکیب اور جملہ سازی کا آتا ہے اور پھر تحریری مشق کی ضرورت پیش آتی ہے، جس میں مفرد حروف اور پھر حروف کی ابتدائی، درمیانی اور آخری شکلوں کو ترتیب دے کر الفاظ کی ترکیب وغیرہ پر روشنی ڈالی۔ شعبے کے سینئر استاذ ڈاکٹر محمد قاسم عادل نے مہمان مکرم کے مفید محاضرے کی ستائش کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا اور پروگرام کے کامیاب انعقاد میں حصہ لینے والے جملہ اساتذہ اور طالبہ وطالبات کی بھی ستائش کی۔ پروگرام میں اساتذہ کے علاوہ دیگر طلبہ وطالبات نے بھی شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 3 ستمبر 2026

نجیب محفوظ کی تخلیقات میں انسانی اقدار

نئی دہلی: جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے سینٹر آف عربک اینڈ افریکن اسٹڈیز کی جانب سے معروف مصری ادیب اور نوبل انعام یافتہ ناول نگار نجیب محفوظ کی بیسویں برسی کے پر 'نجیب محفوظ کی تخلیقات میں انسانی اقدار' کے عنوان سے علمی مذاکرے کا انعقاد کیا گیا۔

مذاکرے کی کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر زرنگار نے نظامت کی، جب کہ پروگرام کا آغاز سینٹر آف عربک اینڈ افریکن اسٹڈیز کے چیئر پرسن اور مذاکرے کے ڈائرکٹر پروفیسر محمد قطب الدین کے استقبالیہ کلمات سے ہوا۔ انھوں نے شام اور مصر کے سفراء، صدر اجلاس، اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور طلبہ وطالبات کا خیر مقدم کیا۔ پروگرام کے کنوینر اور سینٹر کے سابق چیئر پرسن پروفیسر مجیب الرحمٰن نے مذاکرے کے موضوع کا تعارف پیش کیا اور شام ومصر کے سفرا کا تعارف کرایا۔ انھوں نے نجیب محفوظ کی ادبی خدمات اور ان کی تخلیقات میں انسانی اقدار کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ شام کے سفیر ڈاکٹر بسام الخطیب نے نجیب محفوظ کی ادبی تخلیقات میں انسانی زندگی، اخلاقی اقدار، انسانی رشتوں اور معاشرتی مسائل کی عکاسی کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا۔ اس کے بعد سوال وجواب کا سیشن بھی منعقد ہوا، جس میں شرکا نے موضوع سے متعلق مختلف سوالات کیے اور مقررین نے ان کے جوابات دیے۔

مصر کے سفیر کامل زاید کامل جلال نے بھی خطاب کیا۔ انھوں نے نجیب محفوظ کے ادب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان کی تخلیقات میں مصری معاشرے کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی سے متعلق ایسے مسائل، جذبات اور اقدار بھی نمایاں ہوتی ہیں جن کی معنویت عالمی سطح پر آج بھی برقرار ہے۔ تقریب کی صدارت اسکول آف لینگویجز، لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز کی ڈین پروفیسر شوبھا سیواسکرن نے کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے نجیب محفوظ کی زندگی اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالی اور تمام مہمانوں اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اختتام پر پروفیسر رضوان الرحمٰن نے صدر اجلاس، معزز سفراء، مہمان خصوصی، اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ مذاکرے میں شعبے کے اساتذہ، اشفاق احمد، ریسرچ اسکالرز اور طلبہ و طالبات کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 ستمبر 2026

پروفیسر محمد حسن پر صد سالہ تقریب

نئی دہلی: ہندستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی کی جانب سے 1 ستمبر کو کمیٹی روم، ایس ایل (1) میں 'ہندستانی زبانوں کا مرکز اور پروفیسر محمد حسن' کے عنوان سے پروفیسر محمد حسن کی صد سالہ تقریبات کا شاندار آغاز کیا گیا۔ اس موقع پر ہندستانی زبانوں کا مرکز کے سابق چیئر پرسن اور پروفیسر محمد حسن کے شاگرد پروفیسر انور پاشا نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے اپنے استاد پروفیسر محمد حسن کے ساتھ اپنے گہرے علمی و قلبی مراسم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ محمد حسن صرف ایک عظیم استاد اور صاحب علم شخصیت ہی نہیں تھے بلکہ ان کی شفقت، وسعت نظر اور فکری رہنمائی نے ان کے شاگردوں کی علمی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ انھوں نے پروفیسر محمد حسن سے وابستہ اپنی یادوں اور علمی تجربات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ استاد سے ان کا تعلق محض درس و تدریس تک محدود نہیں تھا بلکہ اس میں فکری رہنمائی، علمی رفاقت اور گہری انسانی وابستگی کے عناصر بھی شامل تھے۔ پروفیسر انور پاشا نے کہا کہ پروفیسر محمد حسن ایک عالمی شخصیت کے مالک تھے اور بیسویں صدی کی تنقیدی دنیا میں ان کا نام نہایت اہم اور نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ محمد حسن، گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی بیسویں صدی کے اہم ناقدین میں شمار ہوتے ہیں، جنھوں نے اردو تنقید کو نئے فکری، نظری اور جمالیاتی مباحث سے روشناس کرایا۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر محمد حسن کی تحریریں ذہن کے دریچوں کو کھولنے اور قاری کو نئے زاویۂ نظر سے سوچنے پر آمادہ کرنے کی قوت رکھتی ہیں۔ وہ نابغہ روزگار استاد، بلند پایہ ناقد، ڈراما نگار، سوانح نگار اور صحافی تھے۔ ان کی شخصیت میں تدریس، تحقیق، تنقید اور تخلیق کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ ہندستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے موجودہ چیئر پرسن پروفیسر سدھیر پرتاپ سنگھ نے اپنے صدارتی خطاب میں پروفیسر محمد حسن کی تدریسی و تصنیفی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی کتاب 'ڈراما ضحاک' ان کی غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کی بین دلیل ہے۔ انھوں نے کہا کہ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی محض تدریس کا مرکز نہیں بلکہ تربیت سازی اور شخصیت سازی کا بھی ایک اہم ادارہ ہے، اور اس سمت میں پروفیسر محمد حسن کی خدمات نہایت قابل قدر اور لائق تحسین ہیں۔ ان کی علمی و تدریسی روایت نے طلبہ کی فکری تربیت اور ادبی شعور کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 1 ستمبر 2026

شعبۂ عربی میں ریسرچ اسکالرز سمینار

نئی دہلی: شعبۂ عربی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ریسرچ فورم نے یوسف ادریس کی کہانیوں میں سماجی تجزیہ کے عنوان سے ماہانہ سمینار منعقد کیا، جس میں

ڈاکٹر ہیفاء شاکری نے صدر جلسہ کی حیثیت سے شرکت کی، جب کہ ابوسعید نے نظامت کی۔ اس علمی نشست کے آغاز میں صدر شعبۂ عربی پروفیسر محمد قطب الدین نے صدر جلسہ، اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور تمام حاضرین کا خیر مقدم کیا اور سمینار کی افادیت پر روشنی ڈالی۔ بعد ازاں ڈاکٹر محمد اجمل نے صدر جلسہ کا تفصیلی تعارف پیش کیا اور تمام شرکا کا استقبال کیا۔ اس موقعے پر مقرر خصوصی احسن بلال نے اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا جس میں انھوں نے معروف عربی ادیب یوسف ادریس کی کہانیوں کا سماجی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ مقالے کی پیشکش کے بعد اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز نے موضوع کے مختلف پہلوؤں سے متعلق متعدد علمی سوالات پیش کیے، جن کے احسن بلال نے اطمینان بخش جوابات دیے۔ اس موقعے پر پروفیسر مجیب الرحمٰن نے مقالے کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یوسف ادریس نے اپنی کہانیوں میں مصری معاشرے کے مختلف طبقات اور ان سے وابستہ سماجی مسائل کی نہایت موثر انداز میں عکاسی کی ہے۔

اختتام پر صدر جلسہ نے اپنے صدارتی کلمات میں مقالے کے موضوع، انداز پیشکش اور تحقیقی گہرائی کو سراہا۔ آخر میں عربی فورم کی جانب سے محمد قاسم نے صدر جلسہ، اساتذہ اور تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر شعبۂ عربی کے ریسرچ اسکالرز اور طلبہ و طالبات کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 ستمبر 2026

جشنِ ہندستان

نئی دھلی: جامعہ نیشنل فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام نئی دہلی میں واقع جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انصاری آڈیٹوریم میں ایک شاندار ''جشنِ ہندستان'' مشاعرے کا انعقاد کیا

گیا۔ یہ پروگرام سماجی خدمت، کثیر الثقافتی اتحاد، شاعری اور قومی تعمیر کے لیے ایم ایف ایچ بیگ کے جذبے اور دور اندیش سوچ سے متاثر ہو کر منعقد کیا گیا تھا۔ جامعہ نیشنل فاؤنڈیشن کے سکریٹری ایم کیو ایچ بیگ نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور جامعہ میڈیکل کالج اور جامعہ نیشنل فاؤنڈیشن کے اشتراک سے منعقد ہونے والی اس خصوصی تقریب میں شاعری کے شائقین اور ہمدردان کا استقبال کیا۔ مشاعرے کی صدارت تسمیہ آل انڈیا ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر ایس فاروق نے کی۔ انھوں نے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور مختلف برادریوں کے درمیان باہمی احترام، ہم آہنگی اور بھائی چارے کو فروغ دینے میں شاعری اور ادبی روایت کے اہم اور دیرپا کردار پر روشنی ڈالی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر ڈاکٹر مظہر آصف تقریب میں بحیثیت مہمانِ خصوصی موجود رہے، جب کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے رجسٹرار پروفیسر ایم مہتاب عالم رضوی نے بطور مہمانِ اعزازی شرکت کی۔ مشاعرے کی نظامت اقبال اشہر نے کی۔ اس خوبصورت ادبی شام میں متعدد معروف شعرا اور فنکاروں نے اپنی فنکارانہ اور شعری پیشکشیں پیش کیں۔ انھوں نے ہندستانی تہذیب و ثقافت، قومی یکجہتی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، حب الوطنی، محبت اور ملک کی متنوع ثقافتی روایات کی عکاسی کرنے والی تخلیقات پیش کر کے سامعین کو مسحور کر دیا۔ پروگرام کا اختتام ایک مثبت، پر جوش اور خوشگوار ماحول میں ہوا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 31 اگست 2026

راہی صدی تقریبات کی لیکچر سیریز

نئی دھلی: انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی کے زیر اہتمام معروف ناول نگار، شاعر اور ادیب راہی معصوم رضا کی صدی تقریبات کے سلسلے میں لیکچر سیریز کے پہلے خطبہ کا انعقاد اردو گھر کے سیدنا سیف الدین آڈیٹوریم میں ہوا۔ معروف سماجی کارکن و دانشور سہاشنی علی نے کلیدی خطاب کیا، جب کہ صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ معروف ادیب و پدم شری پروفیسر اختر الواسع بھی تقریب میں مہمان خصوصی کے طور پر موجود تھے۔ سہاشنی علی نے کہا کہ راہی معصوم رضا کے ناول 'کٹرا بی آرزو' میں جس انداز سے ہندستانی سماج اور اپنے عہد کی حقیقتوں کو پیش کیا گیا ہے، اس سے آج بھی بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ راہی معصوم رضا اعلیٰ درجے کے ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ معیار کے

فکشن نگار بھی تھے۔ ان کے نزدیک 'کٹرا بی آرزو' صرف ایک ناول نہیں بلکہ سماج کو سمجھنے کا وسیلہ بھی ہے۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو کی جانب سے راہی معصوم رضا کی صدی تقریبات کے انعقاد اور ڈاکٹر اطہر فاروقی کی کوششوں سے راہی سے متعلق مضامین کی دوبارہ اشاعت کو سراہتے ہوئے کہا کہ ایسے پروگرام ان کی ادبی میراث کو نئی نسل تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کریں گے۔ پروفیسر اختر الواسع نے صدی تقریبات کے افتتاح پر انجمن ترقی اردو کو مبارکباد دیتے ہوئے راہی معصوم رضا کی تخلیقات کی اشاعت کے فیصلے کو قابل تحسین قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ راہی بنیادی طور پر اردو کے ادیب تھے، لیکن ان کی تخلیقات ہندی رسم الخط میں بھی شائع ہوئیں۔ انھوں نے اس پہلو کو قابل فخر قرار دیتے ہوئے کہا کہ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، بلکہ زبان انسانوں کو جوڑنے کا ذریعہ ہے۔ راہی معصوم رضا کی ادبی شخصیت اردو اور ہندی کے درمیان موجود اسی تہذیبی اور لسانی ربط کی نمائندگی کرتی ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے صدارتی خطاب میں کہا کہ راہی معصوم رضا ان کے نہایت قریبی تھے اور ان کے بارے میں گفتگو کرنا ان کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ انھوں نے راہی کو ایک غیر معمولی انسان قرار دیتے ہوئے کہا کہ وہ مختلف معاملات میں الجھنے کے باوجود اپنی راہ پر چلتے رہے۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو کی جانب سے راہی کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریروں کو دوبارہ منظر عام پر لانے کی کوشش کو سراہا۔ انھوں نے بتایا کہ صدی تقریبات کے تحت انجمن میں متعدد جلسے اور خطبے منعقد کیے جائیں گے، جن میں راہی معصوم رضا کی شخصیت، فکر اور ادبی خدمات کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے گا۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے اظہار تشکر پیش کرتے ہوئے کہا کہ صدی تقریبات کا بنیادی مقصد راہی معصوم رضا کی ادبی میراث کو ازسرنو اہل ادب اور نئی نسل کے سامنے پیش کرنا ہے۔ پروگرام کی نظامت مالک اشتر نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 اگست 2026

ادبی پروگرام

نئی دہلی: کے ایل نارنگ ساقی کے 90ویں یوم پیدائش کے موقعے پر انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں کنور مہندر سنگھ بیدی لٹریری ٹرسٹ کی جانب سے ایک پروقار جلسے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر اختر الواسع نے کی۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ زبانیں مکالمے کے لیے ہوتی ہیں تنازعے کے لیے نہیں۔ نارنگ ساقی اردو کا چاہنے والا تھا۔ وہ اردو کا محسن تھا۔ اردو اور ہندی کے چھوٹے بڑے شاعروں نے ان سے استفادہ کیا۔ انھوں نے اردو کے تمام لوگوں کے لیے بڑے کام کیے۔ پروفیسر اختر الواسع نے نارنگ ساقی کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے مزید کہا کہ اردو زبان صرف مسلمانوں کی نہیں سب کی ہے، انھیں اس سے محبت تھی۔ انھوں نے کئی کتابیں ترتیب و تصنیف کیں جو مقبول ہوئیں۔ اس موقعے پر کنور مہندر سنگھ بیدی لٹریری ٹرسٹ کے چیئرمین اشوجیت سنگھ نے کہا کہ نارنگ ساقی ہمارے نانا بیدی صاحب کے دیرینہ دوست تھے انھی کی کوشش سے یہ ٹرسٹ بنا۔ وہ اس سکریٹری تھے۔ انھوں نے بہت کام کیا ہے ہم ان کے خدمات اور یادوں کو بھلا نہیں سکتے۔ اس موقعے پر چندر بھان خیال نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ وہ انسان دوست اور ادیب نواز تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 20 اگست 2026

شعری نشست

نئی دہلی: حلقۂ تشنگان ادب کی 587ویں شعری نشست سابق ایڈمیرل خرم شہزاد نور کی میزبانی میں راؤز ایونیو، آئی ٹی او، نئی دہلی میں واقع انجمن ترقی اردو ہند کے کانفرنس ہال میں منعقد ہوئی۔ نشست میں اردو اور ہندی کے شعرا و شاعرات اور کویوں نے بڑھ چڑھ کر شرکت کی۔ نشست کی صدارت پروفیسر کے کے رشی نے کی جب کہ نظامت سیماب سلطان پوری کے کے تعاون سے آشیش سنہا قاصد نے کی۔ ڈائس پر رحمٰن منصور فرید آبادی بحیثیت مہمان شاعر موجود رہے۔

حلقے کے پریس سکریٹری ڈاکٹر حبیب سیفی نے کہا کہ اردو شعر و شاعری سے محبت کرنے والے آج بھی موجود ہیں۔ اس طرح کی نشست میں شائقین کی شمولیت خوش آئند ہے۔

صدر پروفیسر کے کے رشی نے کامیاب نشست کے انعقاد اور شاندار نظم و نسق پر میزبان خرم شہزاد نور کو مبارک باد پیش کی۔ نشست میں پروفیسر کے کے رشی، سیماب سلطان پوری، رحمٰن منصور، فرید احمد فرید، اسرار رازی، غفران راشد، ہاشم دہلوی، خمار دہلوی، ڈاکٹر حبیب سیفی، آشیش سنہا قاصد، عین میم کوثر، خرم شہزاد نور، ڈاکٹر لیزا خان، پریم بریلوی، فیض بدایونی، ارونداشر، اسلم بیتاب، فہیم جوگا پوری، نثار احمد، جاوید عباسی، عارف دہلوی، گولڈی غضب، یامین منظر، راجیش تلخ، انیمیش شرما، سردار دلدار دہلوی، سنجے کمار گری، پون کمار تومر، آلوک اوریل، اثر دہلوی، سید عباس نوگانوی، رماتیاگی، آدیش تیاگی، اعظم حسین، اجے عکس، متین صدیقی، ہمادہلوی، شبھرا پروال، وریندر سنگھ، سریندر شرر، فوزیہ افضال، روبی موہنتی، اجے اگیات، سپنا احساس، احترام صدیقی، سیما شرما میرٹھی، جگدیش مینا، شروینت ذرہ، اشوک ساحل، مہندر سنگھ، گرچرن مہتا رجت، منوج سوسات، شبینہ سرتاج اور انجلی ادا کے نام قابل ذکر ہیں۔ نشست میں کم و بیش 64 شعرا و شاعرات نے اپنا کلام پیش کر کے شرکا کو محظوظ کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اگست 2026

اتر پردیش

جشن کامیابی

میرٹھ: میرٹھ کی ادبی اور رنگ منچ کی فضا کو دیکھتے ہوئے ہم نے یہ عہد کیا ہے کہ میرٹھ کو ہم ڈراما نگری بنائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مستقبل میں میرٹھ کو ڈرامے کے حوالے سے بھی یاد کیا جائے۔ ہماری کوشش رہے گی کہ ہم نئے نئے کردار اور نئے نئے موضوعات پر ڈرامے پیش کر کے میرٹھ کی عوام کو ڈرامے کی اہمیت و افادیت سے روشناس کرائیں۔ یہ الفاظ تھے معروف ادیب و ناقد اور میرٹھ آرٹسٹ ایسوسی ایشن کے صدر پروفیسر اسلم جمشید پوری کے جو یہاں پریم چند سیمینار ہال میں منعقد پروگرام 'جشن کامیابی' کے موقع پر اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ آج ملک کو سماجی بھائی چارے کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے ایک ایسے مشن کی ضرورت ہے جو سماجی فلاح و بہبود اور رواداری کو قائم و دائم رکھنے میں معاون و مددگار ثابت ہو سکے۔ ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ سماج میں ایسے نظریات و خیالات کی تبلیغ ہو جس سے لوگوں کے دماغوں کے بند دریچے کھل جائیں مجھے امید ہے کہ یہ تنظیم اس مشن کو فروغ دینے میں اپنا کلیدی کردار ادا کرے گی۔ پروگرام کی صدارت معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کی۔ نظامت راشد یوسف اور شکریے کی رسم ڈاکٹر آصف علی نے ادا کی۔ اس موقع پر ڈائرکٹر انل شرما اور کنوینز ونود کمار بے چین کو نشان یادگار دے کر اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ اعزاز حاصل کرنے کے بعد ونود کمار بے چین نے کہا کہ ہم شکر گزار ہیں شعبۂ اردو کے اراکین کے جنھوں نے ڈرامے کی شاندار کامیابی کے بعد 'جشن کامیابی' رکھ کر ہماری حوصلہ افزائی کی۔ ہمیں زمین پر چلتے ہوئے آسمان پر نظر رکھنی چاہیے تبھی ہم کامیاب ہوں گے اور آئندہ بھی ہم اور بہتر کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس موقع پر انل شرما نے بھی شعبۂ اردو کا شکریہ ادا کیا۔ واضح ہو کہ پریم چند کی یوم پیدائش کے موقع پر اور معروف رنگ منچ فنکار آنجہانی شریندر شرما کی یاد میں معروف ڈراما نگار رجے وردھن کا تحریر کردہ ڈراما 'گورکھ دھندہ' کو یونیورسٹی کے اٹل سبھاگار میں اسٹیج کیا گیا تھا۔ جس کی ہدایت کاری انل شرما نے کی تھی۔ ناظرین نے ڈرامے کو بہت پسند فرمایا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 19 اگست 2026

لینگویج یونیورسٹی میں جرمن زبان میں تربیتی کورس کا آغاز

لکھنؤ: خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی میں طلبہ کو عالمی سطح پر روزگار کے مواقع سے جوڑنے کے مقصد سے وائس چانسلر پروفیسر اجے تنیجا کی نگرانی میں جرمن زبان کی تربیتی پروگرام کا آغاز کیا گیا۔ اس موقعے پر یونیورسٹی کی اس پہل کو طلبہ کو بین الاقوامی روزگار کے لیے تیار کرنے کی سمت ایک اہم قدم قرار دیا گیا۔ یہ پروگرام خصوصی طور پر جرمنی میں روزگار اور پلیسمنٹ کے مواقع کو مدنظر رکھتے ہوئے تیار کیا گیا ہے۔ تربیتی پروگرام کے تحت طلبہ کو جرمن زبان کے اے ون سے بی ٹو کی سطح تک تربیت فراہم کی جائے گی اور تربیت کی مجموعی مدت تقریباً ماہ ہوگی۔ پہلے مرحلے میں اے ون اور اے ٹو کی کلاسیں یونیورسٹی کیمپس میں آف لائن منعقد

ہوں گی اور بعد کے مرحلے میں بی ون اور بی ٹو سطح کی تربیت آن لائن فراہم کی جائے گی۔ اس موقعے پر وائس چانسلر پروفیسر اجے تنیجا نے کہا کہ موجودہ دور میں غیر ملکی زبانوں کا علم طلبہ کے لیے روزگار اور عالمی مواقع کے نئے دروازے کھولتا ہے۔ جرمن زبان کی تربیت طلبہ کو بین الاقوامی سطح پر اپنی صلاحیتیں نکھارنے اور جرمنی میں روزگار و پلیسمنٹ کے مواقع حاصل کرنے میں اہم کردار ادا کرے گی۔ انھوں نے کہا کہ یونیورسٹی معیاری تعلیم کے ساتھ طلبہ کو روزگار پر مبنی مہارتیں فراہم کرنے کے لیے مسلسل کوششیں کر رہی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ جرمن زبان میں مہارت طلبہ کی مسابقتی صلاحیت میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیمی اور پیشہ ورانہ ترقی میں بھی معاون ثابت ہوگی۔ یونیورسٹی کی یہ پہل طلبہ کو عالمی سطح کی ضروریات کے مطابق تیار کرنے کی سمت ایک موثر کوشش ہے۔ ڈین اکیڈمکس پروفیسر ثوبان سعید نے کہا کہ غیر ملکی زبانوں کا علم طلبہ کی تعلیمی ترقی کے ساتھ ان کے پیشہ ورانہ مستقبل کو بھی مضبوط بناتا ہے۔ جرمن زبان کی تربیت طلبہ کو بین الاقوامی سطح پر بہتر مواقع حاصل کرنے اور ان کی مسابقتی صلاحیت بڑھانے میں مددگار ثابت ہوگی۔ جرمن زبان کے ٹرینر جواہر سنہا نے بتایا کہ پروگرام کے تحت طلبہ کو مفت تربیت فراہم کی جارہی ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 21 اگست 2026

رباعی کا فن اور جنوبی ہند کی رباعی

میرٹھ: میرٹھ، رباعی ایک ایسی صنف ہے جس کے ہر مصرعے میں وزن ہوتا ہے۔ امیر خسرو کے پاس فارسی رباعیات ملتی ہیں۔ سب سے پہلی رباعی حضرت گیسو دراز کی ہے۔ تصوف کے لحاظ سے اور اخلاقیات کے اعتبار سے ان کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ الفاظ تھے معروف محقق و ناقد ڈاکٹر تقی عابدی (کناڈا) کے جو ایو سا، شعبۂ اردو، خواجہ بندہ نواز یونیورسٹی، گلبرگہ اور شعبۂ اردو، میرٹھ یونیورسٹی کے اشتراک سے منعقد 'رباعی کا فن اور جنوبی ہند کی رباعی' موضوع پر اپنی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ رباعی کے حوالے سے امجد حیدرآبادی بھی بڑا مقام رکھتے ہیں۔ جنوب کی رباعیات میں امجد حیدرآبادی کو انفرادیت حاصل ہے۔ رباعی دکن کی پیداوار ہے۔ اردو میں پہلی رباعی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی ہے۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری اور بین الاقوامی شہرت یافتہ محقق و ناقد ڈاکٹر تقی عابدی (کناڈا) نے فرمائی۔ صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے بطور ڈاکٹر طیب خرادی (صدر شعبۂ اردو دی نیو کالج، چنئی) اور مہمانانِ اعزازی کے بطور ڈاکٹر اطہر معزالدین اور ڈاکٹر میمونہ سرڈگی (اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، خواجہ بندہ نواز یونیورسٹی، گلبرگہ) نے شرکت فرمائی۔ پروگرام سے لکھنؤ سے ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین بھی جڑی رہیں۔ استقبالیہ کلمات محمد عابد علی، نظامت کے فرائض ڈاکٹر اطیع اللہ (اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، خواجہ بندہ نواز، یونیورسٹی، گلبرگہ) اور شکریے کی رسم ڈاکٹر سلمان عبد الصمد (اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، خواجہ بندہ نواز، یونیورسٹی، گلبرگہ) نے ادا کی۔ اس موقعے پر معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ آج کا یہ پروگرام شعبۂ اردو خواجہ بندہ نواز یونیورسٹی، گلبرگہ کے اشتراک سے عمل میں آ رہا ہے۔ اس پروگرام سے بہت سے لوگ جڑے ہوئے ہیں جن کا ہم استقبال کرتے ہیں اور شکریہ بھی ادا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اطہر معز نے مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ کرناٹک میں رباعی کے تعلق سے یقین کے ساتھ کچھ زیادہ نہیں کہا جا سکتا۔ آزادی سے قبل کرناٹک میں خصوصاً شعر و شاعری ہوتی رہی ہے البتہ حیدرآباد میں متعدد رباعیات کے لکھنے والے رہے ہیں۔ برکت اللہ، حق راہی قریشی کی رباعیوں میں سماج و معاشرے کے تمام مسائل و موضوعات کے ساتھ ساتھ اردو کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ بہت سی رباعیاں ہندی اور سنسکرت کے ترجمہ ہیں۔ خالد سعید، اکرم نقاش، امجد حسین کرناٹک، حافظ کرناٹکی کی رباعیاں عوام کے دلوں میں جگہ بنانے کے ساتھ ساتھ بچوں کی سوچ و فکر، تہذیب و تمدن میں بھی اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ جنوبی ہند میں بالخصوص اور کرناٹک میں بالعموم رباعیاں لکھی جارہی ہیں۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر طیب خرادی نے کہا کہ محمد قلی قطب شاہ نے رباعیات میں خاص طبع آزمائی کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 25 اگست 2026

چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کی تعلیمی خدمات

میرٹھ: اپنے ملک کی یونیورسٹیز کی لائبریریوں میں جب ہم دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے مقابلے میں اس یونیورسٹی کی خصوصیات اپنے آپ میں بڑی اہم ہیں۔ میں جب اس یونیورسٹی میں آیا تو اس وقت یہاں 400 کے قریب طالب علم تھے اب یہ تعداد بڑھ کر تقریباً 7000 ہوگئی ہے۔ یہ الفاظ تھے ڈین فیکلٹی آف آرٹس سی سی ایس یو کے پروفیسر اتویر سنگھ کے جو شعبۂ اردو اور ایوسا کے زیر اہتمام منعقد 'چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کی تعلیمی خدمات' موضوع پر اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ پروگرام کی سرپرستی بین الاقوامی شہرت یافتہ ناقد ڈاکٹر تقی عابدی کناڈا، معروف ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری اور پروفیسر صغیر افراہیم نے فرمائی اور صدارت کے فرائض ڈین فیکلٹی آف آرٹس، سی سی ایس یونیورٹی پروفیسر اتویر سنگھ نے انجام دیے۔ مہمانِ اعزازی کے بطور صدر شعبۂ لائبریری سائنس پروفیسر جمال احمد صدیقی اور معروف فکشن نگار امیر مہدی، انگلینڈ نے آن لائن شرکت کی۔ مقرر کے بطور معروف تاریخ داں اور صدر شعبہ تاریخ پروفیسر کے شرما نے شرکت فرمائی۔ لکھنو سے ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین بھی پروگرام میں موجود رہیں۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر سیدہ خان نے انجام دیے۔ موضوع کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر ارشاد سانوی نے کہا کہ آج کا پروگرام چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کی تعلیمی خدمات پر مشتمل ہے۔ اس یونیورسٹی کو اونچائیوں تک لے جانے میں یہاں کی موجودہ وائس چانسلر پروفیسر سنگیتا شکلا، فیکلٹیز ڈین صاحبان، سینئر پروفیسر اور افسران اپنے فرائض عمدہ طریقے سے نبھا کر یونیورسٹی کی تعلیمی خدمات میں چار چاند لگا رہے ہیں۔ معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہماری یونیورسٹی آج پورے ہندوستان میں اپنی شناخت رکھتی ہے۔ ہمارے بہت سے شعبے ایسے ہیں جن کی پہچان دور دور تک ہے۔ یونیورسٹی کی ترقی میں ہماری وائس چانسلر نے اہم کردار کیا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 3 جولائی 2026

عالمی یومِ فوٹوگرافی

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ مصوری وفنونِ لطیفہ نے معروف فوٹو جرنلسٹ رگھورائے کی وراثت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فوٹوگرافی مقابلے اور نمائش کے انعقاد کے ساتھ عالمی یوم فوٹوگرافی 2026 منایا۔ تقریب کا افتتاح شعبے کی سابق سربراہ پروفیسر سیما جاوید نے کیا۔ اس موقعے پر شعبۂ مصوری وفنونِ لطیفہ کے سربراہ ڈاکٹر عابد ہادی کے علاوہ ڈاکٹر دستگیر عالم، ڈاکٹر جمیل احمد، ڈاکٹر محمد کیف فرشوری اور دیگر اساتذہ بھی موجود رہے۔ انھوں نے طلبہ کی جانب سے پیش کی گئی تخلیقی تصاویر کا مشاہدہ کیا۔ فوٹوگرافی مقابلے میں شعبۂ جغرافیہ کے ثاقب پرویز نے پہلی پوزیشن حاصل کی۔ شعبۂ مصوری وفنونِ لطیفہ کے تنزیل نے دوسری جب کہ ویمنز کالج کے شعبۂ مصوری وفنونِ لطیفہ کی صائمہ خُتم نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ نمائش نے طلبہ کو فوٹوگرافی کے ذریعے مختلف لمحات کو کیمرے میں محفوظ کرنے اور اپنی تصاویر کے ذریعے کہانیاں بیان کرنے کا موقع فراہم کیا۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 20 اگست 2026

انٹروڈکشن ٹو وکی پیڈیا

لکھنؤ: خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی اور بالارک وناز فاؤنڈیشن کے باہمی اشتراک سے اردو، فارسی اور عربی شعبے کے زیرِ اہتمام یونیورسٹی کیمپس میں 'انٹروڈکشن ٹو وکی پیڈیا' کے عنوان سے دو روزہ ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا۔ اس اہم ورکشاپ کا مقصد طلبہ، اساتذہ اور دیگر شرکا کو وکی پیڈیا اور وکی میڈیا فاؤنڈیشن کے مختلف علمی و معلوماتی منصوبوں سے روشناس کرانا، ان کی افادیت سے آگاہ کرنا اور طلبہ کو ان منصوبوں میں رضا کارانہ طور پر حصہ لینے کے لیے تیار کرنا تھا۔ اس ورکشاپ کے دوران وکی پیڈیا اور وکی پیڈیا کے مختلف منصوبوں سے وابستہ ماہرین نے شرکا کو نہ صرف نظریاتی معلومات فراہم کیں بلکہ عملی مشقوں کے ذریعے مختلف منصوبوں کے استعمال اور ان میں علمی تعاون کے طریقۂ کار سے بھی آگاہ کیا۔ ورکشاپ کے پہلے روز یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اجے تنیجا نے کہا کہ عام طور پر بہت سے لوگ صرف وکی پیڈیا سے واقف ہیں لیکن اس ورکشاپ کے ذریعے یہ جاننے کا موقع مل رہا ہے کہ وکی پیڈیا دراصل وکی پیڈیا فاؤنڈیشن کے متعدد منصوبوں میں سے ایک اہم منصوبہ ہے۔ وائس چانسلر نے مزید کہا کہ یونیورسٹی کے لیے یہ ایک اہم موقع ہے کہ طلبہ اور اساتذہ کو ایک ایسے عالمی ادارے اور اس کے مختلف منصوبوں کے بارے میں جاننے کا موقع مل رہا ہے، جو دنیا بھر میں علم کو مفت اور عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے کام کر رہا ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ ورکشاپ میں شرکت کرنے والے طلبہ اس علمی تحریک سے وابستہ ہو کر رضا کارانہ طور پر اپنا کردار ادا کریں گے اور اردو سمیت دیگر زبانوں میں علمی و معلوماتی مواد کی ترویج میں معاون ثابت ہوں گے۔

اس ورکشاپ میں وکی پیڈیا کے ماہرین فیض انجم اور عائشہ پروین نے ابتدائی مرحلے میں وکی پیڈیا فاؤنڈیشن کا تفصیلی تعارف پیش کرتے ہوئے بتایا کہ وکی پیڈیا فاؤنڈیشن ایک غیر منافع بخش عالمی ادارہ ہے جس کے تحت متعدد آزاد اور باہمی طور پر مربوط علمی منصوبے کام کر رہے ہیں۔ اس موقعے پر وکی پیڈیا کے لیڈ پارٹنرشپ، ساؤتھ ایشیا مینیجر نے بھی وکی پیڈیا فاؤنڈیشن کے اہم منصوبوں اور اس کے بنیادی مقاصد پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 23 اگست 2026

ذرائع ابلاغ، فلم اور اسٹریمنگ پلیٹ فارمز میں کثیر لسانیت: مواقع، چیلنجز اور نئے امکانات

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فیکلٹی آف آرٹس کے شعبۂ لسانیات نے 'ذرائع ابلاغ، فلم اور اسٹریمنگ پلیٹ فارمز میں کثیر لسانیت: مواقع، چیلنجز اور نئے امکانات' کے موضوع پر سڈنی، آسٹریلیا سے تعلق رکھنے والے آزاد محقق چارلس ایس تھامسن کے خصوصی خطبے کا اہتمام کیا۔ تھامسن نے اپنے خطاب میں کثیر لسانیت کے فوائد اور ابلاغ میں اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ کثیر لسانیت کمزوری نہیں بلکہ ایک قوت ہے۔ انھوں نے مادری زبان اور علاقائی زبانیں سیکھنے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لوگوں کو اپنے گھروں میں مادری زبان بولنے کی ترغیب دی۔ اپنے ذاتی تجربات بیان کرتے ہوئے مسٹر تھامسن نے کہا کہ متعدد زبانیں اور خصوصاً ہندی سیکھنے سے ان کے پیشہ ورانہ سفر میں نمایاں طور سے مدد ملی ہے۔ اس نے انھیں بہت سے مغربی اساتذہ سے ممتاز کیا، جنھوں نے ہندی صرف جامعات میں سیکھی تھی۔ انھوں نے لوگوں کو ان کی اپنی مادری زبانوں کے ذریعہ ایک دوسرے سے جوڑنے میں سماجی ذرائع ابلاغ کے کردار کو بھی اجاگر کیا۔ شعبۂ لسانیات کے چیئرمین پروفیسر ایم جے وارثی نے حاضرین کا خیر مقدم کیا۔ چارلس ایس تھامسن کا تعارف کراتے ہوئے انھوں نے نالندہ ادبی میلے میں ان سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا۔ پروفیسر وارثی نے ہندوستان میں کثیر لسانیت کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے قومی تعلیمی پالیسی 2020 کا حوالہ دیا، جو طلبہ کو مادری زبان کے ساتھ اضافی ہندستانی زبانیں سیکھنے کی ترغیب دیتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان فطری طور پر ایک کثیر لسانی ملک ہے اور کثیر لسانیت ملک کے بھرپور لسانی، ادبی اور ثقافتی تنوع کی قدر و تحسین کو فروغ دیتی ہے۔ انھوں نے "ایک بھارت، شریشٹھ بھارت" کے جذبے کو مضبوط بنانے میں بھی کثیر لسانیت کے کردار پر زور دیا۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین پروفیسر محمد رضوان خان نے خصوصی خطبے کے انعقاد اور ممتاز مقرر کو مدعو کرنے پر پروفیسر ایم جے وارثی کو مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 3 ستمبر 2026

اترا کھنڈ

راہی معصوم رضا کی یاد میں صد سالہ تقریب

دھرادون: معروف شاعر، ناول نگار اور اسکرپٹ رائٹر ڈاکٹر راہی معصوم رضا کی یاد میں صد سالہ تقریب تسمیہ اکیڈمی، اندر روڈ، دہرادون میں نہایت وقار اور

شایانِ شان انداز میں منعقد ہوئی۔ تقریب کا آغاز حلقۂ اربابِ ذوق کے بانی ڈاکٹر منوج پنجانی کے تعارفی کلمات اور استقبالیہ خطاب سے ہوا۔ تقریب کی صدارت تسمیہ سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر ایس۔ فاروق نے کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ مہا بھارت کے لیے ڈاکٹر راہی معصوم رضا کے تحریر کردہ مکالموں نے انھیں بین الاقوامی شہرت اور لازوال

مقبولیت عطا کی۔ انھوں نے ڈاکٹر راہی معصوم رضا کی ادبی صلاحیتوں اور خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے منعقد کیے گئے اس شاندار پروگرام پر منتظمین کو مبارکباد دی۔ تقریب کی نظامت مینو گوکل چودھری نے کی۔ شبانہ، ثنا اور شگفتہ سمیت متعدد ممتاز مقررین نے ڈاکٹر راہی معصوم رضا کی ہمہ جہت ادبی خدمات اور ان کے گراں قدر ادبی سرمایہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ معروف شاعر عنبر کھربندہ نے اپنی شاعری پیش کر کے تقریب کو شعری رنگ سے بھی آراستہ کیا۔ تقریب میں متعدد ممتاز شخصیات کی باوقار شرکت رہی، جن میں بریگیڈیئر کے۔ جی۔ بہل (مصنف و شاعر)، جسپال دگل (مجسمہ ساز)، ڈاکٹر راج بخشی، سکرتی آریا (کری آرٹ گیلری)، امر سنگھ دھوننا (آر ٹی آئی کارکن) اور ڈاکٹر ایس۔ ایس۔ کھیرہ شامل تھے۔ اس موقع پر لکھنؤ میں منعقدہ قومی تائیکوانڈو چیمپئن شپ میں تمغے حاصل کرنے والے تین تائیکوانڈو کھلاڑیوں کو اسناد بھی پیش کی گئیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 19 اگست 2026

بہار

تحریر و تفہیم

دربھنگہ: یومِ آزادی کے موقع پر المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام معروف افسانہ نگار، ناقد اور ادیب ڈاکٹر مجیر احمد آزاد کی تنقیدی و تبصراتی

کتاب ''تحریر و تفہیم'' پر خصوصی ادبی نشست حکیم دمڑی منزل، ڈاکٹر آفتاب حسین کمپلیکس، سبھاش چوک، دربھنگہ میں منعقد ہوئی۔ نشست کی صدارت معروف شاعر و ادیب ڈاکٹر عطاء عابدی نے کی، جب کہ انور آفاقی مہمانِ خصوصی کے طور پر شریک ہوئے۔ نظامت ڈاکٹر منصور خوشتر نے کی۔ نشست کے آغاز میں ڈاکٹر منصور خوشتر نے استقبالیہ و افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے پروگرام کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور ڈاکٹر مجیر احمد آزاد کی ادبی شخصیت، تخلیقی سفر اور تنقیدی خدمات کا تعارف کرایا اور مہمان خصوصی انور آفاقی نے ڈاکٹر مجیر احمد آزاد کی مطالعہ پسندی اور ان کی تحریروں میں پختگی، رواداری اور فکری و فنی حسن کو نمایاں خصوصیات قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر آزاد صرف فکشن نگار ہی نہیں بلکہ سلجھی ہوئی فکر رکھنے والے ناقد، تبصرہ نگار، محقق، سفرنامہ نگار اور بچوں کے ادیب بھی ہیں۔ ان کے متعدد افسانوی مجموعے اور دیگر کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر منظر سلیمان نے ڈاکٹر مجیر احمد آزاد کی اردو زبان و ادب سے گہری وابستگی کو سراہا۔ انھوں نے کہا کہ مسلسل مطالعے، محنت اور تخلیقی سرگرمیوں کے ذریعے ڈاکٹر آزاد نے اردو ادب میں اپنی نمایاں شناخت قائم کی ہے اور ''تحریر و تفہیم'' ان کی تنقیدی و فکری جہت کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ ڈاکٹر احسان عالم نے مصنف کی فکری صلاحیت، مطالعے اور اسلوب کو سمجھنے کے طریقے کی سراہنا کی۔ ڈاکٹر ایوب راعین نے ڈاکٹر مجیر احمد آزاد کی مختلف تصانیف کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ان کی تحریروں میں عرق ریزی، وسیع مطالعہ اور تحقیقی مزاج نمایاں ہے۔ ڈاکٹر ریحان قادری نے مصنف کی اس خوبی کو اجاگر کیا کہ وہ نئے قلمکاروں کی حوصلہ افزائی اور نوجوان ادیبوں کی رہنمائی کے لیے ہمیشہ آمادہ رہتے ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے اپنی کتاب تحریر و تفہیم کے پس منظر، موضوعات اور مختلف مضامین کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی۔ صدارتی خطاب میں ڈاکٹر عطاء عابدی نے ''تحریر و تفہیم'' کے مختلف مضامین اور کتاب کے مجموعی فکری و فنی مزاج کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر مجیر احمد آزاد کی ادبی کاوشوں کو سراہا۔ انھوں نے کہا کہ کتاب کے مضامین مصنف کی وسیع مطالعہ پسندی، فکری وسعت اور تنقیدی بصیرت کے عکاس ہیں۔ ڈاکٹر عطاء عابدی نے کہا کہ ڈاکٹر مجیر احمد آزاد کے افسانوی مجموعوں، سفرنامے اور تنقیدی و تحقیقی کتابوں سے ان کے متنوع فکری و فنی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں میں تصنع و تکلف کے بجائے خلوص، مطالعے کی گہرائی اور آزادانہ تفہیم کا سلیقہ نمایاں ہے۔ آخر میں ڈاکٹر احسان عالم نے اظہار تشکر پیش کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 19 اگست 2026

جنگ آزادی میں اردو کا کردار

بودھ گیا: اردو صرف ایک زبان نہیں بلکہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیبی وراثت کی ایک اہم علامت ہے۔

جنگ آزادی کے دوران اردو نے عوام میں سیاسی شعور بیدار کرنے، قومی یکجہتی کو فروغ دینے اور آزادی کے جذبے کو عام کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ باتیں سابق انسپکٹر جنرل آف پولس حکومت بہار اور معروف اردو ادیب و دانشور سید معصوم عزیز کاظمی نے شعبۂ اردو مگدھ یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقدہ تقریب ''جنگ آزادی میں اردو کا کردار'' میں بطور مہمان خصوصی شرکت کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو کے اخبارات، رسائل، شعرا اور ادبا نے اپنی تحریروں کے ذریعے انگریز سامراج کے خلاف مزاحمت کی فضا پیدا کی اور عوام کو آزادی کی جدوجہد سے جوڑنے کا اہم کام انجام دیا۔ اردو شاعروں اور ادیبوں نے اپنی تخلیقات سے اور اپنے مضامین سے عوام کے دلوں میں جذبہ حریت کو ہوا دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس خصوصی تقریب کی صدارت کرتے ہوئے مگدھ یونیوسٹی کے پراکٹر پروفیسر کرشن دیو ورما نے کہا کہ ہندوستان کی جنگ آزادی ایک مشترکہ قومی جدوجہد تھی، جس میں مختلف زبانوں، مذاہب اور طبقات کے لوگوں نے متحد ہو کر حصہ لیا۔ اردو نے اس جدوجہد میں ایک رابطے کی زبان کے طور پر اہم کردار ادا کیا اور آزادی کے پیغام کو وسیع پیمانے پر عوام تک پہنچانے میں موثر ذریعہ ثابت ہوئی۔ اس تقریب میں کلیدی مقرر کے طور پر ایس این سنہا کالج، ٹکاری کے شعبۂ سیاسیات کے استاد اور معروف اردو ادیب و کالم نگار ڈاکٹر ابھے کمار نے کہا کہ آزادی کی تحریک کو عوام تک پہنچانے میں اردو صحافت نے غیر معمولی کردار ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے متعدد اخبارات اور صحافتی اداروں نے انگریزی حکومت کی پابندیوں، دباؤ اور سخت کارروائیوں کے باوجود آزادی، خود مختاری اور قومی اتحاد کا پیغام عام کیا۔ اس موقعے پر شعبۂ فلسفہ کے صدر پروفیسر جاوید انجم، شعبۂ سنسکرت کے سابق صدر پروفیسر مونیشور پرساد، متھلا یونیورسٹی کے سابق استاد پروفیسر اسد اللہ اور دیگر مقررین نے بھی اظہار خیال کیا۔

تقریب کے انعقاد کا مقصد جنگ آزادی کی تاریخ میں اردو زبان و ادب اور صحافت کے کردار کو اجاگر کرنا اور نئی نسل کو اس عظیم قومی جد و جہد کے ان پہلوؤں سے روشناس کرانا تھا جو ہندوستان کی مشترکہ تہذیبی اور قومی تاریخ کا اہم حصہ ہیں۔ تقریب کی نظامت شعبہ کی استاد ڈاکٹر سمی اقبال نے کی جب کہ ڈاکٹر ترنم جہاں نے کلمات تشکر ادا کیے۔ پروگرام کے آغاز میں شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر عبدالحی نے استقبالیہ کلمات ادا کیے ساتھ ہی اس موضوع کی غرض و غایت بیان کی اور اس موضوع کو موجودہ دور کی اہم ضرورت سے تعبیر کی۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کی تاریخ گواہ ہے کہ اردو زبان چاہے وہ شاعری کی شکل میں ہو یا نثر کی جنگ آزادی کی شمع کو جلانے میں پیش پیش رہی ہے۔ شعبۂ اردو کی تین طالبات نیہا ناز، نور افشاں اور لئیقہ فاطمہ نے یوم آزادی کی مناسبت سے نظمیں پیش کیں۔ اس خصوصی تقریب میں شعبۂ اردو کے تمام اساتذہ اور طلبا و طالبات موجود رہے۔ تقریب کا اختتام راشٹرگان جن گن من کی پیشکش پر ہوا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 14 اگست 2026

ریسرچ اسکالرز تقریب

پٹنہ: تحقیق ایک مشقت طلب، سنجیدہ اور علمی کام ہے اس میں عجلت پسندی کا کوئی گزر نہیں۔ کسی موضوع پر صبر و تحمل کے ساتھ، مستند حوالوں اور گہرے مطالعے کے بعد نئے نتائج تک پہنچنا محقق کی ذمے داری ہوتی ہے۔ اس عمل میں سخت محنت، صبر و ضبط اور مستحکم ارادے ضروری ہوتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں نئے ریسرچ اسکالرز کے لیے منعقدہ ایک تقریب میں خطاب کرتے ہوئے معروف ناقد و محقق پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ تحقیق کی صورت حال پر توجہ کی ضرورت ہے۔ کاتا اور لے دوڑی کا عمل تحقیق میں نہیں چلتا۔ یہاں ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا ہے۔ بیان اور زبان دونوں پر توجہ دینی پڑتی ہے کیونکہ تحقیق میں متن اور زبان دونوں تنقید، تخلیق اور شاعری سے بالکل الگ ہوتی ہے۔ تقریب کے آغاز میں موضوع کا تعارف کراتے ہوئے شعبے کے استاد پروفیسر شہاب ظفر اعظمی نے کہا کہ محض ڈگری کے حصول کے لیے کی گئی تحقیق کا نام تحقیق نہیں ہے۔ تحقیق محض سچ اور حق کی تلاش کا نام نہیں ہے بلکہ اس سچ تک پہنچنے کے لیے جو راستہ آپ نے چنا ہے اس پر سچائی اور حق کے ساتھ چلنے کا بھی نام ہے۔ ڈیجیٹل عہد، نئی قومی تعلیمی پالیسی اور اپنی ثقافت پر زور کے رجحان نے واضح کر دیا ہے کہ اب موضوعات کے انتخاب میں اس پر سوچنے کی ضرورت ہے کہ وہ موضوع ہمارے تاریخ، معاشرے تاریخ اور تہذیب کے تحفظ و فروغ میں کتنا اہم کردار ادا کرے گا۔ صدر شعبہ پروفیسر سورج دیو سنگھ نے صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے اسکالرز کو پابندی کے ساتھ کلاس کرنے، تحقیق کے طریقۂ کار کو سمجھنے اور تحقیقی وسائل کے درست استعمال سے واقفیت حاصل کرنے کی تلقین کی اور کہا کہ یہ کورس محض ایک ڈگری کا حصول نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ آپ کو گہرے مطالعے، فکر اور نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کا بھی ذریعہ ہے۔ اب تحقیق کی راہیں مزید دشوار ہوگئی ہیں۔ مصنوعی ذہانت اور ڈیجیٹل دنیا نے سہولیات کے ساتھ قدم قدم پر امتحان کے سامان بھی پیدا کر دیے ہیں، محقق کو ان کا خیال رکھنا ہے اور راستے کی دشواریوں کا سامنا کرتے ہوئے سچ اور حق تک پہنچنا ہے۔ اس موقع پر شعبے کی اساتذہ ڈاکٹر مسرت جہاں اور ڈاکٹر افشاں بانو نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تقریب میں شعبے کے نئے اسکالرز کے ساتھ پرانے ریسرچ اسکالرز، طلبہ اور طالبات کی بھی کثیر تعداد موجود تھی۔ پروگرام کے اختتام پر طلبا نے سوالات بھی کیے جن کا انھیں تشفی بخش جواب بھی دیا گیا۔ تقریب کی نظامت ڈاکٹر مسرت جہاں نے انجام دی۔

روزنامہ 'آگ' لکھنؤ، 27 اگست 2026

استقبالیہ تقریب

پٹنہ: مشہور صحافی، کالم نگار اور مدیر معصوم مرادآبادی کے اعزاز میں 1 ستمبر کو ''فرید ہاؤس'' میں ایک اعزازی نشست منعقد ہوئی۔ اس کا اہتمام اردو ایکشن کمیٹی بہار (رجسٹرڈ) نے کیا تھا۔ اس نشست کی صدارت قومی تنظیم کے مدیر اعلیٰ ایس ایم اشرف فرید نے کی۔ نظامت کا فریضہ اردو ایکشن کمیٹی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اشرف النبی قیصر نے انجام دیا۔ استقبالیہ تقریب میں مشہور ادیب، صحافی اور کالم نگار ڈاکٹر نسیم اختر کی کتاب 'غلام سرور ایک شخص ایک کارواں' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے معصوم مرادآبادی نے کہا کہ پٹنہ کی تین شخصیتیں ایسی

ہیں جن سے وہ کافی متاثر ہوئے۔ ان میں ڈاکٹر کلیم عاجز، ڈاکٹر رضوان احمد اور پروفیسر محسن عثمانی شامل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بہار میں اردو پورے آب و تاب کے ساتھ کے زندہ ہے۔ اردو کے حوالے سے یہاں سرگرمیاں دیکھ کر انھیں کافی توانائی ملی۔ انھوں نے کہا کہ اردو ڈائرکٹوریٹ نے پٹنہ میں دو روزہ جشن اردو کا انعقاد کر کے جو تاریخ رقم کی ہے اس کی بازگشت دوسری ریاستوں میں بھی سنی جا رہی ہے۔

اپنی صدارتی تقریر میں ایس ایم اشرف فرید نے کہا کہ معصوم مرادآبادی کی تحریروں میں ایک خاص رنگ ہوتا ہے۔ قارئین ان کی تحریریں شوق سے پڑھتے ہیں۔ جناب شفیع مشہدی نے کہا کہ انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے ہی کیا تھا اور پہلی نوکری ایک اخبار میں کی تھی۔ اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے انڈین انفارمیشن سروس کے آفیسر سید سلمان حیدر (ڈپٹی ڈائرکٹر نیوز، دوردرشن پٹنہ) نے کہا کہ ہمیں اپنے گھروں میں اردو کو زندہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اردو اداروں سے اپیل کی کہ وہ اسکولی نصاب میں اردو کو لازمی مضمون کی شکل میں شامل کرنے کی کوشش کریں۔ خانقاہ کریمیہ اشرفیہ بیتھو شریف کے زیب سجادہ سید شاہ غفران اشرفی نے کہا کہ ان کی تحریر کی دھوم ہے۔ اس موقعے پر خانقاہ حضرت دیوان شاہ ارزانی کے سجادہ نشیں ڈاکٹر سید شاہ حسین احمد، اردو ایکشن کمیٹی کے سکریٹری ڈاکٹر انوار الہدیٰ، ڈاکٹر نسیم اختر، صحافی فیضان احمد، ڈاکٹر نعمان قیصر، ڈاکٹر نقی محمد جون، اثر فریدی، ڈاکٹر اعجاز رسول، اصغر حسین کامل، ڈاکٹر ثریا جبیں اور ڈاکٹر رحمت یونس نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 2 ستمبر 2026

پنجاب

موجودہ دور میں اردو نظم کی اہمیت

چنڈی گڑھ: پروفیسر ابوبکر عباد نے 'موجودہ دور میں اردو نظم کی اہمیت' کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ پنجاب نے جس طرح اردو زبان کی ابتدائی نشوونما

اور اس سے کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا، آج بھی پنجاب کے بغیر اردو کا تصور ناممکن ہے۔ اردو کی نظمیہ تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر عباد نے اردو شعرا کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ نئی نظم کی راہ پنجاب ہی سے نکلتی ہے۔ پروفیسر ابوبکر عباد نے شعبۂ اردو کے طلبہ کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ پنجاب کے مختلف تعلیمی اور ادبی اداروں میں اردو شعر و ادب کے فروغ میں منعقد ہونے والی تقریبات اور مشاعرے اس بات کا ثبوت ہیں کہ اردو سے محبت کرنے والے لوگ آج بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی کی ادبی سرگرمیوں کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر ابوبکر عباد نے کہا کہ اس زبان سے طلبہ کا اس قدر وابستہ ہونا اردو کے لیے نہایت خوش آئند بات ہے اور ہمیں یقین ہے کہ پنجاب میں اردو کا مستقبل روشن ہے۔ اس موقع پر پروفیسر ابوبکر عباد نے اپنی تین نظمیں بھی سنائیں۔ خطبے کے آخر میں ڈاکٹر عباد سے مختلف سوالات بھی کیے گئے، جن کے انھوں نے تفصیلی جوابات دیے۔ انھوں نے طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انھیں تخلیقی اظہار کی جانب بھی متوجہ کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر علی عباس صدر شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ، نے پروفیسر ابوبکر عباد کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کی علمی و ادبی خدمات سے طلبہ کو متعارف کرایا اور اردو نظم کی روایت، اس کے فن، موجودہ دور میں اس کی اہمیت و افادیت پر تفصیلی گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ بدلتے ہوئے سماجی اور فکری حالات میں نظم اپنے اظہار کی وسعت اور موضوعاتی تنوع کے باعث آج بھی اردو ادب کی ایک اہم اور موثر صنف کی حیثیت رکھتی ہے۔ آخر میں پروفیسر ریحانہ پروین نے شعبۂ اردو کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے حاضرین کو اپنے دعائیہ کلمات سے نوازا۔ فارسی کے استاد ڈاکٹر ذوالفقار علی نے تقریب کے اختتام پر مہمانِ خصوصی پروفیسر ابوبکر عباد، شعبے کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور طلبہ کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 14 اگست 2026

تلنگانہ

تخلیق کار سے ملاقات

حیدر آباد: ''اردو یونیورسٹی اردو زبان و تہذیب کا گہوارہ ہے۔ مجھے یہاں آ کر ہمیشہ اچھا لگتا ہے۔ یہاں

کے اربابِ اختیار، اساتذہ، طلبہ اور دیگر ذمہ داران نے اپنی محنت اور لگن کے ذریعے اس جامعہ کو تیز رفتار ترقی عطا کی ہے۔ یہاں کے فارغین اپنی لیاقت، ڈسپلن اور تہذیب و شائستگی کی بنا پر علمی حلقوں میں منفرد شناخت کے حامل ہیں۔'' ان خیالات کا اظہار پروفیسر محمد زاہد الحق، ڈائرکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ نے ثقافتی سرگرمی مرکز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی جانب سے منعقدہ تخلیق کار سے ملاقات پروگرام میں کیا۔ انھوں نے خدا بخش لائبریری کی تاریخ اور اس کے علمی ذخیرے کی اہمیت و افادیت سے بھی واقف کرایا۔ اس موقعے پر صدارتی خطاب پیش کرتے ہوئے پروفیسر صدیقی محمد محمود، ڈین بہبودی طلبہ نے کہا کہ پروفیسر زاہد الحق ایک ایسے استاد ہیں جو اپنے طلبہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت پر بھی خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ کمرہ جماعت کے علاوہ سمینار، ورکشاپ وغیرہ میں شرکت اور مقالہ لکھنے سے لے کر ان کی پیش کش تک کے گر سکھاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی میراث کو اپنی حد تک نہیں رکھا ہے بلکہ اسے نئی نسل تک منتقل کرنے میں مصروف ہیں۔ علیم اشرف جائسی پروفیسر ایمریٹس، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور سابق ڈین بہبودی طلبہ نے اپنے خصوصی خطاب میں پروفیسر محمد زاہد الحق کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ میرے لیے بے حد خوشی کی بات ہے کہ اورینٹل اسٹڈیز کے حوالے سے پوری دنیا میں شہرت رکھنے والی مایہ ناز خدا بخش لائبریری جو میرا پسندیدہ ادارہ ہے، میں میرے عزیز پروفیسر زاہد الحق کا بحیثیت ڈائرکٹر تقرر ہوا ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ ان کی قیادت میں اس ادارے کو نئی بلندیاں حاصل ہوں گی۔ پروگرام کے آغاز میں یونیورسٹی کلچرل کو آرڈینیٹر اور صدر ڈراما کلب ڈاکٹر معراج احمد نے ثقافتی سرگرمی مرکز کی کارگزاریوں کا مختصر تعارف پیش کیا۔ یونیورسٹی لٹریری کلب کے صدر اور جوائنٹ ڈین بہبودی طلبہ پروفیسر فیروز عالم نے خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر زاہد الحق کی گوناگوں خوبیوں اور علمی و انتظامی فتوحات پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر محمد امتیاز عالم مینٹور یونیورسٹی لٹریری کلب نے مہمان کا جامع تعارف پیش کیا۔ ڈاکٹر طلحہ فرحان مینٹور یونیورسٹی لٹریری کلب نے جلسے کی نظامت کی جب کہ ثانیہ خاتون سیکرٹری لٹریری کلب کے اظہار تشکر پر جلسے کا اختتام عمل میں آیا۔ اس موقعے پر اساتذہ اور طلبہ کی کثیر تعداد موجود تھی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 8 اگست 2026

اردو میڈیم اساتذہ کے لیے ورکشاپ

حیدر آباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد کے مرکز پیشہ ورانہ فروغ برائے اساتذہ اردو ذریعہ تعلیم کے زیر اہتمام اردو میڈیم اساتذہ کے لیے ایک روزہ خصوصی تربیتی ورکشاپ عبد الصمد اردو ہائی اسکول، کھجبرہ کھام گاؤں میں کامیابی کے ساتھ منعقد ہوا۔ اس ورکشاپ میں بلڈھانہ ضلع کے مختلف نگر پریشد، ضلع پریشد اور خانگی اردو مدارس سے وابستہ 125 سے زائد اردو اساتذہ نے شرکت کی۔ ورکشاپ کے پہلے سیشن میں پروفیسر عبد السمیع صدیقی نے 'درس و تدریس میں مصنوعی ذہانت (AI) ٹولز کا استعمال' کے موضوع پر تفصیلی اور عملی رہنمائی فراہم کی۔ انھوں نے موجودہ دور میں مصنوعی ذہانت کی بڑھتی ہوئی اہمیت اور تعلیمی میدان میں اس کے موثر استعمال کے مختلف پہلوؤں سے اساتذہ کو واقف کرایا۔ دوسرے سیشن میں ڈاکٹر کفیل احمد نے 'ہیپی کلاس روم' کے موضوع پر پُرمغز انداز میں رہنمائی کرتے ہوئے کلاس روم کے ماحول کو طلبہ کے لیے خوش گوار، فعال اور موثر بنانے کے مختلف طریقوں پر روشنی ڈالی۔ ورکشاپ کے اختتام پر شرکا نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ دور میں مصنوعی ذہانت تعلیمی میدان کی ایک اہم ضرورت بن چکی ہے۔ اساتذہ نے درس و تدریس میں اے آئی ٹولز کے عملی استعمال کے حوالے سے منعقدہ ورکشاپ کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اس کی بھرپور ستائش کی۔ شرکا نے اس بات کا بھی اظہار کیا کہ ورکشاپ میں فراہم کی گئی عملی رہنمائی سے انھیں اپنی تدریسی سرگرمیوں کو مزید موثر، آسان اور دلچسپ بنانے میں مدد ملے گی۔ ورکشاپ میں شریک تمام اساتذہ کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی جانب سے سرٹیفکیٹ سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 4 ستمبر 2026

جہار کھنڈ

ہندوستانی علمی نظام میں اردو ادب کا کردار اور خدمات

رانچی: رانچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی جانب سے 'ہندوستانی علمی نظام میں اردو ادب کا کردار اور خدمات' کے موضوع پر 22 اگست 2026 کو یونیورسٹی سطح کے

سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر محمد رضوان علی نے کی۔ سیمینار کی سرپرست اور یونیورسٹی کی وائس چانسلر پروفیسر سروج شرما کا خطاب نہایت جامع، فکر انگیز اور عملی نوعیت کا حامل تھا۔

وائس چانسلر پروفیسر سروج شرما نے کہا کہ آج زبان، مذہب، رنگ اور معاشرے کو محدود دائروں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، جب کہ ہندوستانی علمی نظام بند دروازوں کو کھولنے اور انسان کو وسیع تر انسانی شعور اور فطرت کے قریب لے جانے والی روایت ہے۔ اسے صرف ویدک ادب تک محدود کر کے نہیں دیکھا جانا چاہیے، بلکہ ویدانت، اپنشد، بدھ مت کے ادب، صوفی فکر اور ہندوستانی فلسفے کی مختلف روایتوں کو بھی اس کے وسیع تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ البیرونی اور دارا شکوہ جیسے دانش وروں کے ادب کو نئے ماحول اور نئی فکر کے ساتھ دیکھنے کی ضرورت ہے۔ دارا شکوہ نے ہندوستانی فلسفے کو سمجھنے اور اس کے تراجم کے ذریعے ہندوستانی اور اسلامی علمی و فکری روایتوں کے درمیان ایک اہم پل کا کام کیا۔ پروفیسر سروج شرما نے ہندوستان کے قدیم بین الاقوامی روابط کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ پانچویں اور چھٹی صدی سے ہی ہندوستان کے مختلف تہذیبوں اور خطوں کے ساتھ علم اور تجارت کے تبادلے کے روابط قائم رہے ہیں۔ اس سے علمی روایت کو وسعت ملی اور مختلف زبانوں کے باہمی تعلقات مضبوط ہوئے۔ انھوں نے ریاضی، الجبرا اور فلکیات وغیرہ کے شعبوں میں ہندوستانی علمی روایت کے اہم کردار کو بھی اجاگر کیا۔ انھوں نے کہا کہ کبیر، صوفی اور بھگتی روایت کے شعرا، رحیم اور رسخان نے ہندوستانی معاشرے کے مشترکہ تہذیبی شعور کو مالا مال کیا۔ ان تخلیق کاروں کے ادب میں انسانیت، محبت اور وحدانیت کا وسیع پیغام نظر آتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادب اور شاعری کے اعتبار سے انھیں اردو اور بنگلہ دونوں زبانیں بے حد پسند ہیں۔

پروفیسر سروج شرما نے خصوصی طور پر کہا کہ ہندوستانی علمی روایت کو کسی ایک مذہب یا طریقہ عبادت کے ساتھ جوڑ کر نہیں دیکھا جانا چاہیے۔ اس موضوع پر سنجیدہ اور سائنسی تحقیق کی ضرورت ہے۔ انھوں نے گنگا کے پانی کی تقدس، ورت، روزہ اور نماز جیسی روایتوں کے سماجی، جسمانی اور روحانی پہلوؤں پر بھی غور کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ آج کے دور میں فکری شعور کو فروغ دیتے ہوئے ہندوستانی علمی روایت کو نئے مباحث اور تحقیق کے ذریعے مزید مالا مال کیا جانا چاہیے۔

سیمینار کے دوران اردو ادب کی دو اہم کتابوں نئے تنقیدی زاویے (مرتب: روغلا سکندر)، وقتِ سفر (شکیل قمر) کی رسمِ رونمائی رانچی یونیورسٹی کی وائس چانسلر اور سیمینار کی سرپرست پروفیسر سروج شرما اور مہمانِ خصوصی پروفیسر ارتضیٰ کریم کے دستِ مبارک سے انجام پائی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے سابق ڈائریکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اردو ادب کو ہندوستانی علمی روایت کا لازمی حصہ قرار دیتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ کبیر، رس کھان، امیر خسرو اور نظیر اکبرآبادی سمیت متعدد شعرا و ادبا کا ادب ہندوستانی علمی روایت سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ 'ہندوستانی علمی روایت' کا مباحثہ اگرچہ موجودہ دور میں خاص طور پر سامنے آیا ہے، لیکن ان تخلیق کاروں نے صدیوں قبل ہی مذہبی رواداری، انسانی اتحاد اور تہذیبی ہم آہنگی کی بات کہہ دی تھی۔ اگرچہ ہم ترقی کرتے کرتے حقیقی ذہانت سے مصنوعی ذہانت تک آ گئے ہیں اور اصل کی بجائے نقل یعنی Actual سے Vertual تک آ گئے ہیں۔ اس کے باوجود ہمارے ہندوستانی نظام کا جو علمی سلسلہ ہے وہ بہت مضبوط دیرپا ہے۔ اسی لیے ہندوستانی نظامِ تعلیم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

سیمینار کی صدارت کرتے ہوئے شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر محمد رضوان علی نے وید، ویدانت، اپنشد، قبائلی فلسفہ، ویدک ادب اور بدھ مت کے ادب کی مختلف علمی روایتوں کا جائزہ پیش کیا۔ انھوں نے ہندوستانی فلسفے کی مختلف روایتوں کو صوفی فکر سے مربوط کرتے ہوئے سوامی وویکانند کے 'پران' کے تصور اور مرزا غالب کی شاعری کے حوالے پیش کیے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی علمی روایت کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی وسعت، ہم آہنگی اور مکالماتی مزاج ہے۔

اس موقعے پر شعبہ اردو کے سابق صدر ڈاکٹر منظر حسین نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے ہندوستانی علمی روایت کے مختلف پہلوؤں اور اردو ادب کی گراں قدر میراث پر روشنی ڈالی۔ سیمینار میں یونیورسٹی کے متعدد اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور طلبہ نے شرکت کی۔ پروگرام میں ڈاکٹر اعجاز احمد نے موضوع کا تعارف پیش کیا، جبکہ ڈاکٹر ارشد اسلم نے کلماتِ تشکر پیش کیے۔

پریس ریلیز: شعبۂ اردو، رانچی یونیورسٹی، 25 اگست 2026

اعزاز و اکرام

ڈاکٹر مظفر کاظمی نیشنل ایوارڈ 2026

میرٹھ: شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کی ایوارڈ کمیٹی نے ہر سال شعبے کی طرف سے دیے

جانے والے ڈاکٹر منظر کاظمی نیشنل ایوارڈز کا اعلان کر دیا ہے۔ پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے بتایا کہ امسال بارہواں ڈاکٹر منظر کاظمی نیشنل ایوارڈ برائے تخلیق معروف فکشن نگار وحشی سعید کو اور ڈاکٹر منظر کاظمی نیشنل ایوارڈ برائے تنقید پروفیسر نذیر احمد ملک کو پیش کیے

جائیں گے۔ یہ ایواڈ 26 ستمبر 2026 کوسری نگر میں ادبی تقریب کے دوران دیے جائیں گے۔ جن میں نشان یادگار، سرٹیفکٹ، شال اور روپے گیارہ گیارہ ہزار ایوارڈیز کو پیش کیے جائیں گے۔ واضح ہو کہ شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ 2015 سے معروف ومقبول جدید افسانہ نگار ڈاکٹر منظر کاظمی کے نام پر دو قومی ایوارڈز تخلیق اور تنقید دیتا آرہا ہے۔ یہ ایوارڈ ان ادیبوں کو دیا جاتا ہے جنھوں نے فکشن یا فکشن تنقید میں نمایاں خدمات انجام دی ہوں۔ اب تک یہ ایوارڈ سلام بن رزاق، نورالحسنین، بشیر مالیرکوٹلوی، دیپک بدکی، احمد رشید، پرویز شہریار، قدوس جاوید، ارتضیٰ کریم، صغیر افراہیم، خورشید حیات، ہمایوں اشرف، شہاب ظفر اعظمی، نعیم انیس، اشتیاق سعید، اور رفیق جعفر، وغیرہ کو دیا جا چکا ہے۔ امسال یہ ایوارڈ معروف تخلیق کار وحشی سعید جن کے قلم نے ناولوں میں پتھر پتھر آئینے، ایک موسم کا خط، قحط، خوف اور محبت، عجب زندگی غضب موت، جائز ناجائز، فطرت محبت ندامت اور وحشی محبت اور ان کے افسانوی مجموعوں میں سڑک جارہی ہے، کنوارے الفاظ کا جزیرہ، خواب حقیقت، ماضی اور حال (تین جلدوں میں) آسماں میرے مٹھی میں، ارسطو کی واپسی، آخر کب تک، اور شیشے کا سمندر جیسی تخلیقات لکھ کر اردو دنیا میں اپنی مستحکم شناخت قائم کی ہے اور معروف ومقبول ناقد پروفیسر نذیر احمد ملک جن کی تصنیفات میں کشمیری سرمایہ الفاظ کے سرچشمے۔ اردو رسم الخط: ارتقا اور جائزہ، ادب، ادبی تھیوری اور اسلوبیات، موج رنگ، اردو اور کشمیر کے لسانیاتی رشتے اور رابطے جیسی اہم کتب لکھ کر ادبی دنیا میں انفراد قائم کیا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' 7 اگست 2026

پروفیسر سید سراج الدین اجملی

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے پروفیسر سید سراج الدین اجملی کو 10 اگست 2026 سے

آئندہ تین سال کی مدت کے لیے شعبۂ اردو کا چیئرمین مقرر کیا گیا ہے۔ پروفیسر اجملی ایک معروف محقق و دانشور اور ممتاز اردو شاعر ہیں۔ انھوں نے کانپور یونیورسٹی سے بی اے اور دہلی یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ 1997 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بحیثیت لیکچرر تقرری سے قبل انھوں نے دہلی یونیورسٹی کے ذاکر حسین پی جی ایوننگ کالج میں بطور گیسٹ فیکلٹی خدمات انجام دیں۔ پروفیسر اجملی کے مستعد تحقیقی مقالے، تبصرے اور ادبی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی ایک کتاب ترقی پسند تحریک اور اردو غزل، شائع ہو چکی ہے۔ ان کی تحقیقی دلچسپی کے شعبوں ہوں میں کلاسیکی اور جدید شاعری، تصوف اور اردو ادب کی تاریخ شامل ہیں۔ انھیں متعدد اعزازات سے نوازا جا چکا ہے، جن میں تخلیقی تحریر کے لیے ہریش چند کٹھپالیہ گولڈ میڈل، دہلی اردو اکیڈمی ٹاپرس ایوارڈ، کتاب کے لیے دہلی اردو اکیڈمی ایوارڈ، شکھر ساہتیہ سنستھان کا شکھر شری ایوارڈ اور ابن سینا اکیڈمی کے ایوارڈ شامل ہیں۔ پروفیسر اجملی نے اے ایم یو کی ادبی وثقافتی سرگرمیوں میں بھی فعال کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے کئی برس تک کلچرل ایجوکیشن سینٹر کے کوآرڈینیٹر اور یونیورسٹی ڈیبیٹنگ اینڈ لٹریری کلب کے صدر کے طور پر خدمات انجام دیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 9 اگست 2026

پروفیسر رحمان مصور

نئی دھلی: ملک کے ممتاز ادبی جریدے ہنس نے پروفیسر رحمان مصور کو 2026 کے، راجندر یادو ہنس غزل

سمان، سے سرفراز کیا ہے۔ انھیں یہ باوقار اعزاز دہلی کے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں جمعہ کی شام منعقد ایک باوقار تقریب میں پیش کیا گیا۔ مشہور شاعر پروفیسر شہپر رسول نے انھیں یہ اعزاز اور توصیف نامہ سونپا۔ توصیف نامے میں فن، زبان اور مجموعی تاثر کے حوالے سے پروفیسر رحمان مصور کے شعری اختصاص کا اعتراف کیا گیا۔ اس تقریب میں ادبی دنیا کی سرکردہ شخصیات شامل رہیں۔ پروفیسر رحمان مصور نے اپنے لہجے کی انفرادیت اور مضامین کی ندرت سے ادبی دنیا میں نمایاں شناخت بنائی ہے۔ غزل کے مباحث میں ان کے تجربات اور احساسات کی ترجمانی کا خوبصورت رنگ ان کی بے پناہ تخلیقیت کا پتہ دیتے ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 30 اگست 2026

ڈاکٹر رخشندہ روحی

دیوبند: دیوبند سے تعلق رکھنے والے معروف مترجم و افسانہ نگار ڈاکٹر رخشندہ روحی مہدی کو ہریانہ ساہتیہ ایوم سنسکرتی اکیڈمی کی جانب سے 'اردو ترجمہ نگاری سمان'

سے نوازا گیا۔ یہ اعزاز گذشتہ دنوں دادا لکشمی چند اسٹیٹ یونیورسٹی آف پرفارمنگ اینڈ ویزول آرٹس، روہتک کے آڈیٹوریم میں منعقدہ تقریب میں ہریانہ کے وزیر اعلیٰ نائب سنگھ سینی کے ہاتھوں ملک بھر کے 81 ممتاز قلمکاروں کو مختلف زمروں میں ایوارڈز سے نوازا۔ ڈاکٹر رخشندہ روحی مہدی کو اردو ترجمہ نگاری کے میدان میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں شال، سند اعزاز اور ایک لاکھ روپے کی انعامی رقم پیش کی گئی۔ ہریانہ ساہتیہ ایوم سنسکرتی اکیڈمی ہر سال قومی سطح پر ہریانوی، ہندی، انگریزی، پنجابی، سنسکرت اور اردو زبان کے اہل قلم کو ان کی ادبی خدمات پر اعزازات سے نوازتی ہے۔ ڈاکٹر رخشندہ روحی مہدی اس سے قبل بھی متعدد اہم ادبی اعزازات حاصل کر چکی ہیں، ادبی میدان میں ان کی خدمات نہایت وسیع ہیں۔ اعزاز ملنے پر دیوبند کی ممتاز ادبی وسماجی شخصیات نے ڈاکٹر رخشندہ روحی مہدی کو مبارکباد پیش کی۔ مبارکباد دینے والوں میں معروف شاعر ڈاکٹر نواز دیوبندی، یوپی اردو اکیڈمی کمیٹی کے سکریٹری ڈاکٹر عبید اقبال عاصم اور نامور قلمکار سید وجاہت شاہ کے نام بطور خاص لیے جاسکتے ہیں۔ اس موقعے پر معروف قلمکار ڈاکٹر قدسیہ انجم، سماجی رہنما ارم عثمانی، سماجی و سیاسی رہنما ڈاکٹر شازیہ ناز سمیت دیگر ادبی وسماجی شخصیات نے بھی اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 7 اگست 2026

رسم اجرا

ٹرائمف آف دی انڈین ریپبلک: مائی لائف، مائی سٹرگلس

نئی دہلی: وزیراعظم نریندر مودی کے بدست سابق صدر رام ناتھ کووند کی سوانح عمری 'ٹرائمف آف دی انڈین

ریپبلک: مائی لائف، مائی اسٹرگلس' نامی کتاب کا اجرا عمل میں آیا۔

اس موقعے پر معززین سے خطاب کرتے ہوئے برلا نے کہا کہ سابق صدر جمہوریہ رام ناتھ کووند کی سوانح عمری، جو اعلیٰ آئینی نظریات کا مظہر ہے، عزم، جدوجہد اور کامیابیوں کی ایک متاثر کن کہانی ہے۔ تعلیم کے حصول کے دوران مسٹر کووند کو اپنی ابتدائی زندگی میں درپیش مشکلات اور چیلنجوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ایک عاجز اور معاشی طور پر کمزور پس منظر سے ملک کے اعلیٰ ترین آئینی عہدے تک کا سفر ان کے غیر معمولی عزم کو ظاہر کرتا ہے اور یہ عزم آنے والی نسلوں کے لیے ایک لازوال ترغیب کا ذریعہ رہے گا۔ مسٹر برلا نے مزید کہا کہ مسٹر کووند نے آئینی اقدار کے تئیں اپنی غیر متزلزل وابستگی کے ذریعے ایک وکیل کے طور پر ایک انمٹ نشان چھوڑا۔

گورنر کے طور پر مسٹر کووند کے دور کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر برلا نے کہا کہ انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے میدان میں شفافیت، معیار اور تکنیکی اختراع کو ایک نئی سمت دی۔ ہندستان کے صدر کے طور پر انھوں نے ہندستانی جمہوریت کی آئینی روایات کو مضبوط کرتے ہوئے، سماجی ہم آہنگی اور جامع ترقی کے لیے ایک غیر متزلزل عزم کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ کئی ممالک کے اپنے دوروں کے ذریعے انھوں نے ہندوستان کے بین الاقوامی سفارتی تعلقات کو مضبوط بنانے میں بھی اپنا حصہ ڈالا۔ مسٹر برلا نے یہ بھی کہا کہ کووڈ 19 وبائی مرض کے پیش نظر، مسٹر کووند نے ہمت، اتحاد اور ملک کے لوگوں میں اعتماد پیدا کیا اور راشٹرپتی بھون کو عوام کے لیے مزید قابل رسائی بنایا۔ انھوں نے اسے مسٹر کووند کی اہم کامیابیوں میں سے ایک قرار دیا۔

لوک سبھا کے اسپیکر نے مزید کہا کہ صدر کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی مسٹر کووند اپنی سوچ، عوامی زندگی میں بھرپور تجربہ اور سماجی انصاف کے لیے اپنی وابستگی کے ذریعے ملک، آئین اور سماج کے لیے اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔ انھوں نے یقین ظاہر کیا کہ 'ٹرائمف آف دی انڈین ریپبلک: مائی لائف، مائی اسٹرگلس' کے ذریعے قارئین مسٹر کووند کی زندگی کے اہم واقعات کے بارے میں جانیں گے، جو انھیں عوامی زندگی میں بامعنی کردار ادا کرنے کی ترغیب دیں گے۔ خطاب کے اختتام پر، مسٹر برلا نے کتاب کی اشاعت پر مسٹر رام ناتھ کووند کو دلی مبارکباد اور نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 13 اگست 2026

آگ کے جگنو

لکھنؤ: ابھرتی ہوئی فکشن نگار ڈاکٹر حمیرا عالیہ کے افسانوی مجموعے 'آگ کے جگنو' کا رسم اجرا 14 اگست کو

شام 5 بجے آل انڈیا کیفی اعظمی اکیڈمی، لکھنؤ میں صدر شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی پروفیسر عباس رضا نیر کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ تقریب کی صدارت بھی پروفیسر عباس رضا نیر نے کی، جب کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس کے ایسوی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر عمیر منظر نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس پروگرام میں استقبالیہ کلمات قمرالزماں ندوی نے پیش کیے۔ ڈاکٹر عمیر منظر نے آگ کے جگنو پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ان کے افسانوں کی خاص بات اسلوب کی برجستگی اور جملوں کا اختصار ہے۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر عباس رضا نیر نے کہا کہ حمیرا عالیہ کے افسانوں کا کینوس بہت اعلیٰ ہے، ان کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے اسے ہم بخوبی محسوس کر سکتے ہیں۔ مہمان اعزازی پروفیسر ریشماں پروین، کھن کھن جی گرلس ڈگری کالج نے موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ حمیرا عالیہ کے افسانوں میں زبان و بیان کی شگفتگی قابل تعریف ہے۔ مہمانِ اعزازی ڈاکٹر عشرت ناہید، ایسوی ایٹ پروفیسر، مانو کیمپس لکھنؤ نے اپنے مقالے میں کہا کہ حمیرا عالیہ نے اپنے افسانوں میں عورت کے روایتی تصور سے انحراف کرتے ہوئے اسے نئے زمانے کے خیالات کے مطابق پیش کیا ہے۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر سہیل وحید نے افسانوی مجموعے کی زبان و بیان پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ حمیرا عالیہ کے افسانے اپنی تخلیقیت کے باعث متاثر کرتے ہیں۔ امریکن انسٹی ٹیوٹ آف انڈین اسٹڈیز کے ڈائرکٹر ڈاکٹر احتشام خان نے کہا کہ حمیرا عالیہ کے افسانوں میں جغرافیائی تفصیلات کی درستگی ان کے حقیقی پن کو مزید اجاگر کرتی ہے، جب کہ موضوعاتی اعتبار سے بھی ان کی کہانیاں انفرادیت رکھتی ہیں۔ جامعہ ملا اسلامیہ کے ریسرچ اسکالر ایس ایم حسینی نے کہا کہ ڈاکٹر حمیرا کے افسانوں میں مختلف جذبات کی پیچیدہ نفسیات پوری شدت کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے۔ ڈاکٹر شاہد جمال، لکچرار ارم گرلس ڈگری کالج لکھنؤ نے اپنے مقالے میں کہانی کیا ہے؟، کہانی کیسے لکھی جائے اور اس کا آغاز و انجام کیسا ہو؟، جیسے فنی اور تکنیکی پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو کی۔ تقریب

میں شہر کے متعدد معززین، ادبا، شعرا، صحافیوں اور ادبی حلقوں سے وابستہ شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'ہماراسماج' دہلی، 17 اگست 2026

'غالب کے دیوان کی پہچان' اور 'تقسیم کی ہولناکی'

نئی دہلی: ہندستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی اور ناشر کی جانب سے ایس ایل 1 میٹنگ ہال، کمرہ نمبر 212 میں سلطان احمد کی ہندی کتاب 'غالب کے دیوان کی پہچان' اور ہری لیش رائے کی کتاب 'تقسیم کی ہولناکی: ہندستانی افسانوی ادب' کی رسم رونمائی اور مذاکرے کا انعقاد کیا گیا۔ مذاکرے میں دونوں کتابوں کے ادبی، فکری، تاریخی اور تہذیبی پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا۔ پروفیسر دیویندر چوبے نے ہری لیش رائے کی کتاب 'تقسیم کی ہولناکی: ہندستانی افسانوی ادب' پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ تقسیم ہند محض سیاسی یا جغرافیائی واقعہ نہیں تھا بلکہ اس کے اثرات انسانی زندگی، سماج، تہذیب، اجتماعی حافظے اور ادبی شعور پر بھی مرتب ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ ہجرت، تشدد، بے گھری اور شناخت کے مسائل نے ہندستانی ادب کو گہرائی سے متاثر کیا اور افسانوی ادب نے ان تجربات کو انسانی کرداروں اور جذبات کے ذریعے محفوظ کیا۔

ہری لیش رائے نے سلطان احمد کی کتاب 'غالب کے دیوان کی پہچان' پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ مصنف نے غالب کے اشعار کی تشریح میں ہر لفظ کی معنوی جہات پر خصوصی توجہ دی ہے۔ انھوں نے سلطان احمد کی محنت کو کتاب کا نمایاں وصف قرار دیا۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے سابق چیئر پرسن پروفیسر انور پاشا نے سلطان احمد کی کتاب پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ غالب کا اردو دیوان مختصر ہونے کے باوجود معنوی اعتبار سے غیر معمولی وسعت رکھتا ہے اور ان کی شاعری میں ماضی، حال اور مستقبل کے عناصر موجود ہیں۔ انھوں نے غالب کی شاعری میں فکری وسعت، روشن خیالی اور جدید فکر کی خصوصیات کو نمایاں کرتے ہوئے کہا کہ غالب نے فکر، فلسفے اور انسانی وجود سے متعلق سوالات کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر رشی کمار شرما اور ڈاکٹر شیو پرکاش تھے۔ نظامت پروفیسر دیو شنکر نوین نے کی، جب کہ استقبالیہ کلمات پروفیسر سدھیر پرتاپ سنگھ نے پیش کیے۔ اظہار تشکر ہریش چندر شرما نے کیا۔ پروگرام میں اردو، ہندی اور دیگر مراکز سے وابستہ اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور طلبہ وطالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 اگست 2026

معراج سخن

مرادآباد: سرزمین شہر جگر، مرادآباد کے معروف نعت گو شاعر معراج انور قدیری مرحوم کے نعتیہ دیوان 'معراج سخن' کا اجرا مرکز اردو ادب و تحقیق میں عمل میں آیا۔ تقریب کی نظامت ڈاکٹر محمد آصف حسین نے کی۔

عالمی شہرت یافتہ شاعر و معروف ناظم مشاعرہ گوہر زادہ منصور عثمانی نے صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ معروف محقق و ناقد ڈاکٹر محمد آصف حسین نے بڑی عرق ریزی سے معراج انور قدیری کا دیوان ترتیب دے کر شائع کیا۔ انھوں نے کہا کہ کسی ادیب یا شاعر کے انتقال کے بعد اس کی تصنیف کی اشاعت ایک بہترین خراج عقیدت و محبت ہے۔ مرادآباد کے بزرگ اور سینئر شاعر انور کیفی نے کہا کہ معراج انور قدیری ایک خوش اخلاق انسان اور عمدہ شاعر تھے۔ ان کی نعتوں میں مفاہیم کے اعتبار سے ندرت پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر محمد آصف حسین نے ان کا دیوان ترتیب دے کر بہترین خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ معروف شاعر قمر مرادآبادی کے صاحب زادے مشہور خطاط اور شاعر وہاج الحق کاشف نے کہا کہ مرکز اردو ادب و تحقیق جس مقصد کے لیے قائم ہوا تھا، خوشی ہے کہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہو رہا ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 11 اگست 2026

بجھی نہ من کی پیاس

نئی دہلی: جامعہ نگر میں معروف شاعر شاہد انور کے دوہوں پر مشتمل مجموعے 'بجھی نہ من کی پیاس' کا اجرا تسمیہ آڈیٹوریم میں ہوا۔ تقریب کی صدارت تسمیہ ایجوکیشنل، سوشل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر سید فاروق نے کی، جب کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر فاروق بخشی، ڈاکٹر سجاد سید اور راز بہاری پانڈے نے شرکت کی۔ اس موقعے پر پروفیسر رحمان مصور نے دوہوں کی تاریخ، ارتقا اور شاہد انور کے دوہوں کی معنویت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ مہمانان خصوصی اور صدر محفل ڈاکٹر سید فاروق نے شاعری کی اہم صنف دوہوں پر مشتمل مجموعے کے لیے شاہد انور کو مبارکباد پیش کی۔ بعد ازیں محفل شعر و سخن کا بھی انعقاد کیا گیا، جس کی نظامت کے فرائض معین شاداب نے انجام دیے۔

بزم شاعرہ میں سلیم شیرازی، ڈاکٹر سجاد سید، پروفیسر فاروق بخشی، فاروق ارگلی، عاصم پیرزادہ، پروفیسر رحمان مصور، عرفان اعظمی، شاہد انجم، شاہد انور، رؤف رامش، قمر انجم، کرنل رویندر رفیق، انس فیضی، شاہد اخلاق، فیصل حاشر، مہدی زمن، عمران راہی، حبیب سیفی، ریشمہ زیدی، زرین صدیقی اور ماریا عثمانی نے اپنے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 اگست 2026

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی: اے ہسٹری

علی گڑھ: ممتاز مؤرخ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر ایمیریٹس پروفیسر عرفان حبیب نے سرسید اکیڈمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں منعقدہ ایک تقریب کے دوران ڈاکٹر شمیم اختر، ڈائرکٹر، مرکز برائے تعلیم بالغاں کی تصنیف 'علی گڑھ مسلم یونیورسٹی: اے ہسٹری' کا اجرا پرووائس چانسلر پروفیسر محمد محسن خان اور دیگر معزز شخصیات کے ہمراہ کیا۔ اے ایم یو وائس چانسلر پروفیسر نعیمہ خاتون نے بھی تقریب میں شرکت کی اور مصنف کو مبارکباد پیش کی۔ اس موقع پر پروفیسر عرفان حبیب نے اظہار خیال کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام سے متعلق مختلف واقعات بیان کیے اور تقسیم ہند کے دور میں یونیورسٹی کی بقا اور تحفظ کے سلسلہ میں حکومت ہند کی کاوشوں کی بطور خاص ستائش کی۔ انھوں نے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ مختلف پہلوؤں سے لکھی گئی ہے تاہم یہ تصنیف اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں یونیورسٹی کے کردار اور انتظام و انصرام کے پہلوؤں کا جامع احاطہ کیا گیا ہے۔

اپنے صدارتی کلمات میں سابق قائم مقام وائس چانسلر پروفیسر محمد گلریز نے کہا کہ اے ایم یو کے قیام اور اس کی ترقی میں بے شمار افراد نے قربانیاں دی ہیں، جس کے سرخیل سرسید احمد خاں تھے۔ انھوں نے کہا کہ علی گڑھ تحریک کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے ہر محاذ پر پہل کی اور خشت اول رکھ کر ملک میں جدید تعلیم کی توسیع کا کارنامہ انجام دیا۔ انھوں نے کہا کہ علی گڑھ تحریک کے

امتیازات لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہیں جنھیں سامنے لائے جانے کی ضرورت ہے۔ اس اعتبار سے ڈاکٹر شمیم اختر کی تصنیف ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ تقریب کے مہمان اعزازی پرووائس چانسلر پروفیسر محمد محسن خان نے اپنے خطاب میں کہا کہ علی گڑھ تحریک نے ملک کے علمی و سماجی منظر نامہ کو مالا مال کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ تاریخ مستقبل کے لیے رہنمائی کرتی ہے اور اے ایم یو کی تاریخ کو ترتیب دے کر ڈاکٹر شمیم اختر نے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ شعبۂ تاریخ کے سابق چیئرمین پروفیسر سید علی ندیم رضاوی نے کتاب کا تنقیدی تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ تصنیف ایک علمی، آئینی اور تعلیمی ادارے کے طور پر اے ایم یو کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔ پروفیسر شافع قدوائی، ڈائرکٹر، سرسید اکیڈمی نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی: اے ہسٹری'' یونیورسٹی کے انتظام و انصرام کے پہلوؤں کا خاطر خواہ جائزہ لیتی ہے۔ کتاب میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی محض ایم اے او کالج کی تبدیل شدہ شکل نہیں بلکہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن، ایم اے او کالج اور اے ایم یو فنڈ کمیٹی تین اکائیاں تھیں جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام میں معاون ہوئیں۔ ڈپٹی ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شاہد نے اظہار تشکر کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر حسین حیدر نے انجام دیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 7 اگست 2026

سبق اردو

نئی دہلی: ادبی ماہنامہ 'سبق اردو' کے پروفیسر کوثر مظہری خصوصی نمبر کی رسم اجرا ایک باوقار ادبی تقریب میں منعقد ہوئی۔ اس رسالے کے مدیر مشہور ادیب و شاعر اور

صحافی دانش الہ آبادی اور اس خصوصی شمارے کے مہمان مدیر کے طور پر ڈاکٹر خالد مبشر ہیں۔ غالب اکیڈمی میں پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے جلسے کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ کوثر مظہری کی ادبی خدمات کا مطالعہ اس لیے ضروری ہے کہ ان کی تخلیق وتنقید نئی نسل کے لیے ایک بیش قیمت فکری سرمایہ ہے۔ ان کی شاعری، فکشن، تنقید اور ترجمہ اپنے عہد، معاشرے اور تہذیب کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ تقریب کو خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ کوثر مظہری میرے چھوٹے بھائی اور دیرینہ دوست ہیں۔ وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ انھیں اپنی مٹی، زبان اور تہذیب سے شدید محبت ہے۔ مہمان اعزازی ڈاکٹر اشفاق احمد عارفی نے کہا کہ کوثر مظہری کی شخصیت مقناطیسی ہے۔ وہ ہر قسم کی مصنوعیت اور اوڑھی ہوئی علمیت سے پاک ہیں۔

پروفیسر شہزاد انجم نے کوثر مظہری کی شخصیت اور ادبی خدمات کے حوالے سے پر مغز گفتگو کی۔ مہمان مقرر پروفیسر احمد محفوظ نے پروفیسر کوثر مظہری کی علمی و ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی تصانیف، ان کی علمی سنجیدگی اور وسیع مطالعے کی غمازی کرتی ہیں۔ پروفیسر محمد کاظم نے پروفیسر کوثر مظہری کی شخصی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ کوثر مظہری جرأت و جسارت اور بے خوفی و بیباکی کا ایک روشن استعارہ ہیں۔ انھوں نے ادب میں بھی اس کا خیال رکھا ہے۔

ناظم جلسہ جناب معین شاداب نے کوثر مظہری کی شخصیت اور فن پر مفصل روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ کوثر مظہری کی تنقید اردو کے ایک منفرد جہت سے آشنا کرتی ہے۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر خالد مبشر نے کہا کہ استاد گرامی کوثر مظہری پر اس خصوصی شمارے کی ادارت سونپنے کے لیے میں رسالے کے مدیر دانش الہ آبادی کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ اس شمارے کی ادارت میرے لیے ایک بڑی سعادت ہے۔ تقریب کا اختتام ڈاکٹر خان رضوان کے اظہار تشکر پر ہوا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 7 اگست 2026

شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ اقبال

لکھنؤ: دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہمان خانے میں دارالعلوم کے استاذ ڈاکٹر عبید الرحمٰن ندوی کی نئی کتاب 'شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ اقبال' کی رسم رونمائی ناظم ندوۃ العلماء

مولانا سید بلال عبدالحئی حسنی ندوی اور دیگر علما کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس موقع پر ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا، جس میں اساتذہ، علما اور دیگر معززین نے شرکت کی۔ تقریب میں ندوۃ العلماء کے سینئر استاذ مولانا علاء الدین ندوی نے کتاب اور صاحب کتاب کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر علامہ اقبال ایسی شخصیت ہیں جن پر بے شمار تحقیقی اور تجزیاتی کام ہو چکے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ندوۃ العلماء کے استاذ ڈاکٹر عبید الرحمٰن ندوی اردو اور انگریزی زبان میں متعدد کتابوں کے مصنف و مؤلف ہیں اور انھوں نے شاعر مشرق علامہ اقبال پر یہ مختصر مگر جامع کتاب پیش کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ کتاب کی نمایاں خصوصیت اس کا اختصار اور جامعیت ہے۔ تقریب کی صدارت کرتے ہوئے ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید بلال عبدالحئی حسنی ندوی نے علامہ اقبال اور مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے حوالے سے اہم اور مفید باتیں بیان کیں۔ انھوں نے کہا کہ مولانا جب عرب دنیا میں گئے تو انھوں نے محسوس کیا کہ وہاں بیشتر لوگ رابندر ناتھ ٹیگور کے نام سے تو واقف ہیں، لیکن ڈاکٹر علامہ اقبال کے نام اور ان کی فکر سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اسی وقت انھوں نے عزم کیا کہ وہ علامہ اقبال کا عربی زبان میں تعارف کرائیں گے۔ چنانچہ ان کی اس کوشش کے نتیجے میں علامہ اقبال پر عربی زبان میں معروف تصنیف 'روائع اقبال' وجود میں آئی، جس کا اردو ترجمہ 'نقوش اقبال' اہل علم و ادب میں مقبول ہے۔ مولانا سید بلال عبدالحئی حسنی ندوی نے ڈاکٹر عبید الرحمٰن ندوی کی اس تصنیف پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کتاب کے مندرجات کو سراہا اور اسے مفید علمی کاوش قرار دیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 26 اگست 2026

'امکانات'

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نہرو گیسٹ ہاؤس میں سہ ماہی مجلّہ 'امکانات' کی تقریب رونمائی کے موقعے پر پروفیسر اختر الواسع نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ دور میں ایسے لوگ ملک وملت کی تعمیر کا کام زیادہ بہتر انداز سے انجام دے سکتے ہیں جو قدیم و جدید دونوں دھاروں سے وابستہ ہوں۔ آج 'امکانات' نامی جس رسالے کی تقریب اجرا میں ہم شریک ہیں، اس کی ٹیم میں اکثر لوگ ایسے ہیں جو قدیم وجدید اداروں کا سنگم ہیں۔

اس موقعے پر پروفیسر اقتدار محمد خان، ڈاکٹر ذیشان احمد مصباحی، ڈاکٹر جاوید جمیل، مولانا سید سیف الدین اصدق چشتی، پروفیسر خواجہ اکرام الدین احمد اور پروفیسر مشاہد حسین رضوی نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تقریب میں مکالمے کا ایک سیشن بھی رکھا گیا، جس میں ڈاکٹر شعیب رضا، شبلی منظور، عبدالعلام، ڈاکٹر مظفر حسین غزالی اور دیگر نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ شکیل الرحمٰن نے کلمات تشکر پیش کرتے ہوئے مہمانان کرام، شرکائے تقریب اور تمام معاونین کا شکریہ ادا کیا۔ صدر جلسہ مولانا حسن سعید صفوی عثمانی کی دعا پر تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ تقریب اجر کے خصوصی شرکا میں ڈاکٹر محمد ارشد، ڈاکٹر مفتی محمد مشتاق تجاروی، ڈاکٹر محمد عمر فاروق، ڈاکٹر خورشید آفاق، ڈاکٹر جنید حارث، ڈاکٹر مسیح اللہ، ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن ندوی، مولانا ظفر الدین برکاتی، اشرف بستوی اور نور اللہ فلاحی سمیت دیگر شخصیات شامل تھیں۔ اس تقریب میں نظامت مولانا محمد فیضان عزیزی نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اگست 2026

'امپارٹمینٹ اتھنو بوٹانیکل پلانٹس آف اورنگ آباد (ایم ایس) سکینڈ ایڈیشن'

اورنگ آباد: شیواجی کالج، ہکاپور، پکسی، ضلع اورنگ آباد

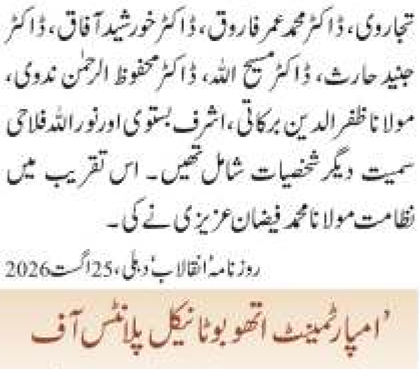

کے پرنسپل وہ مولانا آزاد کالج کے سابق پروفیسر اور معروف ماہر نباتات و محقق پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ناصر کی 53 ویں کتاب 'امپارٹمینٹ اتھنو بوٹینیکل پلانٹس آف اورنگ آباد (ایم ایس) سکینڈ ایڈیشن' کا اجرا کالج کے سمینار ہال میں ایک پروقار تقریب کے دوران عمل میں آیا۔ کتاب کی رونمائی اکھیل لوک کلیان شکشن پرسارک منڈل کے صدر راجندر کھنڈ لوال کے ہاتھوں انجام پائی۔ پروفیسر رفیع الدین ناصر کی یہ 53 ویں تصنیف ہے، جس میں انھوں نے اورنگ آباد اور اس کے اطراف پائے جانے والے 250 سے زائد اہم نباتاتی انواع کا تفصیلی تعارف، ان کے روایتی استعمالات، افادیت اور فوائد کو تحقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف نباتیات اور اتھنو بوٹنی کے طلبہ و محققین کے لیے مفید ہے بلکہ مقامی نباتاتی دولت اور روایتی علمی ورثے کو محفوظ کرنے کی سمت میں بھی ایک اہم کاوش ہے۔ اس موقعے پر تقریب کے صدر راجندر کھنڈلوال نے پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ناصر کی علمی و تحقیقی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ ان کی مسلسل تحقیقی سرگرمیاں قابل تحسین ہیں۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ ڈاکٹر ناصر مستقبل میں بھی اسی جذبے اور تسلسل کے ساتھ علمی و تحقیقی خدمات انجام دیتے رہیں گے۔

روزنامہ 'آگ' دہلی، 31 اگست 2026

وفیات

مینا عرفان

لکھنؤ: معروف شاعر عرفان صدیقی کی صاحب زادی، اردو کی نیوز ریڈر، مترجم اور افسانہ نگار مینا عرفان کا

16 ستمبر 2026 کو لکھنؤ میں انتقال ہوگیا، وہ تقریباً 60 برس کی تھیں۔ وہ گذشتہ تقریباً ایک برس سے متعدد بیماریوں میں مبتلا تھیں۔ ان کی تدفین 17 ستمبر کی شام دادا میاں کے قبرستان میں عمل میں آئی۔ مینا عرفان 7 اگست 1967 میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے لال باغ گرلز کالج اور اس کے بعد آئی ٹی کالج سے تعلیم حاصل کی۔ مینا عرفان آکاش وانی لکھنؤ کے علاقائی خبری شعبے سے وابستہ تھیں، جہاں وہ نیوز ریڈر کم ٹرانسلیٹر کے طور پر خدمات انجام دیتی تھیں۔ آکاش وانی لکھنؤ سے روزانہ کا اردو کا واحد بلیٹن نشر ہوتا ہے۔ وہ ایک اچھی اور باصلاحیت مترجم تھیں۔ انھوں نے پرتل جوشی کے دو سفرناموں کا بھی اردو میں ترجمہ کیا، جن میں سے ایک سفرنامہ روزنامہ 'آگ' لکھنؤ میں 9 قسطوں میں شائع ہوا۔ اس کے ذریعے اردو کے بہت سے قارئین کو ہندوستان کے دور دراز شمال مشرقی خطے کی تہذیب، ثقافت اور زندگی سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ مینا عرفان ایک افسانہ نگار بھی تھیں۔ اسی سال ان کے افسانوں کا مجموعہ 'نیم مردہ خواب' شائع ہوکر منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں شامل افسانوں کو پروفیسر انیس اشفاق اور سید محمد اشرف جیسے معتبر اہل ادب نے پسند کیا اور اپنی آرا کا اظہار کیا۔ پسماندگان میں شوہر اور دو صاحب زادے شامل ہیں۔

روزنامہ 'آگ' لکھنؤ، 18 ستمبر 2026

انتخاب ظفر

دیو بند: خطاط انتخاب ظفر کا اچانک حرکت قلب بند ہونے کے سبب انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 55 برس کے تھے۔ مرحوم صوفی انتخاب دیوبند کے مشہور خطاط تھے اور وہ عرصے سے طلبہ مدارس کو کیلی گرافی کا فن سکھاتے تھے۔

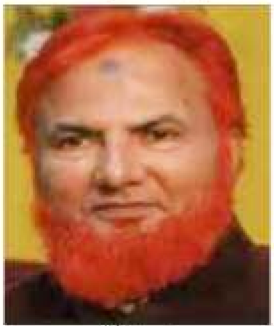

موصولہ اطلاع کے مطابق مرحوم کو علی الصبح اٹیک آیا، جس کے بعد انھیں مظفر نگر میڈیکل کالج میں داخل کرایا گیا، دوران علاج ان کا انتقال ہوگیا۔ نماز جنازہ احاطہ مولسری میں بعد نماز مغرب ادا کی گئی، اس کے بعد عابدی قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ ان کے انتقال پر شہر کی سرکردہ شخصیات نے انھیں خراج تحسین پیش کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 13 اگست 2026

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی تازہ مطبوعات

اردو تدریسی قواعد

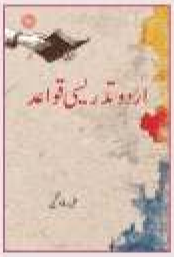

مصنف: علی رفاد فتیحی

دوسرا ایڈیشن: 2026

صفحات: 484

قیمت: 305 روپے

امراض اطفال

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 566+XIII

قیمت: 350 روپے

ادویہ مفردہ

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 443+XX

قیمت: 285 روپے

معاشیات (Economics) فرہنگ اصطلاحات (انگریزی-اردو)

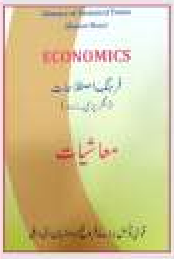

تیسرا ایڈیشن: 2026

صفحات: 371

قیمت: 205 روپے

حیات جاوید

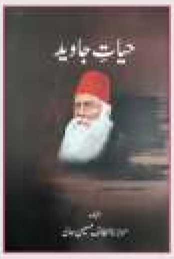

تالیف: الطاف حسین حالی

صفحات: 844+XXXI

قیمت: 455 روپے

عصری لغت برائے فنون لطیفہ

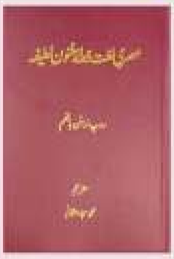

روپ نرائن باتھم

مترجم: محمد سجاد عثمانی

پہلی اشاعت: 2026، صفحات: 606

قیمت: 685 روپے

کلیات ادویہ

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 217+VIII

قیمت: 160 روپے

آؤ جانوروں سے ملیں

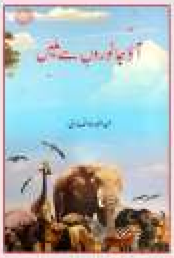

مصنف: عبدالودود انصاری

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 131+XV

قیمت: 190 روپے

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, अक्तूबर–2026, वर्ष:28, अंक:10
URDU DUNIYA Monthly, October-2026, Vol.28, Issue:10
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/09/2026
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Salasar Imaging Systems, A-97, Sector-58 Noida-201301(UP)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025